ISSN - 2582 - 3612

سہ ماہی

مظفرپور

ساغرِ ادب

پیئر ریویوڈ اُردو جرنل

مدیر (اعزازی)

ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر

ساغرِ ادب

Vol. 01, Issue 03, Oct. to Dec. 2019

مدیر: ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر

RNI No. BIH URD / 2019 / 78036
ISSN - 2582 - 3612

Vol. : 1, Issue : 03
Oct. to Dec. 2019

Quarterly

SAGHAR E ADAB

Muzaffarpur

Peer - Reviewed Urdu Journal

Editor (Honorary)

Dr. Syed Alay Zafar

Printed, Published and Owned by **Kahkashan Yasmin**,
Printed at : Indian Arts offset, Basement of State Bank of India, Mahendru
Ashok Raj Path, Patna : 800 006 (Bihar) & **Published From** Husaina House,
Zakaria Colony, Mohalla - Sadpura, P.O. Ramna, Muzaffarpur - 842002 (Bihar)

Editor : Dr. Syed Alay Zafar **Mob. : 94300 84261**

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

Quarterly

SAGHAR E ADAB

Muzaffarpur

(Peer - Reviewed Urdu Journal)

جلد : ۱ شمارہ : ۳ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۹ء

مُدیر (اعزازی) : ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر

زرِ تعاون

فی شمارہ : 200 روپے، سالانہ 800 روپے (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)، تاحیات 10,000 روپے، دیگر ممالک 60 ڈالر

صفحات : ۲۰۸

تعداد اشاعت : ۵۰۰

سرِ ورق : سیّد آلِ محتشم، سیّد آلِ حاشر و فائزہ ظفر

کمپوزنگ : محمد امام الدین امام، مظفر پور۔ 62061 43783

Bank Details

SAGHAR E ADAB, SB. A/c No. 3751050251
IFSC : CBIN 0284935
Central Bank of India, L.S. College Branch, Muzaffarpur (Bihar)

اس شمارے کے قلم کاروں کی آراء سے ''ساغرِ ادب'' کے مُدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

کسی بھی قابل اعتراض تحریر یا دیگر متنازعہ معاملات کی قانونی چارہ جوئی صرف مظفر پور کی عدالت ہی میں ہوگی۔

خط و کتابت و ملنے کا پتہ

The Editor
SAGHAR E ADAB
Husaina House, Zakaria Colony, Mohalla - Sadpura
P.O. - Ramna, Muzaffarpur - 842 002 (Bihar)
Mob. 94300 84261, 90062 53903

ISSN : 2582 - 3612

سہ ماہی

ساغرِ ادب

مظفر پور

(پیئر ریویوڈ اُردو جرنل)

مُدیر (اعزازی)

ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر
اسوسی ایٹ پروفیسر
پوسٹ گریجویٹ شعبہ اُردو
بی۔آر۔اے۔ بہار یونیورسیٹی، مظفر پور

مجلسِ اِدارت

پروفیسرابوذرعثمانی (رانچی) — پروفیسرنجم الہدیٰ (مظفرپور)

پروفیسرعلیم اللہ حالی (پٹنہ) — پروفیسرفاروق احمد صدیقی (مظفرپور)

پروفیسرمناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور) — پروفیسررئیس انور (دربھنگہ)

پروفیسرحمید سہروردی (گلبرگہ) — پروفیسرقاضی حبیب احمد (چنّی)

ڈاکٹرعامر مصطفیٰ صدیقی (ہزاری باغ) — ڈاکٹرمنظرحسین (رانچی)

مجلسِ مشاورت

ڈاکٹرسیّد شاہد اقبال (گیا) — ڈاکٹرغضنفر اقبال (گلبرگہ — ڈاکٹرجلال اصغرفریدی (مظفرپور)

ڈاکٹرمحمد بہلول (دھلی) — ڈاکٹرسیّد محمد حبان الحق (مظفرپور) — ڈاکٹراحمد معراج (کولکاتا)

اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدّت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ اگر اگلے سال کا زر سالانہ آپ سے موصول نہیں ہوا تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ آگے خریدار بنے رہنا نہیں چاہتے ہیں۔

(ایڈیٹر)

ویب سائٹ

www.saghareadab.in

ای میل

saghareadab@gmail.com

syedalayzafar@gmail.com

پرنٹر، پبلشر و پروپرائٹرس **کہکشاں یاسمین** نے انڈین آرٹس آفسیٹ، بیسمنٹ آف اسٹیٹ بینک آف انڈیا، مہندرو، پٹنہ میں چھپوا کر دفتر ''ساغرِ ادب''، حُسینا ہاؤس، زکریا کالونی محلّہ۔ سعد پورہ پوسٹ۔ رَمنہ، مظفرپور۔ 842 002 (بہار) سے شائع کیا۔

مُدیر (اعزازی) : ڈاکٹرسیّد آلِ ظفر

ISSN :2582 -3612

ترتیب

نمبرشمار	رشحاتِ قلم	اربابِ قلم	صفحات
	اِداریہ	ڈاکٹرسیّد آلِ ظفر	۶
۱	حمد	تنویر پھول	۸
۲	نعت پاک	پروفیسرفاروق احمد صدیقی	۹
۳	سہ ماہی ''ساغرِ ادب''، مظفرپور، جلد ۱، شمارہ ۲ (منظوم تأثر)	پروفیسرعبدالمنّان طرزی	۱۰
۴	بلقیس فاطمہ کے پردۂ زرنگاری کا معشوق	پروفیسرمنظراعجاز	۱۱
۵	قومی یک جہتی اور ہندوستانی ادب	ڈاکٹرسیّد احمد قادری	۱۷
۶	اُردو تحقیق میں قاضی عبدالودود کے امتیازات	ڈاکٹرسیّد شاہد اقبال	۲۲
۷	ٹیپو سلطان کو علامہ اقبال کا خراجِ عقیدت	ڈاکٹرغالب مصطفیٰ صدیقی	۲۹
۸	شیخ عبدالحق محدث دہلوی: احوال وافکار	ڈاکٹرعبدالوحید	۳۳
۹	پرویز شاہدی کی غزل گوئی: اجمالی جائزہ	محمد ضیاء الحق	۳۷
۱۰	حمید سہروردی کے افسانوں میں رنگِ تصوف	ڈاکٹرمحمد سمیع الدین	۴۲
۱۱	پریم چند کے افسانوں میں فکری اور فنی پہلو پر اِک نظر	وصی احمد شمشاد	۴۸
۱۲	اُردو ناول کا شفق	ڈاکٹرجلال اصغرفریدی	۵۱
۱۳	ڈاکٹرمنصورعمر دربھنگوی بحیثیت تاریخ گو	ڈاکٹرمبارک حسین	۵۴
۱۴	اُردو ادب میں نثر کی روایت	ڈاکٹرذاکرحسین	۶۰
۱۵	ڈاکٹرآفاق عالم صدیقی کا نظریۂ تحقیق	بدر محمدی	۶۴
۱۶	شین مظفرپوری کے افسانوں کا اسلوبیاتی مطالعہ	ڈاکٹراحسان عالم	۷۰
۱۷	مظہر محی الدین کا شعری اسلوب	ڈاکٹراسلم محبوب خان	۷۶
۱۸	اُردو تنقید کا ایک معتبر نام : کلیم الدین احمد	ڈاکٹرتسنیم فاطمہ	۸۳
۱۹	فنون لطیفہ کے مظاہر اور عورت	ڈاکٹردستگیر احمد	۸۶
۲۰	شاد عارفی کی غزلیہ شاعری	ڈاکٹراحمد معراج	۹۲
۲۱	غیاث احمد گدّی کی افسانہ نگاری: ایک تجزیہ	ڈاکٹرشائستہ	۹۸

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

۲۲	سوؔدا : ایک عظیم قصیدہ نگار شاعر	ڈاکٹر شبنم بیگم	۱۰۲
۲۳	سعادت حسن منٹو : ایک منفرد افسانہ نگار	ڈاکٹر مرزا صبا عالم بیگ	۱۰۷

گوشۂ ریسرچ اسکالرس

۲۴	پریم چند کی افسانہ نگاری	ڈاکٹر دل آرا خاتون	۱۱۱
۲۵	عبدالغفور شہباز کی شاعری کے چند امتیازات	ڈاکٹر محمد نثار عالم	۱۱۵
۲۶	ڈاکٹر مہندر سنگھ بیدی سحر بحیثیت سوانح نگار	ڈاکٹر اصغری بیگم	۱۲۰
۲۷	عبدالمنّان طرزیؔ ایک قادرالکلام شاعر	ڈاکٹر محمد رضوان	۱۲۴
۲۸	بیدی کے افسانوں میں عورت کا کردار	گلشن آرا	۱۲۹
۲۹	جذبی کی شاعری کے چند نکات	روشن پروین	۱۳۴
۳۰	منور رانا کی غزلیہ شاعری	محمد اصغر علی	۱۳۹
۳۱	ظفر عدیم : ایک شاعر و نثر نگار	محمد فیروز	۱۴۵
۳۲	اقبالؔ قومی یک جہتی کا عظیم علمبردار	محمد شہزادہ سلیم شمس	۱۵۰
۳۳	اَدبِ اطفال کی اہمیت وافادیت	عبدالقادر	۱۵۵
۳۴	رشید احمد صدیقی : ایک صاحبِ طرز نثر نگار	کوثر ناز	۱۵۹
۳۵	اجتبیٰ رضوی کی شاعری	ریحان احمد قادری	۱۶۳
۳۶	غالبؔ کی شاعری میں المیاتی عناصر	حیدر علی	۱۶۶
۳۷	حنیف ترین کی غزلوں کا ناقدانہ جائزہ	تبسّم خاتون	۱۷۰
۳۸	مومن خاں مومنؔ: غزل کا واقعیت پسند شاعر	محمد حنظلہ	۱۷۴
۳۹	انشاء اللہ خاں انشاء بحیثیت داستان نگار	کوثر ناز	۱۷۸
۴۰	الیاس احمد گدی کے ناول ''فائر ایریا'' اور حاشیائی کردار	نعمت شمع	۱۸۲
۴۱	علامہ اَرشد القادری: بحیثیت نقاد	ذاکر حسین	۱۸۷
۴۲	خدیجہ مستور کی ناول نگاری	محمد علی	۱۹۰
۴۳	انشائیہ میں موضوع کا انکشافی عمل	نصرت پروین	۱۹۴
۴۴	تاریخ طبری پر اک نظر	شائستہ شاہین	۱۹۷
۴۵	''ساغرِ ادب'' کے دوسرے شمارے پر آئے ہوئے تاثرات	....	۲۰۱

ISSN :2582 -3612

اِداریہ

لیجئے ''ساغرِ ادب'' کے تیسرے دَور میں آپ مدعو ہیں۔ایک دَور سے دوسرے دَور تک کی مدّت سِہ ماہی ہے۔ یقیناً ان تین مہینوں میں آپ کو اس ساغر کا انتظار رہا ہوگا، جس میں ادبیات کے ساگر کو ہم سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ وہ آپ کے اِن تأثرات سے ظاہر ہے، جو ہم اس شمارے میں شائع کر رہے ہیں۔اور چاہیں گے کہ اس تیسرے شمارے کے بارے میں بھی اپنے بیش قیمت تأثرات سے نوازیں۔ہم آپ سے ہر طرح کے تعاون کے خواستگار ہیں، قلمی، مالی اور اپنے گونا گوں مشاغل کے درمیان اپنی انمول زندگی سے مستعار لے کر چند بیش بہا لمحاتِ فرصت کی قربانی کا تعاون۔ کہئے تعاون کی یہ تیسری قسم آپ کو کیسی لگی؟ کیا آپ اِس کے لئے تیار ہیں۔اس میں آپ کو خود لکھنا اور ''ساغرِ ادب'' کو پڑھنا اور دوسرے رِندانِ بلا نوشِ ادب تک اِس ساغر کو پہنچانا آپ سے متوقّع ہے۔ کیا آپ اس ادبی سلسلہ کی بقا کے لئے اتنا وقت نکال سکیں گے؟ ہماری کوشش یہی ہے کہ تمام اہلِ علم، بزرگانِ ادب سے نئی نسل کے باذوق اہلِ قلم تک کی نمائندگی ہو اور یہ رسالہ ادبی دنیا کے تنوع کا مظہرِ اتم بن جائے۔ ہمارا یہ دعویٰ نہیں ہے، بس کوشش ہے۔ دعویٰ ہم کر بھی نہیں سکتے۔آپ سے صرف تعاون کی درخواست ہے۔

کوشش تو تقاضائے بشریت ہے۔ تکمیلیت بشر کا مقدّر نہیں ہے، روحانیت کی بات اَور ہے۔ دنیاوی زندگی میں اگر مکمل ہو جانے کا احساس ہو جائے تو ارتقاء کا سفر رُک جائے گا۔

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

خوب سے خوب تر کی طرف سفر جاری ہے۔

یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے اور نیا سال ۲۰۲۰ء شروع ہو رہا ہے۔ ہم صمیمِ قلب سے آپ کو پُر خلوص مبارکباد پیش کرتے ہوئے ربّ کریم سے دعا گو ہیں کہ اگرچہ نیا سال نئے تقاضوں، گزرے ہوئے سال کی ہولنا کیوں اور نئے سال کے چیلنجوں سے بھرا ہوا ہے وہ مالک حقیقی ہمیں، ہم سب کو امن و امان کے ساتھ محفوظ و مامون اور ہر طرح کی سلامتی کے ساتھ پُر مسرت زندگی گزارنے کے مواقع عطا فرمائے تاکہ ادب کی دلچسپیاں برقرار رہیں، ''ساغرِ ادب'' کی سرمستیاں بڑھتی جائیں، تحقیق و تنقید و تخلیق کا سلسلہ خالص ادبی سطح پر جاری رہے، ویسے ادب گرد و پیش کی زندگی سے بیگانہ نہیں رہ سکتا۔

خدا ہمیں توفیق دے کہ ہم فیض احمد فیضؔ کی طرح ''تلخیِ مئے ایام'' لب پہ ہوتے ہوئے بھی ''تلخیٔ کلام بہ مائل ذرا نہ ہوں'' اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں اور اخلاقی اور معاشرتی زندگی کے عمدہ ترین اصولوں کے مبلّغ بھی بن جائیں اور ان نفیس اشیاء کو ادبی پیمانوں میں اُنڈیل دیں۔ جن کے ہم پہلے ہی سے حامل اور امین ہیں۔ ''ساغرِ ادبؔ'' ہمیں ہر طرح سرشار رکھے اور دعا فرمایئے کہ اس کی آب و تاب برقرار رہے۔

مظفر پور

۱۵/ دسمبر ۲۰۱۹ء

ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر

ISSN :2582 -3612

تنویر پھول، کراچی (پاکستان)

حمد

اے خالق دوعالم! ہے اِلتجا تجھی سے !
ہم کو بچالے یارب! ہر گمرہی بدی سے !

تو ہی ہے سننے والا، بندوں کی سُن دعائیں
عیبوں کو تو چُھپالے اور بخش دے خطائیں

ستّار نام تیرا، غفّار نام تیرا !
بندوں کی پردہ پوشی بے شک ہے کام تیرا

آسان مشکلیں کر، عزت ہمیں عطا کر
رسوا نہ کر ہمیں تو ، تو ہی ہے اپنا یاور

ہم ہیں حقیر بندے، پروردگار تو ہے
ہم پر نظرِ کرم کی، آمرز گار تو ہے

کہتا ہے پھولؔ یارب! ہر شر سے تو بچالے !
ہے کارساز تو ہی، سب کچھ ترے حوالے !

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

پروفیسر فاروق احمد صدیقی

نعت پاک

صدشکر خدا، آقا کا کرم، مَیں نے بھی ، مدینہ دیکھ لیا
دیرینہ تمنّا بَر آئی، سرکار کا روضہ دیکھ لیا

انوار و تجلّی کا منبع ،فیضان دو عالم کا مرکز
مومن کے لئے معراج نظر ، وہ گنبدِ خَضریٰ دیکھ لیا

اس در پہ جو حاضر ہوتے ہیں، پاتے ہیں شفاعت کا مژدہ
اے شہر شفاعت، خوش منظر، ترے فیض کا دریا دیکھ لیا

فردوس بداماں، نور نظر، جنت کی کیاری کیا کہنا
ان جاگتی آنکھوں سے پیہم، جنت کا نظارہ دیکھ لیا

اے مسجدِ نبوی صلِّ علیٰ، فردوس نظر، توقیرِ حرم
تو پیکرِ نور و عظمت ہے، ترا حسنِ منزّہ دیکھ لیا

جو وحیِ الٰہی لاتے تھے، سرکار کی خدمتِ اقدس میں
اس جلوہ گہَ جبرئیل کا بھی، نورانی علاقہ دیکھ لیا

تسکین و نشاط قلب و نظر، آرام گہَِ اصحاب نبی
اے حسن مقدر وجد میں آ، صفہ کا بھی جلوہ دیکھ لیا

اے ارض بقیع پاک، مرے آقا کے چہیتوں کی جنت
بادیدۂ نم، با قلب حزیں، آباد خرابہ دیکھ لیا

صدّیقی فاروق کو دے پھر اِذن حضوری یا مولا
پھر فخر و مسرت سے وہ کہے، شش بار، مدینہ دیکھ لیا

پروفیسر طرزی، دربھنگہ

سہ ماہی ''ساغرِ ادب'' مظفرپور، جلد ۱، شمارہ: ۲

منظوم تاثر

ہے ساغرِ ادب کا بادہ خمار آگیں
محبوب کا سراپا جیسے قرار آگیں

مضمون اور مقالے ہیں ایسے علم افزا
دستارِ شیخ جیسے ہوتی وقار آگیں

فنکاروں نے دکھائی کیا کیا سحر طرازی
جس سے نَوائے بُلبُل ٹھہری بہار آگیں

آتش نوائی کی اب کیا رہ گئی ضرورت
صحرا کے خار وخس ہیں خود ہی شرار آگیں

مشمولے اِس کے پڑھئے، دیکھیں جمال اِس کا
وہ جو شعور افزوں، تو یہ شعار آگیں

تخلیقیں اِس کی گر ہیں مظہر علوئے فن کی
ہر نقشِ معنوی ہے گویا نگار آگیں

آلِ ظفر کو اُن کے مدّاح ڈھونڈتے ہیں
لے کے چراغ برکف، سب ہیں قطار آگیں

☆☆☆

پروفیسر منظر اعجاز

بلقیس فاطمہ کے پردۂ زرنگاری کا معشوق

بلقیس فاطمہ مظفر پوری کا شمار اب تو مشاہیر ادب کی صف میں ہونے لگا ہے۔شین مظفر پوری نے تمام تر بے اعتنائیوں کے باوجود جن مشاہیر ادب کی نظروں میں بار پایا اور جگہ بنائی، ان میں ڈاکٹر عبد المغنی، پروفیسر وہاب اشرفی، ڈاکٹر احمد حسین آزاد اور کئی دوسرے نام کے علاوہ بلقیس فاطمہ مظفر پوری بھی شامل ہیں۔ان کی شہرت کا بنیادی حوالہ شین مظفر پوری کے مجموعہ افسانہ ''آوارہ گرد کے خطوط'' کا پیش لفظ ہے۔اسی بنیادی حوالے سے بلقیس فاطمہ مظفر پوری کا نام گاہے بگاہے جریدۂ ادب میں نمایاں ہوتا رہا ہے۔

میرے پیش نظر ''زبان وادب'' دسمبر ۲۰۱۲ء کا شمارہ ہے جس کے ص:۳۶ پر ایک سرخی ہے :

''شین مظفر پوری مشاہیر کی نظر میں''

اس عنوان کے تحت شین مطفر پوری کے فن سے متعلق اقتباسات کی صورت میں جو آرا پیش کی گئی ہیں، ن میں پہلا نام جادۂ اعتدال کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالمغنی کا، آوارہ گرد کے خطوط کے حوالے سے بلقیس فاطمہ مظفر پوری کا، اور شین مظفر پوری کے افسانہ سرد جنگ پر ''صنم'' پٹنہ، جنوری ۱۹۶۰ء کے تبصرے کا مختصر سا اقتباس شامل ہے۔اس سے بآسانی یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ بلقیس فاطمہ مظفر پوری کا شمار اب مشاہیر ادب میں بھی ہونے لگا ہے۔زبان وادب کے زیر نظر شمارے میں ''خصوصی مطالعے کے تحت'' شین مظفر پوری پر ایک گوشہ ہے جو پانچ مضامین پر مشتمل ہے۔

ایک ایسا ہی گوشہ بعنوان ''گوشہ شین مظفر پوری'' دسمبر ۱۹۹۶ میں بھی شائع ہوا تھا۔ یہ گوشہ بھی پانچ ہی مضامین پر مشتمل تھا لیکن اس میں شین مظفر پوری کے دو افسانے ''قانون کی بستی'' اور ''ماجرا جو گزر گیا'' شامل تھے۔اس طرح اس گوشے کی مجموعی تحریر سات ہوگئی۔فی الحال زبان وادب کا یہ شمارہ بھی میرے پیش نظر ہے پہلا مضمون ''رقص بسمل'' کے جائزے سے متعلق احمد یوسف کا اور تیسرا مضمون شین مظفر پوری کی افسانہ نگاری سے متعلق ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا ہے جس میں ضمنی طور پر آوارہ گرد کے خطوط کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔لیکن یہ تجزیاتی نہیں حوالہ جاتی ہے۔ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے اس سلسلے میں بلقیس فاطمہ کے حوالے سے ہی کام نکال لیا ہے۔وہ اس سلسے میں رقم طراز ہیں :

''محترمہ بلقیس فاطمہ ''آوارہ گرد کے خطوط'' کے ''پیش لفظ'' میں شین مظفر پوری کے

ISSN :2582 -3612

فن کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتی ہیں :

''...... اس کے قلم کی ہر ادا ہمارے معاشرتی اور اخلاقی زوال پر ایک حسرتناک اور تنقیدی طنز ہے۔ وہ جنسی...... اور رومانی دلآویزیوں میں ہمارے ذہن کو ابھار کر ان شرمناک کمزوریوں کو برہنہ کر دیتا ہے جنہیں ہم قابل اصلاح تصور کرتے ہیں۔...... اس کے قلم کی نوک سوسائٹی اور ''سوسائٹی'' کی جنسی مغلوبیت کے اس پھوڑے کو کرید تی ہے جو کوڑھ میں منتقل ہو چکا ہے۔''

سولہ سال بعد زبان وادب'' نے پھر شین مظفر پوری کا گوشہ شائع کیا ہے تو بلقیس فاطمہ مظفر پوری کی تحریر کا یہی اقتباس ''شین مظفر پوری مشاہیر کی نظر میں'' کے تحت شامل اشاعت ہے۔اس لحاظ سے بلقیس فاطمہ مظفر پوری کا شمار مشاہیر ادب میں ہونے لگا ہے۔

شین مظفر پوری کے افسانوں کا یہ پہلا مجموعہ تھا جو مکتبۂ ادب'' دہلی سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا۔شین مظفر پوری فروری ۱۹۴۶ء ہی میں دلی پہنچے تھے۔انہیں نیم ادبی رسالہ ''آرٹسٹ'' کے مالک رفیق چمن نے بذریعہ خط بلوا بھیجا تھا تا کہ وہ ''آرٹسٹ'' کی ادارت کی ذمے داری سنبھالیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لیکن چند مہینے بعد ہی آزادی ملی اور اس کے ساتھ ہی تقسیم وطن کا سانحہ پیش آیا۔اس کے بعد جو فرقہ وارانہ فساد کا سیلاب آیا، اس میں خس وخاشاک کی طرح بہتے ہوئے شین مظفر پوری لاہور پہنچ گئے۔اسی سیلاب بلا کی نذر رفیق چمن بھی ہوئے اور ان کے بھائی خلیق دہلوی عرف خلّو بھائی بھی۔

بہر حال شین مظفر پوری نے لاہور میں جیسے تیسے کوئی دس ماہ گزارے اس ک بعد رفیق چمن کے چھوٹے بھائی خلیق دہلوی کے بلاوے پر کراچی چلے گئے۔وہاں بھی لاہور ہی کی طرح میکلوڈ روڈ تھا اور میکلوڈ روڈ پر واقع اخبار ''جنگ'' کا دفتر تھا۔اسی دفتر سے ملحق ایک چھوٹا سا کمرہ ''مضراب'' کا دفتر تھا۔ جہاں خلیق دہلوی عرف خلّو نے شین مظفر پوری کا استقبال کیا۔اس وقت ''مضراب'' کا کوئی شمارہ منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ یہ ایک ادبی رسالہ تھا جس کا اجرا شین مظفر پوری کی ادارت میں ہوا۔اس میں خلیق دہلوی کی حیثیت ایک انتظامی کارکن یا منیجر کی تھی۔لیکن جب اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا تو اس کے نہایت دلکش اور آرٹسٹک ٹائٹل کور پر مجلس ادارت میں شین مظفر پوری کے ساتھ خلیق دہلوی کا نام بھی تھا جو بعد کے شماروں میں حذف ہو گیا تھا۔ شین مظفر پوری کی تنخواہ ڈیڑھ سو روپے ماہوار طے ہوئی تھی۔

بہر حال ''مضراب'' کو ترقی پسند ادبی جریدہ کے طور پر جاری کیا گیا تھا۔شین مظفر پوری کے مطابق پہلے شمارے میں ان کی دو چیزیں شامل تھیں :

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

''پہلے شمارے میں میری دو چیزیں شامل تھیں ''ایک اجنبی لاہور میں'' اور ''ذلیل ہندوستانی'' موخرالذکر میرے متروک نام (ولی الرحمٰن شیدا) سے شائع ہوا۔''
(رقص بسمل، نومبر ۱۹۹۳ء، ص: ۲۰۴)

لیکن مضراب کے اس پہلے شمارے (اگست ۱۹۴۸ء) کے ٹائٹل کور پر اس کے قلم کاروں کے نام جس انداز میں بطور فہرست تحریر کئے گئے ہیں، اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ شین مظفر پوری کا مندرجہ بالا بیان درست نہیں ہے۔ ذیل کی فہرست من وعن ملاحظہ ہو :

کرشن چندر	قتیل شفائی	اسعد گیلانی	صغرا بیگم
علی سردار جعفری	ظہیر کاشمیری	ولی الرحمٰن	بلقیس فاطمہ
ساحر لدھیانوی	ظہور نظر	ثریا بانو	ورشم
اختر شیرانی	عزیز اثری	آنسہ زاہدہ	خلیق دہلوی
عبدالحمید عدم	اختر نعمانی	نسیمہ سوز	ش مظفر پوری

اس مجموعی تحریر میں کم سے کم ۲۵ فیصدی یا ایک چوتھائی حصّہ شین مظفر پوری کی کاوش قلم کا نتیجہ ہے۔ تیسرے کالم میں اسعد گیلانی کے بعد ولی الرحمٰن اور چوتھے کالم میں بلقیس فاطمہ کے بعد ورشم (جو ولی الرحمٰن شیدا کا مخفف ہے)، پھر خلیق دہلوی کے بعد ش مظفر پوری، تین مختلف نام نہیں، ایک ہی نام کے تین مختلف روپ ہیں۔ تیسرے کالم کی ثریا اور چوتھے کالم کی بلقیس فاطمہ بھی فرضی ادیبہ ہیں۔ اور بلقیس فاطمہ کے پردۂ زرنگاری کا معشوق شین مظفر پوری کے علاوہ کوئی اور نہیں۔ نسیمہ سوز کی شخصیت تو پہلے ہی سے مشکوک تھی۔ یہ دو بہنیں تھیں۔ شکیلہ آپا کی رشتے کی بہن تھیں۔ اس لحاظ سے اختر اور رینوی کی سالی ہوتی تھیں۔ حلقۂ عام کا خیال یہی تھا کہ ان کے ادبی کفیل اختر اور رینوی ہی ہیں۔ (واللہ اعلم) لیکن ثریا بانو (فلم اسٹار) کے لئے تو شین مظفر پوری باضابطہ معاوضے پر افسانے لکھا کرتے تھے۔ یہ ایک الگ دلچسپ قصّہ ہے۔ لیکن بلقیس فاطمہ تو باضابطہ طور پر شین مظفر پوری ہی کی زائیدہ اور پروردہ تھیں۔ یہ محترمہ تھیں کون؟ یہ ایک رمز ہے جو آج تک نہ کھل سکا۔ یہ ایک ایسا معمہ ہے جو آج تک حل نہ ہو سکا۔ البتہ ان کے حقائق ہستی کا کچھ بھید کھلا تو شین مظفر پوری ہی کے قلم سے کھلا۔ لیکن کھلنے کے باوجود یہ آج بھی بیشتر بند ہی بند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلقیس فاطمہ مظفر پوری کو ''آوارہ گرد کے خطوط'' کے پیش لفظ کے حوالے سے آج تک ڈھویا جا رہا ہے، بلکہ اب تو محترمہ مشاہیر ادب کی صف میں بھی شامل ہیں، جب کہ یہ ایک فرضی نام ہے۔ اس سلسلے میں خود شین مظفر پوری کا ہی بیان توجہ طلب ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

''یہاں ایک فرضی اُدیبہ بلقیس فاطمہ مظفر پوری بھی یاد آ گئی ہے۔ ۱۹۴۵ء ہی

میں ''بزم آوارگان ادب، بہار'' قائم ہوئی تھی جس کا صدر مقام آرہ تھا اور جس کی پہلی نشست موکامہ (ضلع پٹنہ) میں ہوئی تھی۔ اس کے صدر بہار کیمرہ ہاؤس آرہ کے مالک اور مشہور فنگر پرنٹ ایکسپرٹ نصرت آروی اور سکریٹری ایک نئے افسانہ نگار ملک فضل امام شیدا (کیروی) تھے جن کے والد مظفر الدین ملک موکامہ ریلوے پولیس (G.R.P) کے داروغہ تھے۔ ان دنوں میں جمال پور میں سنٹرل آرڈننس ڈپو (جنگی سپلائی محکمہ) میں ملازم تھا اور کان پور سے ٹرانسفر لے کر یہاں آیا تھا۔ اپنے بڑے سالا محمد مسلم مرحوم کے ساتھ ریلوے کالونی میں رہتا تھا جو ریلوے میں اکاؤنٹس کلرک تھے کچھ لوگوں کے پھبتی کسنے پر بزم کا نام'' آوارگان ادب'' سے بدل کر ''وارفتگان ادب'' کر دیا گیا تھا۔ بہر حال بزم کی پہلی نشست موکامہ میں ہوئی جس میں بہار سے میرے علاوہ نصرت، شیدا، مسرور انور، جوہر فیروز، اخگر سیمابی، نظر آروی، رشید آروی وغیرہ اور کلکتہ سے نقاش ویکلی کے مالک اور مدیر یونس نظری (مرحوم) اور میرے دوست افسر ماہ پوری شریک ہوئے۔ دوسری نشست جمال پور میں میری قیام گاہ پر ہوئی اور اس میں بھی کم و بیش اول الذکر ارکان ہی شریک ہوئے۔...... یہی وہ موقع تھا جب مرحوم یونس نظری نے سبز باغ دکھا کر مجھے نقاش کا ایڈیٹر بننے کا آفر دیا اور میں نے وار سپلائی محکمہ کی سرکاری نوکری سے مستعفی ہو کر کلکتہ میں باضابطہ صحافت کا پیشہ اختیار کر لیا۔''
(رقص بسمل۔ ص: ۲۴۲ و ۲۴۳)

شین مظفر پوری ضمنیات سے گریز کرتے ہوئے اسی تسلسل میں مزید لکھتے ہیں :

''بھائی نصرت آروی خوب دلچسپ اور منچلے آدمی تھے۔ آرہ کی طوائفوں کو غزلیں لکھ لکھ کر دیا کرتے تھے۔ ان کے اسٹوڈیو میں ایک نوجوان اسکولی لڑکی کے فوٹو کا ایک پرانا پرنٹ پڑا تھا۔ (بعد میں پتہ چلا کہ وہ کسی مقامی افسر کی بیٹی کی تصویر تھی)۔ نصرت بھائی کو ذرا تفریح کی سوجھی۔ چنانچہ اس تصویر والی لڑکی کا نام بلقیس فاطمہ طے ہوا اور وہ مظفر پور کی ایک اعلیٰ طوائف کی تعلیم یافتہ لڑکی قرار پائی۔ اس نام سے بعض رسائل میں کئی چیزیں بھی شائع ہوئیں۔ (ظاہر ہے میری ہی لکھی ہوئی) گویا ''لڑکی'' میرے حوالے ہو گئی۔

اور فروری ۱۹۴۶ء میں اس ''امانت'' کو اپنے ساتھ لئے میں دلّی پہنچ گیا۔ رسالہ آٹسٹ کے مالک بھائی رفیق چمن بھی کچھ کم زندہ دل نہ تھے۔ انہوں نے ماہرفن کمرشیل مصور صدیقی آرٹسٹ سے اس تصویر کو رسالے کے پورے صفحہ کے سائز میں انلارج کرایا اور اس کو ''آرٹسٹ'' میں ''بلقیس فاطمہ مظفر پوری'' کا نام دے کر چھاپ دیا۔ اس کے بعد یہ لڑکی گمنام بلکہ ناپید ہوگئی۔''
(رقص بسمل۔ ص:۲۴۳و۲۴۴)

اس اقتباس کا آخری جملہ ''اس کے بعد یہ لڑکی گمنام بلکہ ناپید ہوگئی۔'' محل نظر ہے کیوں کہ گلی قاسم جان (جس میں رسالہ آرٹسٹ کا دفتر تھا) میں گم یا ناپید ہوگئی ہوتی تو رسالہ مضراب، کراچی کے شمارہ ۱۹۴۸ء اگست میں بحیثیت افسانہ نگار اس کا وجود نظر نہ آتا۔ بہرحال اس سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے شین مظفر پوری لکھتے ہیں :

''اسی موقعہ سے میری پہلی کتاب ''آوارہ گرد کے خطوط'' نیا کتاب گھر، دہلی سے شائع ہورہی تھی۔ پبلشر بھائی عبدالحق فاروقی کا اصرار تھا کہ رواج کے مطابق اس میں ایک دیباچہ ہونا چاہئے۔ چنانچہ ادھر ادھر سر مارتے پھرنے کی بجائے میں نے خود ہی ایک دیباچہ لکھ کر ''بلقیس فاطمہ مظفر پوری'' کے نام سے پبلشر کے حوالے کردیا۔ اور وہ در پردہ خودنوشت دیباچہ میری کتاب میں مستقلاً شامل ہے۔ اس رازِ دروں پردہ کو میں نے آج یادوں کی رَو میں پہلی بار فاش کیا ہے۔ ویسے بھی یہ ایک غیر اہم اور بھولی بسری بات ہے کہ میرے سوا کسی اور کو شاید یاد رہ گئی ہو۔'' (رقص بسمل، ص:۲۴۴)

محولہ بالا تفصیلات سے واضح ہے کہ بلقیس فاطمہ کے پردۂ زرنگاری کا معشوق شین مظفر پوری کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔ اس لئے رقص بسمل کی اشاعت نومبر ۱۹۹۳ء سے پہلے اگر آوارہ گرد کے خطوط کے پیش لفظ کو بلقیس فاطمہ مظفر پوری سے منسوب کیا گیا (جس کا مجھے فی الحال علم نہیں) تو تعجب کی بات نہیں لیکن رقص بسمل کی اشاعت کے بعد بار بار یہ حوالہ دیا جارہا ہے تو حیرت کی بات ضرور ہے۔

ڈاکٹر حسن رضا نے ۱۹۸۶ء-۱۹۸۱ء کے درمیان ''شین مظفر پوری: شخصیت اور فن'' کے موضوع پر پروفیسر وہاب اشرفی صاحب مرحوم کی نگرانی میں تحقیقی کام ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے کیا تھا۔ ڈگری تفویض ہوجانے کے بعد انہوں نے اس مقالے کا مسودہ بہار اردو اکادمی میں اشاعتی امداد کے لئے جمع کیا تھا۔ شین مظفر پوری ''زبان و ادب'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اکادمی میں موجود تھے اور ان کی نظر سے سرسری ہی سہی یہ مقالہ گزرا تھا۔ وہ اس کام سے مطمئن نہ تھے، جیسا کہ ان سے گفتگو کے دوران میں نے محسوس کیا تھا۔ اس موقع پر

میں نے بھی مسودے پر ایک نظر ڈالی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اکادمی سے اس کتاب کی اشاعت کے لئے مالی تعاون مل سکا یا نہیں؟ البتہ بہت بعد میں بک امپوریم کے ڈسپلے میں اس کتاب پر میری نظر پڑی تھی۔ لیکن دو چار روز بعد ہی یہ کتاب نظر سے اوجھل تھی۔ اگر اس کی طباعت و اشاعت سے پہلے ڈاکٹر حسن رضا نے اس پر نظرِ ثانی کی ہوگی تو زیرِ بحث ''آوارہ گرد کے خطوط'' کے پیش لفظ کے حوالے سے بلقیس فاطمہ مظفر پوری کا نام نہیں آیا ہوگا۔ بلکہ پس پردۂ زرنگاری کو ہٹا کر اصل صورت سامنے لائی گئی ہوگی۔ لیکن یہ محض میرا قیاس ہے۔

Prof. Manzar Aijaz
Head, P.G. Dept. of Urdu
A.N. College, Patna
Mobile: 09431840245

قلم کار حضرات سے گذارش

سہ ماہی ''**ساغرِ اَدب**'' اُردو کا ایک تحقیقی و ریفرڈ مجلّہ ہے۔ براہِ کرم تخلیقات بھیجتے وقت اس کے معیار اور مزاج کا خاص خیال رکھیں۔

نوٹ : ادباء و شعراء سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ اپنی تخلیقات اِن پیج اُردو (Inpage Urdu) سافٹ ویئر میں کمپوز شدہ مسودے کا پروف پوری توجہ سے دیکھ لیں تاکہ غلطی کا امکان نہ ہو اور درج ذیل ای۔میل۔ آئی ڈی پر بھیجنے کی زحمت گوارہ کریں۔ ساتھ ہی تخلیقات کی پرنٹ کاپی بھی ڈاک سے مُدیر کے پتہ پر اِرسال کردیں۔

Website : saghareAdab.in

Email-syedalayzafar@gmail.com

saghareadab@gmai.com

مضمون کی ابتداء میں نام اردو میں اور آخر میں نام و پتہ انگیریزی میں مع پن کوڈ و موبائل نمبر ضرور تحریر کریں۔

قلم کاروں سے درخواست ہے کہ وہ غیر مطبوعہ مضامین ہی اشاعت کے لئے بھیجیں۔

زیادہ طویل مضمون ہونے کی صورت میں حسبِ ضرورت ایڈٹ کر کے شائع کیا جائے گا۔ اس امر میں مدیر اپنے حقِ ادارت کا استعمال کرے گا۔

اڈیٹر

ڈاکٹر سید احمد قادری

قومی یکجہتی اور ہندوستانی ادب

قومی یکجہتی (National Integration) قوموں کے ذہنی اور عملی فروغ کے لئے ایک ناگزیر عمل ہے۔ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ جس جس قوم میں فکری اور عملی یکجہتی رہی، اس قوم نے ترقی کی منزلیں بہ آسانی سر کرلیں اور جہاں اقوام اپنے فکر و عمل میں یک جہت نہ رہ پائے وہاں ایسا بکھراؤ پیدا ہوا کہ ہار کا ہر دانہ بکھر کر رہ گیا۔

مگر قومی یکجہتی کی اس ناگزیر ضرورت کے اعتراف کے باوجود یہ بات بھی واضح ہونی چاہئے کہ قومی یکجہتی کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ ایک ملک میں بسنے والی مختلف قومیں اپنے تمام تر انفرادی خطوط اور نقوش کو بھول جائیں یا ترک کردیں، بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ کثرت میں وحدت Unity in diversity تلاش کی جائے اور قومی یکجہتی کا یہ سب سے خوبصورت اور بہترین تصور ہے۔

ادبی لحاظ سے بھی کثرت میں وحدت کی تلاش ایک مخصوص جمالیاتی تفاعل کی حامل ہے، کیوں کہ یونانی ادبیات میں افلاطون اور ارسطو وغیرہ نے جس حقیقت اولیٰ کی تلاش کے ڈانڈے مابعد الطبیعات کی جمالیات(Aestheatics of Metaphysics) سے ملائے ہیں وہ بھی دراصل کثرت میں وحدت کی تلاش کا اشاریہ ہے۔

اردو ادب میں قومی یکجہتی نے طرح طرح سے اپنا ظہور کیا، کبھی مثنویوں میں مسلمان لڑکے اور ہندو لڑکی کے درمیان عشق کی داستان کا روپ لیتی ہے، کبھی داستانوں میں خالص ہندوستانی تہذیب کی جلوہ آرائی (''باغ و بہار'') کا سبب بنتی ہے۔ اسی طرح اردو شاعری، ناولوں اور افسانوں میں قومی یکجہتی کے نقوش بے حد نمایاں طور پر جلوہ گر ہیں۔

اردو شاعری پر ایک نظر ڈالیں، تو ہم دیکھیں گے کہ امیر خسرو نے جس تہذیبی اور یکجہتی احساسات و جذبات کا اظہار کیا، اسے ہر دور میں فروغ ملا۔ ایک طرف رحیمؔ، رس خان اور جائیسی وغیرہ جیسے مسلم شعراء ہندی زبان میں ہندوستانی تہذیب و تمدن کو موضوع شاعری بناتے ہیں، تو وہیں دوسری جانب تلوک چند محروم، پنڈت برج نرائن چکبست، ڈاکٹر منوہر سہائے انور، آنند نرائن ملا، رگھوپتی سہائے فراق، جگن ناتھ آزاد، دیا شنکر دوبے نسیمؔ، درشن سنگھ دُگل، کرشن موہن، سوہن راہی، کرشن بہاری نور، پرتپال سنگھ بیتابؔ، جینت پرمار، ش کاف نظام، جوہر بجنوری، روشن لال روشن، حقیر آستانی، دھرم پال عاقل، راج نرائن راز، رشمی کانت راہی،

ISSN :2582 -3612

ساحر ہوشیار پوری، شباب للت، کرشن کمار طور، کمار پاشی، منوہر لعل ہادی، پرکاش تیواری، آزاد گلاٹی، پرکاش ناتھ پرویز، پریم کمار نظر، پریم وار برٹنی، جمنا پرساد راہی، کرشن مراری، کنور مہندر سنگھ سحر، ستیہ پال آنند، ودیا ساگر آنند، چمن لال چمن وغیرہ جیسے ہندو شعراء نے اردو شاعری کو اپنی تہذیبی، مذہبی رواداری، باہمی یگانگت، بھائی چارگی اور دوستی کے فکر و احساس سے مالا مال کیا ہے۔ اسی طرح نثر میں بھی اپنے ناولوں اور افسانوں میں کئی غیر مسلم ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں مثلاً ''سرشار، پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، رتن سنگھ، رام لعل، جوگندر پال، سریندر پرکاش، اوپندر ناتھ اشک، بشمبھر پردیپ، بلراج ورما، آنند لہر، شرون کمار ورما، جیتندر بلو، مہندر ناتھ، جی کے مانک ٹالہ، انل ٹھکر، ہرچرن چاولہ، کیول دھیر، گلشن کھنہ وغیرہ نے دوستی، محبت، پیار اخوت، بھائی چارگی اور یکجہتی کی باتیں کی ہیں اور مذہبی جنون، فرقہ واریت، لسانی، تہذیبی اور ذات پات کے اختلافات کے خلاف فکر و فن کا اعلیٰ ادب پیش کیا ہے۔

مسلم شعراء نے اپنے ہندو بھائیوں کے تیوہاروں، ان کے مذہبی رسومات اور کردار کو بڑی عقیدت سے اپنے فن پاروں میں جگہ دی ہے۔ نظیر اکبر آبادی، علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی، سردار جعفری، ساغر نظامی، کیفی اعظمی اور ساحر لدھیانوی وغیرہ کی شعری تخلیقات اس امر کے بین ثبوت ہیں کہ ان شعراء نے ہمیشہ ہندو، مسلم اتحاد اور بھائی چارے کو فروغ دینے کی کوشش کی ہیں۔

نظیر اکبر آبادی نے ایک طرف جہاں ہولی، دیوالی، کرشن کنہیا اور راکھی کو موضوع سخن بنایا ہے، وہیں انیسؔ کے مرثئے، ہندوستانی سماج کی بہترین تصویر پیش کرتے ہیں۔ دیا شنکر نسیمؔ، کی قصہ گل بکاؤلی ''محمد افضل کی'' ساون بھادو''، میر تقی میر کی ''بیان ہولی''چکبست کی ''رامائن کا ایک سین''منشی بنواری لال شعلہ کی ''سیتا ہرن'' اور منور لکھنوی کی ''کرشن اور رادھا کی ملاقات'' وغیرہ جیسی اہم اور مؤثر تخلیقات پورے ہندوستان کے روایتی کلچر اور یکجہتی کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔

ہمارا ملک ہندوستان ہمیشہ سے باہمی یگانگت، اتحاد و اتفاق اخوت و محبت اور دوستی و یکجہتی کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں کی تمام تہذیبیں مل کر ایک تہذیب ہوگئی، جسے ہندوستانی تہذیب کا نام دیا گیا، نہ کہ مختلف خانوں میں منقسم کیا گیا۔ اس سلسلے میں اردو کے عظیم شاعر رگھوپتی سہائے فراق نے بڑی اچھی بات کہی تھی کہ۔

''جب ہم ہندوستانی تہذیب اور کلچر کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ تہذیب صرف ہندوستانی ہوا کرتی ہے نہ کہ ہندو یا مسلم ہوتی ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ ایک طرف جہاں مسلم شعراء ہندو کلچر سے متاثر نظر آتے ہیں تو وہیں دوسری طرف ہمارے بہت سارے ہندو شعراء مسلم تہذیب و تمدن کی عقیدت و احترام کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ اردو شاعری اور فکشن میں ایسی

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

مثالیں بھری پڑی ہیں۔اردو زبان اوراس کا ادب، ایک مشترکہ تہذیب، آپسی میل محبت ہماری باہمی رشتہ، دوستی و رواداری اور یکجہتی سے مالا مال ہے۔ اوران کا اظہار تقریباً تمام بڑے شاعر اور فکشن نگاروں نے مختلف مواقع پر،مختلف انداز سے کیا ہے۔مشہور افسانہ نگار کرشن چندر لکھتے ہیں ادب شروع ہی سے مشترکہ ہند آریائی تہذیب اور کلچر کا گہوارہ رہا ہے۔اس کی ترویج و اشاعت میں ہندوؤں اور مسلمانوں،سکھوں اور عیسائیوں نے مل جل کر حصہ لیا ہے اور یہ ایک ہندوستان گیر زبان ہے۔اس نے اپنے دائرہ اثر میں ہر مذہب وملت، ہر رنگ ونسل کے افراد کے محسوسات اور جذبات کو سمو کر انہیں ایسا ادبی رنگ روپ عطا کیا ہے،جس سے اس زبان کے ادب اور شاعری پر باہمی میل جول، رواداری، اتحاد ومحبت، اخوت اور قومی یکجہتی کے جذبوں کی گہری چھاپ پڑ چکی ہے،ان ہی عناصر کے موجودگی نے اردو زبان کے ادب کو ایک سیکولر مزاج عطا کیا ہے جو سارے ہندوستانی عوام کے جمہوری جذبے سے ہم آہنگ ہے۔''

(ماہنامہ ''شاعر'' قومی یکجہتی نمبر،صفحہ ۱۵۷)

قومی یکجہتی اور ادب کا بڑا گہرا رشتہ رہا ہے، ہندوستان میں بولی جانے والی تقریباً تمام زبانوں کے ادب میں قومی یکجہتی کی مثالیں بھری پڑی ہیں۔اس لئے یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ادب،خواہ وہ کسی زبان کا ہو اس نے نہ صرف تہذیب وتمدن کو بہتر طور پر سنوارنے کی کوشش کی ہے بلکہ ان میں اتنے اعلیٰ اور معیاری افکار وخیالات پیش کئے گئے ہیں جو قومی یکجہتی کے بہترین نمونے ہیں، جو اتحاد واتفاق،اخوت ومحبت اور میل ملاپ کی روشن راہ دکھاتے ہیں۔

قدیم بھارت میں یکجہتی اور ہم آہنگی کو فروغ دینے میں سنکرت زبان اور ادب نے بھی بہت اہم رول ادا کیا ہے۔رامائن، مہا بھارت اور پرانوں کے واقعات اور کردار کا ذکر اردو ادب میں خوب ملتا ہے، بلکہ ان سے خاطر خواہ، استفادہ بھی کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں رس خان رحیمؔ،شاہ برکت اللہ اور شیخ رنگ رنجن کے علاوہ قادر بخش، مبارک علی بلگرامی، وحید،نظیرا کبر آبادی، مولانا ظفر علی خاں، مرتضیٰ احمد خاں، سید عبد الجلیل بلگرامی، حفیظ جالندھری وغیرہ نے ''کرشن'' اور ''رام'' کے کردار اور ان سے منسلک واقعات کو اپنی نگار شات میں بڑی خوبصورتی سے پیش کرتے ہوئے، اپنی تخلیقات کو اعلیٰ اور معنی خیز بنایا ہے۔ گیتا کے بارے میں مشہور شاعر جگر مراد آبادی نے اسی عنوان سے تحریر کردہ نظم میں ایک جگہ لکھا ہے۔نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو

ISSN :2582 -3612

/ روح سنے اور روح سنائے اسی طرح بھیم ٗارجن ٗسیتا،لچھمن وغیرہ کے اعلیٰ کردار اور ان کی انسان دوستی و محبت کے ذکر سے اردو ادب بھرا پڑا ہے۔

ان کے علاوہ ہندوستان کی مختلف دوسری زبانوں کے ادب میں بھی قومی یکجہتی دوستی، محبت، امن، ایثار، اخوت کی مثالیں بھری ہوئی ہیں۔مثلاً ''مراٹھی ادب میں دیا نیشور، تکارام، رام داس اور نام دیو کے ساتھ ساتھ گیان دیو رایک ناتھ، دیا بائی، مکتا بائی، شیوا جی مہاراج اور مورد ہنت ، مادھوراؤ سپرے، سیا جیوراؤ، گائک وارڈ، بابوراؤ وشنو پراڈکر، لچھمی نرائن گردتے، اننت سدا شیوراتیکر، کاکا کالیکر، دادا دھرم دھیکاری، جوگیکر، سردار مادھوراؤ کیبے، گوپال دامودر نا مسکو، رام چندر بھالے راؤ، پربھاکر ماجوکے، میناوتی بھاٹنے، وغیرہ گجراتی ادب میں یشپال، میرابائی، مالوی ادب میں گیتا نند جی، مہاراج، کیشونند جی مہاراج، چندر مکھی، سنت شنگا اور دینا ناتھ جی راجستھانی ادب میں نلنگھ، سانگڑ گھرا، ونئے چند سوری، نرینی، نالہہ، دارودیال، نابھاداس، جگدیش کنکنے، جناردن ناگر، تجارام، رام کرشن شکھلا، شمبھودیال سکسینہ، سرنام سنگھ شرما وغیرہ پنجابی ادب میں گرونام سنگھ تیر، کلونت سنگھ، امرتا پرتیم اور گیان وتی دربار وغیرہ، تیلگو ادب مچھا ستری، الیچت، بھیم سین نرمل اور رمیش چودھری اریگ پوری وغیرہ، اسی طرح ناتمل ادب میں یورنوسوم سندرم، کمارسوامی، گروسوامی، تیلی ناتھن اور پی۔آر۔ چدمبرم وغیرہ، فارسی ادب میں امیر خسرو، ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خاں خاناں، شیخ نبی، قاسم شاہ وغیرہ، ہندی ادب بھی قومی ایکتا، بھائی چارہ، امن وآشتی کے افکار وخیالات سے بھر پور ہے۔ پنڈت بدری نرائن چودھری، پریم دھن اور پنڈت مادھو پرساد مشرا وغیرہ نے اپنی تخلیقات میں قومی یکجہتی کے عمدہ نمونے پیش کئے ہیں۔ پنڈت شری دھر پاٹھک نے قومی یکجہتی کی کتنی شاندار روایت کا ذکر کیا ہے وہ کہتے ہیں :

جئے ہندو جن، جئے مسلم جن / جین، پارسی، بودھ کرشچن

کھڑی بولی کے پہلے شاعر پنڈت ایودھیا سنگھ اپادھیائے ''ہری اودھ'' کا بھی شمار قومی ایکتا کے فروغ میں نمایاں رہا ہے، میتھلی شرن گپت نے پنچ پاوتی، رنگ میں بھنگ، بھارت بھارتی، اور جئے بھارت میں کئی جگہ دوستی اور بھائی چارگی کی بڑی خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔ پنڈت گردھر شرما ''نورتن'' نے بھی فرقہ واریت کے خلاف آواز اٹھائی ہے اور یکجہتی کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے انہوں نے کہا تھا پنجابی گجرات نواسی / بنگالی ہو یا برج واسی / راجستھانی ہو یا مدراسی / سب کے سب ہیں بھارت واسی موجودہ صورت حال میں یکجہتی اور دوستی کی اہمیت کو ہر سیکولر ذہن نے سمجھا ہے۔اس ذمہ داری کا احساس پنڈت گیا پرساد شکلا سیہنی کی شاعری میں بھی بخوبی موجود ہے۔سیہنی جی کے نزدیک ایشور، اللہ سب ایک ہے۔ کسی طرح کا کوئی فرق نہیں، کوئی تفرقہ، وہ کہتے ہیں کہہ دو ہر ہر بار / یا اللہ اللہ بول دو قومی جذبے سے لبریز شاعری پنڈت رام نریش ترپاٹھی، اور پنڈت ماکھن لال چترویدی نے بھی خوب کی ہے۔''ایک بھارتیہ آتما''

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

کے ہر شعر میں چترویدی نے قومی ایکتا اور یکجہتی کے جذبہ کو بڑے مؤثر انداز میں پیش لیا ہے۔ ہندی ادب کے ایک اور عظیم شاعر جئے شنکر پرساد نے بھارت کی ایکتا اور اکھنڈتا پر بڑی خوبصورت نظم لکھی ہے پنڈت سورج کانت ترپاٹھی نرالا، سمترا نند پنڈت اور مہادیوی ورما نے بھارت میں تمام ذات پات کے فرق کو مٹانے اور ختم کرنے کی باتیں کی ہیں۔ان کے نزدیک دھوبی، چمار، پاسی سب ایک ہیں۔ان میں کوئی نیچا نہیں کوئی اونچا نہیں۔ ہری ونش رائے بچن نے بھی اپنی مختلف نظموں میں اس طرح کے احساسات وجذبات کی بھرپور ترجمانی ہے۔فرقہ پرستی کے خلاف نبرد آزما شاعر رام دھاری سنگھ دنکر نے ''پرشورام کی پرتیچھا'' ''رینوکا'' اور ''ہونکار'' وغیرہ میں بڑے ہی منفرد انداز سے یکجہتی پر روشنی ڈالی ہے۔

بھارت کی آزادی کے بعد ہندی کے شاعروں مثلاً ''رام چندر شرما کشور، وشوناتھ پرساد ورما ''ارک'' سدھی راج مایک'' دھرم ویر بھارتی، دینا ناتھ شرن، گوپال جی سورن کرن، رگھپال راکیش اور لچھمی نرائن سنگھ، وغیرہ نے اپنے عہد کی بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی، رنگ ونسل کا امتیاز، مذاہب اور ذات پات کی نفرت کے خلاف خوب خوب آوازیں اٹھائی ہیں اور یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔

بھارت کی آزادی کے بعد پورے ملک میں جو ناخوشگوار حادثات اور واقعات رونما ہوئے اور فرقہ پرستی کا جنون جس انداز سے پھیلا اور پھر قتل وغارت گری کا جو بازار گرم ہوا، ان تمام خونچکاں حالات نے ملک کی تمام زبانوں کے ادباء وشعراء کو جھنجھوڑ دیا اور انگریزوں کے ذریعہ نفرت کے بوئے بیج کو اکھاڑ پھینکنے کی پوری سعی کرنے کے ساتھ ساتھ ملک میں پھیلی بدامنی اور فرقہ وارانہ تشدد کی فضا کو محبت اخوف اور دوستی کے ماحول میں بدلنے کے لئے آگے آئے۔ ''آواز دو ہم ایک ہیں''۔ڈاکٹر نند دلارے باجپئی، ان تمام کوششوں کو، جدید ہندی شاعری اور کہانی کو پوری طرح قومی اور اس کے جذبے کے اظہار کا ادب مانتے ہیں۔

جگدیش گپت کی ''سوابھیمان'' ''کون بھومی ہوگی جہاں'' ''ہم نہیں یہ'' اجیت کمار کی سنسکرمن ''شری رام ورما کی ''چہرے اور چورا ہے'' دوشینت کمار کی ''سائے میں دھوپ'' اور راجندر کشور کی ''اتہاس بودھ'' وغیرہ میں قومی ایکتا کی گونج بھرپور انداز میں سنائی دیتی ہے۔ بعد میں دھرم ویر بھارتی، اگئیے، موہن راکیش، اشک، کملیشور، امرت رائے، جینندر وغیرہ نے پوری شدت سے فرقہ پرستی کے خلاف اپنے افکار و اظہار کو صفحہ قرطاس پر بکھیرا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ملک میں بکھری مسموم فضا کو خوشگوار ہوا کے جھونکے میں تبدیل کرنے میں ان فنکاروں نے بڑا ہی مثبت رول ادا کیا ہے جو تاریخ ادب کا اہم حصہ ہے اور ان کی اہمیت اور افادیت ہر زمانہ اور ہر عہد میں تسلیم کی جائے گی۔

Prof. Syed Ahmad Qadari
7 New Karimganj
Gaya - 823 001 (Bihar)
Mob. - 09934839110

ڈاکٹر سید شاہد اقبال

اردو تحقیق میں قاضی عبدالودود کے امتیازات

قاضی عبدالودود اردو تحقیق میں ایک بڑا نام ہے انہوں نے علمی کام کیے۔ دوسری طرف فخر الدین احمد اور بیرسٹر نوارلدین احمد جیسی سیاسی شخصیتوں کے ساتھ یورپ کی بہترین درس گاہوں میں تعلیم حاصل کی۔

قاضی صاحب عربی، پہلوی، فارسی اور فرانسیسی زبان کے ماہر تھے، اس کے علاوہ لاطینی اور جرمن زبان سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔

قاضی صاحب نے ۱۹۲۰ء میں بی۔اے کیا۔ مارچ ۱۹۲۳ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن گئے اور مارچ ۱۹۲۹ء میں حصول تعلیم کے بعد وطن واپس ہوئے قاضی صاحب نے معاشیات اور قانون کی اعلیٰ سند حاصل کرنے کے باوجود سیاست کی طرف رخ نہیں کیا، بلکہ انھوں نے تحقیق کو پسند فرمایا۔ کلیم الدین احمد لکھتے ہیں :

> ''وہ (قاضی عبدالودود) تقریباً سات سال انگلینڈ میں رہ گئے اور ان کا زیادہ وقت اردو اور فارسی مخطوطات کے مطالعہ میں گذرا، انڈیا آفس لائبریری، برٹش میوزیم، بوڈلین لائبریری میں مخطوطات کا کھوج لگایا اور معلومات کا ایک خزانہ جمع کیا۔''

(بحوالہ: قاضی عبدالودود سیمینار کے مقالے، ناشر بہار اردو اکادمی۔ص ۴۰)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ گرچہ وہ بیرسٹری کی تعلیم کے لئے یورپ گئے تھے، لیکن انہیں آنے والے زمانے کو اپنی طرف سے کچھ اور ہی پیغام دینا تھا جس کی تیاری وہ یورپ کے کتب خانوں میں بیٹھ کر سات سال تک کرتے رہے۔ انھوں نے اس کی خاطر ایام شباب میں یورپ کے تعیش سے منہ موڑ کر اپنا قیمتی وقت تحقیق کے خشک اور تکلیف دہ کام میں لگایا۔ خود قاضی صاحب نے لکھا ہے :

> ''یورپ میں بہت سے پرانے اور نئے شعراء کا کلام دیکھا لیکن میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں نے یورپی شاعری کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ یورپ کے متعدد کتب خانوں میں جو شعرائے اردو کے تذکرے اور دواوین ہیں ان

میں سے بہتوں کے متعلق میں نے یادداشتیں لکھی ۔''

(بحوالہ : فن اور شخصیت بمبئی، آپ بیتی نمبر۔ص ۳۶۴)

اردو تحقیق میں قاضی صاحب کے خصوصی امتیازات کی نشان دہی مندرجہ ذیل نکات پر غور کیے بغیر ممکن نہیں۔ان نکات سے دوسرے محققین اور قاضی عبدالودود کے تحقیقی رویہ کا فرق آشکارہ ہوجاتا ہے۔

۱- قاضی عبدالودود پہلے سے کسی بات کا فیصلہ کرکے آگے کام نہیں کرتے جیسا کہ حافظ محمود شیرانی کی کتاب، پنجاب میں اردو کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے یہ فیصلہ پہلے کرلیا تھا کہ پنجاب کو اردو کا مولد ثابت کرنا ہے، چنانچہ ان کی تمام تر تحقیق اسی محور پر گھومتی رہی۔

۲- قاضی عبدالودود کے طریقہ کار میں یہ بات بھی اہم ہے کہ وہ ہمیشہ غیر جانب دار دوٹوک باتیں کہتے ہیں، خواہ اس سے ان کے آباواجداد پر حرف آئے یا احباب و متعلقین ناراض ہوں۔

۳- قاضی عبدالودود کا حافظہ بہت مضبوط تھا،لیکن صرف حافظے کی بنیاد پر انھوں نے کبھی کوئی بات نہیں کہی۔قاضی صاحب مآخذ اور ثبوت کی اہمیت اور ناگزیریت کو خوب خوب سمجھتے ہیں اس لئے ہمیشہ ORIGINAL مآخذ سے کام لیتے ہیں۔ ORIGINAL مآخذ کو دیکھے بغیر وہ کوئی بات حتمی طور پر نہیں کہتے۔

۴- قاضی عبدالودود کو عام طور پر خشک مزاج کہا جاتا ہے، قاضی صاحب اپنی تحریر کے آئینے میں ایسے ہی ہیں کہ وہ تحقیق کو تحقیق کی حدتک ہی محدود رکھتے ہیں۔

۵- قاضی صاحب تحقیق کو تنقید سے بالکل الگ رکھتے ہیں۔لہٰذا اس بنیاد پر ان کی تحقیق کو'' خالص تحقیق '' کہا جاتا ہے۔

سطور بالا میں جن امتیازات کا ذکر ہوا ہے ان ہی صفات سے قاضی صاحب کو اردو تحقیق کا سب سے محتاط اور غیر جانب دار محقق کہا جاتا ہے۔

☆ قاضی صاحب نے اپنی تحقیق کے لئے سب سے پہلے' مرزا غالب' کا انتخاب کیا، انھوں نے غالب کے فارسی کلام کے تفصیلی مطالعہ کے لئے'' فرہنگ فارسی'' پر قدرت حاصل کی اور پہلوی زبان سے واقفیت بھی۔جس کی وجہ سے انہیں مرزا غالب اور کلام غالب کے اسرار و رموز کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔

اس کے بعد انھوں نے مرزا غالب اور خواجہ حالی کی تحریروں کی جانچ شروع کی۔غالب سے متعلق ان کی مندرجہ ذیل تحریر علی گڑھ میگزین (۴۹-۱۹۴۸ء) کے غالب نمبر میں شائع ہوئیں۔

ISSN :2582 -3612

۱-غالب کا ایک فرضی استاد ۲-غالب بہ حیثیت محقق

۳-تبصرہ فرہنگ غالب ۴-مآثر غالب

قاضی صاحب نے اپنے مضمون ''غالب کا ایک فرضی استاد'' میں انیس (۱۹) دلائل پیش کر کے یہ ثابت کردیا کہ دنیا کا کوئی شخص غالب کے سوا، عبدالصمد سے ذاتی واقفیت کا مدعی نہیں۔

خواجہ حالی نے بھی یادگار غالب میں چشم پوشی کی اور انھوں نے ''حیات جاوید'' میں بھی سرسید احمد خاں کے آخری دنوں کی بے بسی اور کسمپرسی سے دانستہ طور پر چشم پوشی کی۔قاضی صاحب نے بہت پہلے حالی کی اندھی تقلید کو اجاگر کیا۔ابھی حال ہی میں سرسید احمد خاں کے سفر آخرت کی روداد شائع ہوئی ہے جس سے خواجہ حالی کی چشم پوشی کا پردہ فاش ہوا۔حیرت اس بات پر ہے کہ شہر علی گڑھ میں سرسید کا لاڈلا اپنے بنگلہ پر شراب پی رہا تھا اور شہر میں باپ کی تجہیز و تکفین کے لئے چندہ جمع ہو رہا تھا۔

☆

قاضی صاحب کی شخصیت اس مینارۂ نور کی ہے جس نے حق گوئی و بے باکی، کا شعار اپنائے ہوئے اردو تحقیق کو گوہر آبدار سے سجایا، سنوارا ہے۔ان کے معاصرین نے ان کی صلاحیت کا اقرار کیا اور محتاط ہوگئے۔

امتیاز علی عرشی نے مرزا غالب کے اپنے ہی کلام کا انتخاب شائع کیا۔جو غالب نے نواب رام پور کو بھیجا تھا اور نواب رام پور کے نام غالب کے خطوط کو ایک مفصل مقدمہ اور ضروری حواشی کے ساتھ شائع کیا اور دو کتابیں،' انتخاب غالب' ' مکاتیب غالب' کے علاوہ مرزا غالب کے تمام اردو کلام کو جمع کیا جو دیوان غالب نسخہ عرشی کے نام سے مشہور ہے۔

قاضی صاحب نے مکاتیب غالب پر تبصرہ کیا (جو معاصر جلد ۵ شمارہ ۱۳/ اور ۶/۵ بابت مارچ ۴۳/ اور مئی۔جون ۴۳/ میں شائع ہوا۔اس کے مطالعہ کے لئے مذکورہ شمارہ دیکھنا چاہئے۔)

آخر میں قاضی صاحب نے عرشی صاحب کو ان الفاظ میں داد دی ہے :

'' مکاتیب غالب اردو کی ان چند کتابوں میں ہے جن کا حسن ترتیب داد طلب ہے۔جناب عرشی مرتب کے فرائض سے اچھی طرح واقف ہیں اور انھوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ فرائض کو ادا کیا ہے۔''

قاضی صاحب نے اچھے کام کی ستائش بھی کی ہے۔یہ بھی قاضی صاحب کا امتیاز ہی ہے۔

☆

ذکر غالب مالک رام کی مشہور تصنیف ہے۔غالب کی تاریخ پیدائش کا ذکر مالک رام نے ان الفاظ میں

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

کیا ہے :

''مرزا غالبؔ ۸/رجب ۱۲۱۲ھ (۲۷/دسمبر ۱۷۹۷ء) کی رات آگرہ میں پیدا ہوئے۔''

قاضی صاحب نے اس بیان پر گرفت کرتے ہوئے لکھا :

''یہ غالبؔ کی تاریخ پیدائش نہیں۔ یہ مرزا عبداللہ بیگ خاں کی بیوی عزت النساء بیگم کے اس بچہ کی تاریخ ہے جس کا نام کچھ دن بعد اسد اللہ بیگ خان رکھا گیا اور جو بہت بعد میں مرزا غالبؔ معروف ہوا۔''

قاضی صاحب کے اس بیان کے بعد مالک رام محتاط ہوگئے۔ پروفیسر سید مسعود حسین رضوی کے مرتبہ دیوان فائز پر تبصرہ کرتے ہوئے قاضی صاحب نے فائز کے والد کا نام محمد خلیل تاریخ محمدی کے حوالے سے بتایا۔

تذکرہ سلاطین سے فائز اور اس کے بھائیوں کے نام بتائے اور مجموعہ گستاخ سے شیخ علی حزیں کے خطوط بنام فائز کی اطلاع دی۔

یہ مسعود حسن رضوی کی تحقیق پر اضافے ہیں۔

قاضی صاحب جس طرح دوسروں کے بارے میں راست گوئی کی پاسداری کرتے ہیں وہ خود اپنے بارے میں یہی روایت قائم رکھتے۔

پروفیسر مختار الدین احمد نے ایک بار ان کا ایک مضمون شائع کرتے ہوئے لکھا تھا کہ قاضی صاحب نے تحقیق کو اس پایہ تک پہنچا دیا جس سے آگے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ قاضی صاحب نے فوراً لکھا کہ آپ کی رائے مبالغہ آرائی پر محمول ہے۔ میرا (قاضی صاحب) دعویٰ ہے کہ اس سے کہیں بہتر مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد نے کہیں یہ لکھ دیا کہ میرے پاس قاضی صاحب کے ایک ہزار خطوط ہیں ۔قاضی صاحب نے گرفت کی، جواب نہ آنے پر دوبارہ لکھا۔ اس بات کا آپ نے جواب نہیں دیا کہ میرے ہزار خط آپ کے پاس کہاں سے آگئے میرے نام جو خطوط آپ کے آئے ہیں اور میرے پاس جمع ہیں ان کی تعداد کسی طرح تین سو سے زیادہ نہ ہوگی۔ ممکن ہے کہ دس بیس خط ضائع بھی ہوئے ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اس کی کوئی وجہ نہیں کہ آپ کے ہر خط کے بدلے میں میں نے تین خط لکھے ہوں۔''

(مکتوب بنام مختار الدین احمد۔ ۲۷-۲-۵۷)

☆

قاضی صاحب کی مختصر نویسی بھی ان کی انفرادیت ہے، کیونکہ طویل تحریر سے اصل مدعا دھندلا ہو جاتا ہے۔

مالک رام نے لکھا :

''انھوں نے (قاضی صاحب) ایک مرتبہ گفتگو کے دوران بتایا تھا کہ میں نے مدتوں مختصر نویسی کی باقاعدہ کوشش کی ہے اور طویل مشق کے بعد اس پر قادر ہوا ہوں کہ کم سے کم الفاظ میں اپنا مدعا بیان کر سکوں۔''

مالک رام/قاضی صاحب کے بارے میں یہ بھی فرماتے ہیں :

''اور وہ (قاضی صاحب) جانتے ہیں کہ لوگ ان کے اسلوب تحریر کے شاکی ہیں۔ لیکن ان کا قول ہے کہ یہ دوسرے لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے کو اس طرح کے مضمون پڑھنے کا عادی بنائیں نہ کہ وہ مجھ سے اس کی توقع کریں کہ میں ان کی خاطر اپنی روش ترک کر دوں جب کہ میں اسے صحیح خیال کرتا ہوں ۔ایک اور موقع پر انھوں نے یہ بھی کہا کہ میں ہندوستان اور پاکستان کے لے دے کے کوئی دس آدمیوں کے لئے مضمون لکھتا ہوں۔''

''غالباً ان کی مراد یہ تھی میرے مضامین سے صحیح طور پر استفادہ کرنے والے دس آدمی ہوں گے۔''

(بحوالہ: قاضی عبدالودود سیمینار کے مقالے۔ص ۱۱۸)

ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں :

''ان (قاضی عبدالودود) کے مضامین دراصل شخصی NOTES ہوتے ہیں جنھیں کوئی انشا پرداز مضمون کی شکل میں لکھ دے تو جاذب توجہ ہو جائیں۔''

(بحوالہ: تمیز تحریر از ڈاکٹر محمد منصور عالم۔ص ۲۶)

قاضی صاحب کی تحریروں میں جاذبیت ہوتی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ قاضی عبدالودود صاحب کے اسلوب میں نئی دھج، نرالی ادا اور انوکھی شان نظر آتی ہے۔

☆

قاضی صاحب کا ذکر ہو اور ڈاکٹر گیان چند جین کا ذکر نہ آئے حیرت کی بات ہوگی۔ میں ڈاکٹر جین پر کوئی تبصرہ کرنے سے بہتر سمجھتا ہوں کہ قاضی صاحب کے بارے میں ڈاکٹر جین کے الفاظ نقل کروں :

> ''میں نے (ڈاکٹر گیان چند جین) کتاب (زیر طبع: قاضی عبدالودود۔ ایک تحقیقی مطالعہ) میں قاضی صاحب کے مضمون کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ ان کے کام اتنے زیادہ ہیں کہ مختصر لکھنے پر بھی کتاب ضخیم ہوگئی۔ ان کے مضامین کی پرانی فہرستوں میں ۲۹۰ مضامین ہیں میری فہرست میں ۴۷۸۔ قاضی صاحب پر میرا بنیادی مضمون بت شکن محقق تھا۔ میں اس کے موقف میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں کررہا ہوں۔ بہرحال موجودہ کتاب میں دس پندرہ فی صد اختلاف و اعتراض ہوگا۔ بقیہ سب تحسین آفرین۔ یہی نتیجہ نکالا ہے کہ قاضی صاحب اردو کے سب سے بڑے محقق تھے امید نہیں کہ آئندہ عرصہ دراز تک ان جیسا دوسرا محقق پیدا ہوسکے۔''

(بحوالہ : مکتوب بنام قاضی محمد مسعود ۱۴/۱ اکتوبر ۲۰۰۰ء)

یہ قاضی صاحب کا امتیاز ہے کہ ڈاکٹر گیان چند جین جیسا تحقیقی اور تنقیدی بصیرت رکھنے والا شخص بھی ان کی عظمت کا اعتراف کررہا ہے۔

☆

غرض کہ اردو تحقیق میں قاضی صاحب کی شناخت درج ذیل امتیازات کی وجہ سے ہے :

☆ قاضی صاحب نے سینکڑوں آوارہ گرد اشعار نوٹ کیے اور شاعر کا نام دریافت کیا۔ نیز تعین زمانہ کے تحت کئی سو صفحے لکھے۔

☆ قاضی صاحب نے دیوان جوشش، عیارستان، قطعات دلدار اور کلام شاد کی تدوین و اشاعت کی۔

☆ قاضی صاحب نے مصحفی اور ان کے اہم معاصرین کا جائزہ پیش کیا۔

☆ تذکرہ ابن امین اللہ طوفان کی اشاعت

☆ قاطع برہان کی تصحیح و اشاعت

☆ مآثر غالب کی تدوین و اشاعت

☆ دانش گاہوں میں ہونے والے تحقیقی کام کا جائزہ پیش کیا۔

ISSN :2582 -3612

اس سلسلے میں مسعود حسن رضوی (دیوان فائز) خواجہ احمد فاروقی (میر تقی میر) اختر اورینوی (بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء) نورالحسن ہاشمی (دہلی کا دبستان شاعری) سید محمد حسنین (مرزا محمد علی فدوی، عصر حیات اور شاعری) اور ممتاز احمد (مثنویات) کے تحقیقی کارناموں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔

☆ شاد عظیم آبادی کی سوانح عمری، شاد کی کہانی شاد کی زبانی پر تبصرہ کرتے ہوئے شاد کے اس بیان کو غلط ثابت کیا جس میں شاد نے دعویٰ کیا تھا کہ ان کا نسب نامہ پندرہویں پشت میں حسین فیروزی بادشاہ شیراز معاصر حافظ شیرازی سے ملتا ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے قاضی صاحب نے لکھا ہے :

> ''سچ تو یہ ہے کہ اس نام کا کوئی بادشاہ کسی جگہ کسی زمانے میں نہیں ہوا۔''

☆ قاضی صاحب نے مولانا ابوالکلام کی اس تحریر کو بھی چیلنج کیا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ ان کے والد مولوی خیرالدین نے سلطان عبدالحمید کو ۲۰؍لاکھ روپے جمع کرکے دیئے تھے قاضی صاحب نے لکھا :

> ''میں اسے قطعاً غلط سمجھتا ہوں اور جو اسے صحیح ثابت کرے اسے پانچ سو روپیہ انعام دینے کو تیار ہوں''

☆ قاضی صاحب ہمیشہ غیر جانب دار اور دوٹوک باتیں کہتے ہیں۔

☆ اس طرح انھوں نے اپنے اجداد کے ذکر میں لکھا ہے کہ ان کے دادا سودی کاروبار کرتے تھے۔

☆ قاضی صاحب صحت املا اور صحت زبان میں بے حد محتاط تھے اس لیے ان کی ہر کتاب میں غلط نامہ ضرور دیا جاتا تھا۔

اس سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے :

> ''اپنی غلطی کا اقرار اگر جرم ہے تو ہم اپنے جرم کا اقرار کرتے ہیں۔''

Dr. Syed Shahid Iqbal
Astana-e-Haque
Road No - 10
NEW KARIMGANJ
GAYA - 823001 (BIHAR)
Mob: 09430092930/ 09155308710

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ڈاکٹر غالب مصطفےٰ صدیقی

ٹیپو سلطان کو علامہ اقبال کا خراجِ عقیدت

ہندوستانی تاریخ اپنے جن چند جانبازوں کو ہمیشہ یاد رکھے گی، ان میں ٹیپو سلطان کا نام سرفہرست ہے۔ ایک ایسے دور میں جبکہ پورے ہندوستان میں انگریزوں کا طوطی بول رہا تھا میسور جیسی چھوٹی سی ریاست کا فرماں روا ٹیپو سلطان مردِ آہن بن کر انگریزوں کا راستہ روک رہا تھا۔ اگر چہ اس وقت ہندوستان میں دوسری طاقتیں مثلاً نظام حیدر آباد اور مراٹھوں کا بھی طوطی بول رہا تھا لیکن کسی نے انگریزوں سے لوہا لینے کی ہمت نہیں دکھائی اور نہ ہی انہوں نے ٹیپو سلطان کی بار ہا کوششوں کے بعد لڑائی میں اس کا ساتھ دیا۔

ٹیپو سلطان کا اصل نام ''فتح علی خان'' تھا اور ''ٹیپو'' پکارو نام تھا۔ یہ ''ٹیپو'' نام اس کے والد حیدر علی کا رکھا ہوا تھا جس کا مفہوم ''باگھ'' یا ''چیتا'' ہوتا ہے۔ اس سلسلے کا دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ''ٹیپو'' کے والدین کو جب برسوں تک کوئی اولاد نہ ہوئی تو ان لوگوں نے میسور کے ایک مشہور فقیر ''ٹیپو مستان شاہ'' کے مزار پر جا کر مرادیں مانگیں اور مرادیں بر آنے کے بعد اصل نام کے ساتھ ساتھ اسے ٹیپو کہنا شروع کر دیا اور بعد میں یہی نام مشہور ہو کر تاریخ کا حصہ بن گیا۔ نام کی مناسبت سے ٹیپو کے اندر جاں بازی اور بے جگری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اپنے والد حیدر علی کے انتقال کے بعد ۱۷۸۲ء میں ٹیپو سلطان دکن کی سب سے سرسبز ریاست میسور کا سلطان بنا اور وراثت میں اسے انگریزوں کی دشمنی بھی ہاتھ آئی۔ ٹیپو سلطان اکثر کہا کرتا تھا کہ ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے''۔ انگریزوں کے ناسور سے ملک کو نجات دلانے کے لئے اس نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ اس وقت کی دو بڑی طاقتوں ''نظام'' اور ''مرہٹوں'' سے اس نے انگریزوں کے خلاف جنگ کے لئے مدد مانگی لیکن ساتھ دینے کی بجائے ان لوگوں نے انگریزوں سے وفاداری نبھائی۔ تب ٹیپو سلطان نے اکیلے انگریزوں کے خلاف کمر کس لی اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب انگریزوں کے پاؤں یہاں سے اکھڑنے لگے لیکن ایسے وقت میں دوستوں نے مل کر انگریزوں کا ساتھ دیا اور بالآخر دونوں ہاتھوں میں تلوار تھام کر ٹیپو سلطان نے سرنگا پٹنم میں آخری لڑائی لڑی اور انگریزوں کے کشتوں کے پشتے لگا دئے لیکن آخر میں میر صادق جیسے غداروں کی وجہ سے ۴ مئی ۱۷۹۹ء میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے اور اس طرح ہندوستان کی آزادی کی آخری امید اور روشن چراغ اپنے ہی لوگوں کی غداری کی وجہ سے بجھ گیا۔

اس طرح ٹیپو سلطان کی شخصیت اُس مردِ آہن اور جاں باز کی شخصیت تھی جو ٹوٹ تو سکتا تھا مگر

جھک نہیں سکتا تھا۔ وہ شیروں کی طرح دشمنوں پر جھپٹا اور اپنی جان کی پروا کئے بغیر جام شہادت نوش فرمایا۔ آج بھی وطن کے اس جاں باز سپوت کے قدموں کی دھمک کی گونج سرنگا پٹنم میں سنائی دیتی ہے۔

''ٹیپو سلطان'' کی شخصیت علامہ اقبالؔ کی محبوب شخصیتوں میں سے ایک تھی۔ انہوں نے اپنی ایک نظم ''ٹیپو سلطان کی وصیت'' کے ذریعہ ٹیپو سلطان کے لئے نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔ علامہ اقبالؔ نے ۱۹۳۰ء میں ٹیپو سلطان کے مزار پر حاضری دی اور فاتحہ خوانی کے بعد اپنی عقیدتوں کا اظہار یوں کیا ؎

اے شہید اے مردِ میدانِ وفا تجھ پر سلام
تجھ پہ لاکھوں رحمتیں لا انتہا تجھ پر سلام

اگر شاعری روح کی بلند پروازی کے دوران گایا ہوا گیت ہے تو اقبالؔ بلا شبہ نایاب پُر اثر و پُر جوش گیتوں کے شاعر تھے۔ انہوں نے مادّی، اخلاقی اور روحانی مسائل پر غور کرنے کے لئے راستے دکھائے۔ عشق و عقل، فکر و فن اقبال کے محبوب موضوع ہیں۔ ٹیپو کی شخصیت اقبال کی نظروں میں پُر عظم مجاہد کی تھی اور لوگ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کا آخری ذریعہ مانتے تھے اور وطن والوں کی بے حسی کی وجہ سے وہ آخری تلوار بھی ٹوٹ گئی۔ اقبالؔ تلقین کرتے ہیں کہ کبوتر کے تنِ نازک میں فولاد کا جگر پیدا کرنے کی ضرورت ہے ؎

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

بقول آل احمد سرور: ''اقبال کی عظمت یہ ہے کہ ان کے یہاں مشرق و مغرب کے فکری اور ادبی سرمائے پر نظر بھی ہے اور ماضی کے عرفان کے ساتھ حال کے آشوب اور مستقبل کا ایک خواب بھی ہے''۔ اسی لئے ''ضربِ کلیم'' کی بعض نظموں میں خصوصاً ''ٹیپو کی وصیت'' میں اپنے جاں باز مجاہدوں سے متعارف بھی کرایا ہے تاکہ اس پُر آشوب دور میں ہم ان کا تاثر لے سکیں۔ بلا شبہ اقبالؔ نے شاعری کو محفلِ سماع اور بزمِ ماتم سے نکال کر مجاہدوں کی صف اور دانشوروں کے حلقوں تک پہنچا دیا۔

''جاوید نامہ'' میں بھی اقبال نے تقریباً آٹھ صفحات میں ٹیپو سلطان کی عظمتوں کے گیت گائے ہیں۔ اس نظم کو انہوں نے ایک طرح سے طربیہ الٰہی کہا ہے۔ اس مثنوی میں اقبال نے ''فلک زحل'' کا منظر دکھایا ہے۔ اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ غدار شیطانی روحیں جنہوں نے ملک و قوم سے غداری اپنے مفاد کی خاطر کی ہے اور جن کو دوزخ نے بھی قبول نہیں کیا وہ یہاں پر ہیں ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگ آدم، ننگ دیں، ننگ وطن

''فلک زحل'' وہ جگہ ہے جہاں بحر ظلمات نے اپنا ڈیرہ ڈال رکھا ہے اور جہاں ایک لاکھ فرشتے قہر الٰہی کا اظہار کرنے کے لئے گناہ گاروں پر مسلسل بجلی کے کوڑے مارتے ہیں۔ یہاں ملک وملت کی ایسی ہی غدار روحوں کا آخری ٹھکانہ ہے۔

ملّتے راہر کجا غارت گریست
اصل او از صادقے یا جعفریست

جس کسی جگہ میں ملت کا غارت گر ہے اس کی اصل کسی صادق یا جعفر سے ہے۔اے اللہ سب کو تباہ و برباد کردے۔

ملک وقوم کے جاں باز سپوت ٹیپو سلطان کو اقبالؔ اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

آں شہیدانِ محبت را امام
آبروئے ہند و چین و روم و شام

عشق ایک راز تھا جو اس نے صحرا پر رکھ دیا یعنی وہ راز عام کردیا۔ تجھے علم نہیں کہ اُس (ٹیپو) نے اپنی جان کس قدر شوق وجذبے سے قربان کی تھی۔

عشق رازے بود بر صحرا نہاد
تو ندانی جاں چہ مشتاقانہ داد

اگر چہ ٹیپو اس دنیا سے رخصت ہوگیا لیکن اس کا ڈنکا ابھی تک دکن میں بج رہا ہے اور لوگ آج بھی اپنے بچوں کا نام ''ٹیپو'' ہمت، جواں مردی اور وطن سے بے مثال محبت کی خاطر رکھتے ہیں۔

رفت سلطاں زیں سرائے ہفت روز
نوبت او در دکن باقی ہنوز

''اقبال سلطان شہید زندہ رود'' یعنی علامہ اقبال لوگوں سے مخاطب ہوکر پوچھتے ہیں کہ وہ ہندوستان جو سارے جہاں میں افضل ہے، وہ ہندوستان جس کی مسجدوں میں مسلمانوں کے ہنگامے ختم ہو چکے ہیں، وہ ہندوستان جس کے مندروں میں آگ بجھ گئی ہے، وہ ہندوستان جس کی آگ کو ہم نے پالا اور جس کے لئے ہم نے اپنا دل خون کرلیا، اس عاشق کو نہ پہچاننے والے پر افسوس ہے۔ ٹیپو سلطان اپنے ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانا چاہتے تھے اور مکاروں وغداروں سے آزاد کرانے میں اپنی زندگی کا ایک ایک دن صرف کردیا۔ ٹیپو سلطان کو جہاں اپنی زمین یاد آتی ہے وہاں وہ کاویری ندی کو بھی شدت سے یاد کرتے ہیں۔ ٹیپو سلطان نے اپنے قول کو اس شعر کے ذریعہ ظاہر کیا ہے۔ بقول اقبالؔ۔

زندگی را چیست رسم و دین و کیش
یک دم شیرے بہ از صد سالہ میش

ٹیپو نے قوم وملک کے لئے اپنی زندگی کے عیش وآرام و دولت نیز سلطنت دے کر وہ عظیم مثال قائم کی ہے جس کی دوسری مثال کہیں نہیں ملتی۔ ٹیپو نے آزادی کے لئے جد و جہد کی جو مثال قائم کی ہے وہ لوگوں کے دلوں کو روشن اور مہمیز کرتی رہے گی اور روشن مینارہ بن کر ہمارے دلوں میں زندہ رہے گی۔

مرنے پہلے سے میں نے جلائے کئی چراغ
جاری ہے روشنی کا سفر میرے بعد بھی

میسور کے لوگوں کو ٹیپو کے کارنامے یاد ہیں۔ اگر چہ کچھ شر پسند اسے تعصب کی وجہ سے غلط رنگ دینے میں لگے ہیں۔ لیکن ایسا مثالی شہید کسی ایک قوم کا نہیں بلکہ اپنے ملک کی تمام قوموں کا ہیرو ہوتا ہے۔

Dr. Ghalib Mustafa Siddiqui
Asst, Professor
Ananda College
Hazaribagh (Jharkhand)

ڈاکٹر عبدالوحید

شیخ عبدالحق محدث دہلوی : احوال وافکار

شیخ محقق شاہ عبدالحق دہلوی علیہ الرحمہ (۹۵۸ھ/۱۰۵۲ھ) کی شخصیت اپنے علم وعرفان اور عظیم تجدیدی و تصنیفی خدمات کے باعث بڑی ہی قد آور اور بلند وبالا ہے۔حضرت شیخ عبدالحق بن سیف الدین محدث دہلوی علیہ الرحمۃ کی وہ ذات گرامی ہے جن کی تصنیفات نے دین متین کے احیاء وتجدید میں عظیم خدمات انجام دی ہیں۔ان کی عالمانہ اور صوفیانہ زندگی کتنے طالبانِ حقیقت کیلئے دلیل راہ بنی۔اوران کی جلیل الشان تصانیف نے کتنے گم گشتگانِ راہ کو جامِ ہدایت سے سیراب کیا۔آج بھی آپ کی ذات گرامی عالم اسلام کی مُسلّمہ شخصیت اوران کے رشحاتِ قلم علماءِ دین کا مرجع اور مستند ذخیرہ ہیں۔

اس نادرِ روزگار شخصیت کی ولادت ماہ محرم ۹۵۸ھ مطابق ۱۵۵۲ء میں ہوئی۔آپ کے مورث اعلیٰ ترک ، بخارا کے رہنے والے تھے ۔ تیرہویں صدی عیسوی میں ایک جماعت کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے۔شیخ کے والد مولانا سیف الدین صاحبِ دل بزرگ اور مایہ ناز شاعر اور بذلہ سنج تھے۔شیخ نے ابتدائی تعلیم وتربیت والد ماجد کے زیرسایہ رہ کر کی۔والد نے آپ کے اخلاق و عادات اور خیالات کی ترتیت میں خاص اہتمام فرمایا۔اپنی خداداد ذہانت وفطانت سے پندرہ سال کی عمر میں حفظِ قرآن، وخطاطی کے ساتھ ساتھ تمام علوم اسلامیہ سے فارغ ہوگئے۔آپ کے اساتذہ بھی آپ کی جُودتِ طبع اور ذہانت کے معترف تھے۔

حصول علم کا جذبہ اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ ہر وقت مطالعہ اور کتب بینی میں مستغرق رہتے۔مطالعہ میں مشغولیت کا یہ عالم رہتا کہ بارہا سر کے بال اور عمامے جل گئے اور آپ کو مطلق خبر نہ ہوئی۔

آپ نے عربی وفارسی میں کامل دستگاہ حاصل کر لینے کے بعد علماءِ ماوراء النہر سے بھی استفادہ کیا۔ اپنے والد سے اسرارِ تصوف بھی حاصل کئے تھے۔اس لئے ان پر تصوف کا غلبہ زیادہ رہا۔عہدِ طُفولیت ہی سے نماز، روزہ،اور وظائف کی تعلیم مل چکی تھی۔جوان ہونے پر یہ شغف ایک حد تک بڑھ گیا۔

تحصیل علم سے فراغت کے بعد آپ نے حجازِ مقدس کا سفر فرمایا۔اس وقت اکبر کا زمانہ تھا۔ لادینیت پھیل چکی تھی۔علما اکبر کے خودساختہ دین کی حمایت میں مسلمانوں کو گمراہ اور بے دین کررہے تھے۔خدا کے نیک بندوں کو گوشۂ تنہائی میں بھی سکون نصیب نہ تھا۔ان حالات سے عاجز آکر بہت سے علماء ومشائخ نے ترکِ وطن ہی مناسب سمجھا،آپ نے یہاں کے حالات کا بغور مطالعہ کرلیا تھا۔اور کسی حد تک مایوس بھی ہوگئے

ISSN :2582 -3612

تھے۔اس لئے ۹۹۶ھ مطابق کواڑتیس سال کی عمر میں ہوتے ہوئے احمد آباد پہنچے اور وہاں سے حجاز پہنچ گئے۔

علمائے مکہ معظّمہ سے آپ نے احادیث کا درس لیا پھر شیخ عبدالوہاب متقی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔شیخ عبدالوہاب متقی نے علوم ظاہر وباطن کی تعلیم فرمائی۔انہوں نے آپ کو سلسلۂ قادریہ اور سلوک وارشاد شاذلی اور سلسلۂ مدینہ وحشتیہ (جو اوپر سے شیخ مودود چشتی تک پہنچتا ہے۔) خلافت سے نوازا۔شیخ عبدالوہاب متقی سے اجازت لیکر مدینہ حاضر ہوئے ۔ مدینہ شریف سے واپسی کے بعد شیخ متقی نے فرمایا'' اکنوں عزیمت ہندوستان بکیند'' اب ہندوستان کا عزم کرو۔'' آپ نے حجاز نہ چھوڑنے کا ارادہ کیا۔لیکن شیخ کے پیہم اصرار سے آپ ہندوستان آئے۔ چلتے وقت شیخ متقی نے حضرت غوث اعظم علیہ الرحمۃ کا ایک پیراہن بھی عطا فرمایا۔

آپ نے حجاز سے آنے کے بعد درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا۔اور یہ آخری عمر تک جاری رہا۔ آپ کا مدرسہ ہندوستان گیر شہرت کا حامل تھا۔اور ایسے انحطاطی دور میں قائم ہوا تھا۔جبکہ ہر چہار طرف بدعات و منکرات کا دار دورہ تھا۔بارہا نا مساعد حالات بھی آئے لیکن آپ کے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہ آئی۔

سب سے پہلے شیخ نے اپنے والد سے بیعت کی خود ہی فرماتے ہیں'' والد رابرحق حق بدری، واستاذی ، ودوستی، وپیری جمع است'' (وصیت نامہ) میرے والد کے میرے اوپر پدری، استاذی ودوستی وپیری سبھی حقوق جمع ہیں۔اس کے بعد والد کے حکم سے سید موسیٰ گیلانی کے حلقۂ مریدین میں شامل ہوگئے۔حضرت موسیٰ گیلانی سلسلہ عالیہ قادریہ کے بزرگ تھے۔اور سید عبدالحامد کے فرزند تھے۔حضرت موسیٰ گیلانی نے شیخ کے ساتھ غایت درجہ لطف وکرم فرمایا اور خلافت سے نوازا۔مکہ شریف میں شیخ عبدالوہاب متقی نے مختلف سلاسل میں خلافت سے نوازا۔پھر جب ہندوستان آئے تو خواجہ محمد باقی کی خدمت میں شرف یابی کا موقع ملا۔اور انہیں کے پاس نقشبندی طریقۂ خواجگان کی مشق کی۔ان سے بیعت بھی کی ۔اس طرح آپ کو مندرجہ ذیل سلاسل سے تعلق حاصل تھا۔قادریہ، چشتیہ،شاذلیہ، مدینہ،نقشبندیہ لیکن آپ کو سلسلۂ قادریہ سے خصوصی لگاؤ تھا۔آپ نے فرمایا ہے کہ :

> ''حضور غوث پاک نے سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارے سے مجھے
> خواب میں مزید بھی فرمایا ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بزبانِ فارسی فرمایا
> تھا۔''بزرگ خواہی شد''

ایک مکتوب میں اپنے فرزند نورالحق کے نام لکھتے ہیں :

فقیر کا مرجع و ماویٰ ، حضرت پیر دستگیر ، غریب نواز، شکستہ پرور ، غوث الثقلین شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی کے وسیلہ سے سیدِ کائنات، خلاصہِ موجودات ﷺ ہیں۔

آپ کے اندر شروع ہی سے تصوف کا رنگ غالب تھا۔اور کیوں نہ ہو۔والد کی متصوفانہ صحبت جو پائی تھی۔؟ عبدالقادر لکھتے ہیں۔''در تصوف رتبہ بلند دارد'' تصوف میں بلند رتبہ ہیں (منتخب التواریخ)

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

خافی خاں نے منتخب اللباب میں لکھا ہے :

''نیکی اور تقویٰ (جو کہ علم باعمل کیلئے لازمہ ہے) میں ممتاز تھے۔ فرائض و سنت کی ادائیگی میں اخیر دم تک کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ فرمایا۔''

۲۱/ربیع الاول ۱۰۵۲ھ کو چورانوے سال کی عمر میں یہ بادشاہِ علم وفن ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سو گیا۔

جب ہم ہندوستان کی سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی کی مذہبی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں مختلف افکار ونظریات کی حامل تحریکیں نظر آتی ہیں۔ جو کسی نہ کسی طرح اسلام کے مسلم عقائد ونظریات سے متعارض دکھائی دیتی ہیں۔ ان تحریکوں کا مقصد اسلام کے استحکام کو ختم کرنا تھا۔

جیسے عقیدۂ مہدویت، تصور امام، دین الٰہی، ان سے اسلام کو جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے اس کی مثال نہیں پیش کی جاسکتی ہے۔ لیکن ایسے پرفتن اور نازک دور میں جبکہ ہندوستان بدعات ومنکرات کا مرکز بن کر رہ گیا ہو جب شعائرِ اسلام کا صراحتہً مذاق اڑایا جارہا ہو۔ جب یہ پاک طینت مشائخ اور بزرگوں کو گوشۂ تنہائی نصیب نہ ہو۔

حق کی سربلندی وعظمت کی حفاظت وصیانت اور دشمنان اسلام کی بیخ کنی کے لئے شیخ محقق رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ نے ان تمام تحریکوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور بادشاہی رعب وجلال کی پرواہ کئے بغیر حق وصداقت کی خاطر زبان وقلم سے جہاد کرتے رہے۔

ہندوستان کی سرزمین میں بہت سے علماء وفضلاء پیدا ہوئے اور سب نے حتیٰ المقدور دین متین کی خدمت کی۔ لیکن گیارہویں صدی ہجری میں جبکہ شمالی ہندوستان میں علم حدیث کا تقریباً خاتمہ ہو چکا تھا۔ آپ نے علمِ حدیث کی شمع روشن کی۔ اور مختلف علوم وفنون میں تحقیقی کتابیں تصنیف فرمائیں جن کی تعداد ترسٹھ ۶۳/ تک پہنچی ہے۔ آپ کے علم کا اعتراف داراشکوہ نے اس طرح کیا ہے :

''آپ اپنے وقت کے محدثین کے امام ہیں۔''

خافی خاں اس طرح رقم طراز ہیں :

''در کمالاتِ صوری ومعنوی وتحصیل علوم عقلی ونقلی خصوصاً تفسیر وحدیث در تمام ہندوستان ثانی نہ داشت۔'' (منتخب اللباب)

صوری ومعنوی کمالات اور علوم عقلی ونقلی خاص طور پر تفسیر وحدیث میں پورے ہندوستان میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ آپ کو معلوم تھا کہ ایسے ناگفتہ بہ اور پرآشوب حالات میں حدیث ہی لوگوں کو صحیح راہ دکھا سکتی ہے۔ اس لئے آپ نے کتبِ احادیث کو نصاب کا لازمی جزو قرار دیا۔ اپنے مدرسہ میں باقاعدہ احادیث کا درس دیا۔ اس وقت ہندوستان میں فارسی زبان کا رواج تھا۔ آپ کو عربی عبارات کو فارسی میں منتقل کرنے پر زبردست قدر حاصل تھی۔ آپ نے عوام کی سہولتوں کے پیش نظر فارسی میں احادیث کا ترجمہ کیا۔

گیارہویں صدی ہجری میں علماء فلسفہ اور علم کلام کو کافی اہمیت دیتے تھے، قرآن وحدیث کو ثانوی درجہ حاصل تھا۔ ان حالات میں شیخ محقق نے جہاں اس کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ وہیں لوگوں کو اس کے مُضر اثرات سے بھی آگاہ کیا۔ شیخ محدث نے اعلان کیا کہ علم وہ ہے جو دین وملت کی بقا اور تقویت کا سبب ہو۔ ایک مکتوب میں یہ شعر

علمِ دین فقہ است و تفسیر و حدیث
ہر کہ خواندہ غیر ایں گرد د خبیث

لکھ کر قرآن وحدیث اور فقہ وتفسیر کے مطالعہ کی ترغیب دیتے ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی عالم اسلام کی اس عظیم ترین شہرۂ آفاق اسلامی شخصیت کا نام ہے جو علم و ادب کی نکتہ شناس فکر وآگہی کی طائرِ بلند پرواز، اربابِ کمال کی آبرو بزم عشق عرفان کی مسند نشیں ہے۔ جس کی پوری زندگی خدمتِ خلق اور خیر خواہی مسلمین کیلئے وقف رہی۔ جس نے نصف صدی تک اپنی زبان وقلم سے تحقیقات کے وہ آبدار گوہر لٹائے جو رہتی دنیا تک اپنی درخشندگی وتابندگی کی وجہ سے جگمگاتے اور جھلملاتے رہیں گے۔ آپ نے تقریباً پچیس علوم وفنون پر ساٹھ سے زائد کتابیں ورسائل تصنیف فرمائیں۔ ان کی تصنیفات فن وموضوع کے اعتبار سے مندرجہ ذیل عنوانات پر تقسیم کی جاسکتی ہے۔

۱ تفسیر، ۲ تجوید، ۳ حدیث، ۴ عقائد، ۵ فقہ، ۶ تصوف، ۷ اخلاق، ۸ عملیات، ۹ فلسفہ و منطق، ۱۰ تاریخ، ۱۱ نحو، ۱۲ سوانح، ۱۳ سیر، ۱۴ مکاتیب، ۱۵ خطبات

فنِ حدیث کے آپ مسلّم امام ہیں۔ اس لئے آپ کو محدث دہلوی اور ناشرِ احادیث کہا جاتا ہے۔ اس فن میں آپ کی درجنوں کتابیں مفید عوام وخواص ہیں۔ خصوصاً المعات، اشعۃ اللمعات، اور ماثبت فی السنہ، رسالہ اقسام حدیث، الاکمال فی اسماء الرجال کافی اہم ہیں۔ عقائد میں تکمیل الایمان وتقویۃ الایقان، تاریخ میں جذب القلوب، ذکر مُلوک (تاریخ سلاطین ہند) سیر وتذکرہ میں مدارج مالنبوت زبدۃ الاثار، اخبار الاخبار، اخلاق میں آداب الصالحین وآداب اللباس، فقہ میں فتح المنان فی تائید مذہب النعمان تصوف میں شرح فتوح الغیب، انتخاب مثنوی مولوی معنوی، ترجمہ غنیۃ الطالبین، اور دیگر علوم وفنون میں ساٹھ سے زائد آپ کی تصنیفیں ہیں۔ جو بے حد مفید اور محقق اور محدث کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

شیخ کی تمام زندگی تصنیف وتالیف میں گذری، اور جس علم کو ہاتھ ڈالا اور قلم اٹھایا۔ اس کا حق بکمال ادا کیا۔ آپ میدانِ علم وتحقیق کے شاہسوار ہیں۔

Dr. Abdul Waheed
Head
Deptt. of Persian
L. N. T. College,Muzaffarpur
Mob. - 98010 37112

محمد ضیاء الحق

پرویز شاہدی کی غزل گوئی : اجمالی جائزہ

صوبہ بہار کا ادبی منظر نامہ خواہ شاعری ہو یا فکشن ہر اعتبار سے روشن اور تابناک رہا ہے۔ ہر عہد میں اس صوبے کے ادیب وشعرا نے اپنی فنی انفرادیت کا لوہا منوایا ہے۔ جہاں تک شاعری کی بات ہے تو اس سلسلے سے بیدل سے لے کر شاد تک اور شاد سے لے کر موجودہ زمانے تک بہار کی سرزمین پر کئی اہم شعرا نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے شعری ادب کو وسیع پزیر بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان شاعروں میں ایک اہم نام پرویز شاہدی کا بھی ہے۔ آپ کی پیدائش اور آبائی وطن کے سلسلے سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے :

> ''ان روشن ستاروں میں ایک ستارے کا نام پرویز شاہدی ہے جو ۲۱ ستمبر ۱۹۱۰ء کو منور ہوا تھا اور اپنے جلوے بکھیر کر ۵ مئی ۱۹۶۸ء کو معنوی طور پر بجھ گیا، مگر حقیقی طور پر اس کی کرنیں آج بھی دماغوں کو روشن کر رہی ہیں اور نسل در نسل منتقل ہو رہی ہیں۔ پرویز شاہدی کا اصل نام سید اکرام حسین تھا۔ وہ محلّہ لودی کٹرہ پٹنہ سیٹی (عظیم آباد) کے ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے جہاں جاگیردارانہ جاہ وحشمت کا رعب ودبدبہ تو تھا ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ صوفیانہ ہمدردی، فیاضی اور درویشانہ وقار وجلال سے بھی یہ گھرانہ مالا مال تھا۔''
>
> (پرویز شاہدی، بہار اردو اکادمی، ص-۳)

اس طرح آپ کی پیدائش اور خاندان کا بخوبی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک حساس شاعر کا دل اور دماغ عطا کیا تھا۔ اس پر اضافہ یہ کہ آپ کے گھر کا ماحول بھی ادبی تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو کم عمر میں ہی شعر گوئی سے خاص دلچسپی ہوگئی۔ آپ کی ابتدائی شاعری میں روحانیت اور جذبانیت کا خاص اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔

جہاں تک آپ کی غزل گوئی کی بات ہے تو اس سلسلے سے یہ کہا جائے گا کہ آپ نے وطن پرستی کو بھی خاص موضوع بنایا، لیکن یہ بھی تسلیم شدہ امر ہے کہ عمر اور ذہن کی بالیدگی کے ساتھ ساتھ آپ کی غزلیہ شاعری بھی نئے منازل طے کرتی رہی اور ادبی حلقہ اس کی عظمت کا اقرار کرنے لگا۔

ISSN :2582 -3612

آپ کی تحریر کردہ ابتدائی غزلوں میں ناسخ غالب کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے، لیکن بہت جلد آپ نے اپنی شاہ راہ خود بنائی اور موضوع اور اسلوب دونوں اعتبار سے آپ کی انفرادیت آپ کی غزلوں میں جلوہ نما ہونے لگی۔ اس سلسلے سے پرویز کا نظریہ ملاحظہ کیجئے ؎

نہ فضائے نزم میں منتشر، نہ پناہ پردۂ ساز میں
ہوں وہ نغمہ جو ابھی پل رہا ہے ضمیر مطرب راز میں
وہ تجلیاں جو سنور رہی تھیں نگارخانہ راز میں
جو حقیقتوں پہ نظر پڑی اتر آئیں بزم مجاز میں

آپ کی ابتدائی غزلوں میں رومانیت کا رنگ بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ ہم اس بات سے آگاہ ہیں کہ غزلیہ شاعری دراصل حسن وعشق، جذب وشوق اور تصور وتخیل کی شاعری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرویز شاہدی کی غزلوں میں بھی رومانی جذبات اور کیفیت وسرور کی رعنائی دلکشی بدرجہ اتم موجود ہے۔ یا یوں کہیں کہ آپ نے رومانی جذبات وکیفیات کی بڑی حسین ولطیف مصوری کی ہے۔ محبوب کی ناز وادا اور واردات قلبی کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اس سلسلے سے اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

خدا بھلا کرے آنکھوں کی مسکراہٹ کا
کہ دیکھ لی ترے جلوؤں کی گدگدی میں نے

نظر کو روکئے چھیڑے نہ اب زخم محبت کو
کہ اپنے ہر نفس کو آج نشتر کر لیا میں نے

وہ تجلیاں جو سنور رہی تھیں نگار خانہ راز میں
جو حقیقتوں پہ نظر پڑی اتر آئیں بزم مجاز میں

اس کے علاوہ آپ نے زمانے کی افراط وتفریط اور سیاسی اتار چڑھاؤ کو اپنی غزلوں کا حصہ بنایا جس کے سبب آپ کی غزلوں میں جوش اور خطابت کا رنگ بھی بخوبی طور سے جگہ پا گئی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ پرویز شاہدی کو بہت جلد یہ بھی احساس ہو گیا کہ اردو غزل صرف جوش اور ولولے کی شاعری تک محدود نہیں رہ سکتی لہٰذا آپ نے اپنی غزلوں کے حوالے سے قارئین کو غور وفکر کی دعوت بھی دی اور اس طرز کی غزلوں میں ہمواری، نرمی اور توازن کی خوبیاں موجود نظر آتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پرویز شاہدی کی اس طرز کی غزلیں انہیں ادبی دنیا میں انفرادیت عطا کرنے میں معاون ثابت

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ہوئیں کیوں کہ اس طرز کی غزلوں میں انفرادی فکر سرمستی والہانہ پن اور ربودگی آپ کی غزلوں کو ایک نیا حسن بخشتی ہیں۔اس پر اضافہ یہ کہ اس طرز کی غزلیں قاری کو اپنا گرویدہ بنانے میں بھی کامیاب رہیں۔اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''پرویز کی خلاقی اور ان کی اضطرابی اور سیمابی فطرت نے اپنے اظہار کے لئے آخر کار راستہ ڈھونڈ ہی لیا۔آس پاس پھیلی مفلسی، بیکاری، بدحالی اور پامالی نے ان کے اندر چھپے انسانیت کے جذبے کو کچھ اس طرح بیدار کیا کہ اس کا مداوا انہیں اس وقت کے نئے رجحان میں نظر آنے لگا۔

اشتراکیت کی ذہنی وابستگی نے پرویز شاہدی کی شاعری کو ایک نئے راستے پر گامزن کر دیا۔پرویز کی شاعری کا یہ دور ایک اہم موڑ کہا جاتا ہے۔اس راستے پر وہ بہت دیر اور دور تک مسافت کرتے رہے۔نتیجے کے طور پر ان کے کلام کا بڑا حصہ ترقی پسندی کے رنگ و آہنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔اسی بنا پر انہیں ترقی پسند شاعر کہا جاتا ہے۔اس عہد میں انہوں نے اپنے قلم کو تیشہ بنا لیا اور ظلم و جبر کی دیوار کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہوگئے۔عوامی، بیداری اور جدوجہد کے جذبے کو فروغ دینے کے لئے شاعری انہیں کارآمد ذریعہ محسوس ہونے لگی۔''

(پرویز شاہدی، بہار اردو اکادمی، ص-۱۲-۱۱)

مختصر یہ کہ پرویز شاہدی کی ابتدائی غزلوں میں رومانیت ہے، لیکن رفتہ رفتہ آپ کی غزلوں میں زندگی کے پیچ وخم کی بہترین تصویر کشی دیکھنے کو ملتی ہے۔اس سلسلے سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

سلگا دیا ہے ذہن کو بھی دل کی آنچ نے
روشن جہان فکر و نظر پا رہا ہوں میں

شوق کے تسلسل کو داستاں بنانا ہے
اک جہاں مٹانا ہے اک جہاں بنانا ہے

گیت ہریالی کے گائیں گے سسکتے ہوئے کھیت
محنت اب غارت جاگیر تک آ پہنچی ہے

مرا رنگ سخن کیا ہے میری طرز نوا کیا ہے
جبیں وقت کی تحریر پڑھ لو پوچھنا کیا ہے

اس طرح یہ کہا جائے گا کہ آپ کی غزلوں میں ترقی پسند اور اشتراکی خیالات ونظریات کے نقش ونگار بخوبی موجود نظر آتے ہیں۔عصری حالات وکیفیات کو آپ نے اپنی غزلوں کا حصہ بنایا مختصر یہ کہ عصری تہذیب وتمدن نظام تعلیم کی شکستہ حالی قدروں کی پامالی کی آپ نے بہترین ترجمانی کی ہے۔ اس سلسلے سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

اپنے نقوش پا سے زمانے کے واسطے
ترتیب دے رہا ہوں نصاب سفر کو میں

کیوں کر ہو باریاب تجلی حیات کی
قصر جمالیات ہے بے بام و در ابھی

نہ جانے درس گاہوں کو کہاں پہنچا کے دم لے گی
یہ تعلیمی کج اندیشی یہ بے سمتی نصابوں کی
دلوں میں شعلے سسک رہے ہیں جمی ہوئی ہے برف لبوں پر
سوال بھی بجھ کے رہ گئے ہیں جواب بھی بجھ کے رہ گئے

نہ دے سکے گی شکست ہمت کو تیغ حالات کی روانی
نشاطِ امروز کی ہے ضامن یقین فردا کی سخت جانی

آپ کی غزلیہ شاعری کے حوالے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''پرویز شاہدی نے اپنی غزلوں میں بھی اپنے انقلابی نظریات وخیالات کی فضا آفرینی کی ہے۔عصری مطالبے کے تحت انہوں نے بیداری کی زمزمہ سنجیاں فضا میں بکھیرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہیں۔ایک بالغ نظر فنکار عصریت کی نبّاض اور نقاد ہوتا ہے۔''

(پرویز شاہدی حیات اور شاعری، ڈاکٹر طلعت قیوم،ص-۲۰۰)

جب ہم پرویز شاہدی کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ آپ

نظریاتی طور پر ابتدا ہی سے اشتراکیت سے وابستہ رہے اور آپ کے اندر جذبہ حب الوطنی نے بھی آپ کو تحریک آزادی میں شریک ہونے پر مجبور کیا۔ اس لحاظ سے آپ کی غزلیہ شاعری میں زندگی اور معاشرے کی بھرپور عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جائے گا کہ آپ کے یہاں داخلیت سے زیادہ خارجیت نے جگہ پائی۔ اس ضمن میں آپ نے عوام سے براہ راست گفتگو کا انداز اپنایا۔ اس کے ساتھ ہی آپ کے یہاں شدت پسندی کی جگہ اعتدال کو فوقیت حاصل ہے۔ جس سبب آپ کی غزلیہ شاعری میں موجود آپ کی قادرالکلامی اور مشاہداتی قوت قارئین ادب کو متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔ مختصر یہ کہ آپ کی غزلیں کو فن اور فکر دونوں اعتبار سے شعری منظرنامے پر اضافے کی چیز تسلیم کی جانے لگیں۔

Md. Ziaul Haque
Asstt. Professor
Deptt. of Urdu
B. L. N. L. Bohra College
Rajmahal, Sahebgaj - 816 108
Mob. : 70509 29150

ڈاکٹر محمد سمیع الدین

حمید سہروردی کے افسانوں میں رنگِ تصوف

تصوف اسلام کی روح ہے اور تصوف سے مراد ہے خود کو اللہ تعالیٰ کی محبت کے لئے وقف کر دینا اور اس کی محبت میں ڈوب جانا۔ تصوف کے سلسلہ میں دو نظریہ پائے جاتے ہیں۔ پہلا ہے فلسفہ وحدت الوجود جس کا مفہوم ہے کہ ساری کائنات اللہ کے نور سے بنی ہے اور اس کی ذات کا ایک جزو ہے۔ دوسرا نظریہ ہے فلسہ وحدت الشہود جس کا مفہوم ہے ساری کائنات خدا کے نور سے نہیں بلکہ اس کے حکم سے بنی ہے۔ یہ دونوں نظریات پر الگ الگ صوفیوں کا عقیدہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صوفیہ نے اپنے واردات قلبی اور مسائل تصوف کو کبھی نثر اور کبھی نظم میں ظاہر کیا ہے۔ دیکھئے خواجہ میر درد کے تصوف کے رنگ میں رنگے ہوئے اشعار

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا　　تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
ارض وسما کہاں تری وسعت کو پا سکے　　میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

عشق الٰہی کا نام ہی تصوف ہے۔ جب بندے کو خدا سے عشق ہوتا ہے اور وہ اللہ کی وصل کا خواہش مند طلبگار ہوتا ہے۔ یعنی انسان خدا کی محبت میں مجذوب ہو جاتا ہے اور وہ خدا کی ذات میں جذب ہو جاتا ہے۔ خدا کے جلوے کے سوا اسے کوئی چیز نظر نہیں آتی اور جو سچا صوفی ہوتا ہے اسے دنیا حقیر اور زندگی حد سے زیادہ ناپائیدار نظر آتی ہے۔ ہر انسان کی فطرت میں تصوف کا عنصر ہوتا ہے۔ دراصل تصوف اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتا ہے۔ حضرت شیخ جنید بغدادیؒ نے صوفی کے آٹھ خصائل بیان کئے ہیں۔ یہ خصائل پیغمبروں سے خاص طور پر منسوب ہیں۔ حضرت ابراھیمؑ کی سخاوت ہو، حضرت اسمٰعیلؑ کی رضا، حضرت ایوبؑ کا صبر، حضرت زکریاؑ کا اشارہ، حضرت یحییٰؑ کا عزبہ (تجرد)، حضرت موسیٰؑ کا صوفہ (لباس)، حضرت عیسیٰؑ کی سیاحت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فقر۔ یعنی جس شخص نے بھی صوفی مسلک اختیار کیا ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے میں ان تمام خصوصیات کو پیدا کرے۔ تبھی وہ ایک بہترین صوفی کہلانے کا مستحق ہوگا۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر غضنفر اقبال لکھتے ہیں :

''علم تصوف ایک روحانی تحریک ہے۔ وحدت الوجود کا نظریہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ خدا واحد ہے۔ ساری کائنات خدا کی ذات ہے۔ دوسرے لفظوں میں کائنات ہی خدا ہے اور خدا ہی کائنات خدا ہی تمام عالم میں جلوہ گر ہے''

جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ اوراس کے نبیؐ کی محبت میں سرشار ہوجاتا ہےتو وہ صوفی بن جاتا ہےاور قناعت پسندی اس کی زندگی کا نصب العین ہوجاتا ہے۔حمید سہروردی کا شماردورِحاضر کے صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔وہ ایک صاحب اسلوب نثر نگار ہیں۔جن کے افسانے مضامین اردوادب میں بے مثال حیثیت رکھتے ہیں۔اردوافسانوں میں حمید سہروردی کو بلند مقام ومرتبہ حاصل ہے۔ان کی کہانیاں بے شک معاشرہ کی فلاح و بہبودی کے لئے سودمند ثابت ہوتی ہیں۔انہوں نے اپنے تجربات ومشاہدات کواپنی کہانیوں میں بیان کیا ہے۔ان کا مخصوص لب ولہجہ،اسلوب آرٹ،اورفن پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے۔ان کے مطالعہ کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ حمید سہروردی ایسے خوش نصیب افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اپنے اسلوب،آرٹ اورفن کے ساتھ ساتھ اپنے تجربے اور مشاہدے کے شاندار اظہار کی بنا پر عالمی شہرت حاصل کرلی۔جدید افسانہ نگاروں میں حمید سہروردی کے علاوہ رشید امجد، اختر یوسف، فیروز عابد،شوکت حیات، حسین الحق۔مظہرالزماں خاں،اوراکرام باگ کے افسانوں میں تصوف کے عناصر نمایاں ہیں۔علم تصوف جدید افسانے کا خاص موضوع رہا ہے۔افسانہ زندگی سے وابستہ ہوتا ہے۔کیوں کہ اس میں زندگی کا منظرنامہ بیان ہوتا ہے۔حمید سہروردی نے جدید افسانے کو نیا اسلوب اور نیا زاویہ دیا ہے۔

حمید سہروردی کی افسانوی کائنات میں چارافسانے روشن لمحوں کی سوغات،امیر بخش کون،کربلا بہت دور ہے،اور کہانی در کہانی،تصوف رنگ افسانے ہیں ان افسانوں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں تصوف کی پرچھائیاں کثیر جہتی مفاہیم میں ابھرتی ہیں۔ان کا افسانہ ''روشن لمحوں کی سوغات'' ایک ایسا افسانہ ہے جو اپنے ابتدائی جملوں ہی سے قاری کواپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے۔دیکھئے یہ افسانہ کس طرح شروع ہوتا ہے :

''دکھ پرندے کا نام نہیں۔دکھ تو کچھ اور ہی ہے۔۔۔مرشد شاہ عالم نے سر اٹھا کر دیکھا۔''

حمید سہروردی ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن کے ہاں تصوف کی پرچھائیاں زیادہ پائی جاتی ہیں کیونکہ اس افسانہ میں مرشداور مرید نثار ملک کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ مرشد کس طرح سے اندھیرے اور روشنی کے فرق کوواضح طور پراپنے مرید نثار ملک کو سمجھا رہے ہیں جواضطرابی کیفیت نثار ملک کے ہاں موجود ہے وہ دیگر مریدوں کے ہاں نہیں ہے۔اس افسانہ کے مطالعہ سے یہ بات بھی عیاں ہوجاتی ہے کہ تزکیہ نفس کے لئے مرشد ہماری زندگی کے لئے کتنی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ تزکیہ نفس کے لئے مرید بننا ضروری ہے تاکہ قرآن واحادیث کی روشنی میں زندگی بسر کرسکیں دیکھئے اس افسانہ کا اقتباس کہ کس طرح سے مرشد مرید نثار ملک کی اصلاح کرتے ہیں :

''نثار ملک اٹھتا ہے اور مرشد کے سامنے رکھا ہوا پیالہ اٹھاتا ہے اور ایک ہی
سانس میں پی لینے کی کوشش کرتا ہے۔مرشد کہتے ہیں۔۔۔''ایسا نہ کروائے
عزیز آہستہ آہستہ تین سانسوں میں پی لو' نثار ملک مرشد کی طرف دیکھتا ہے

اور پانی آہستہ آہستہ تین سانسوں میں پی لیتا ہے۔پھر گویا ہوتا ہے۔''مرشد
اندھیرے سے اندھیرے تک روشنی ہی روشنی ہے۔ یہ سچ ہے مرشد کہ
سمجھو تو بڑی چیز ہے دنیا۔''

اس اقتباس سے ہمیں اندازہ ہوجاتا ہے کہ مرشد کس طرح سے مرید کو حدیث کی روشنی میں پانی پینے کے آداب سے آگاہ کرتا ہے۔اس افسانہ کا مرشد کا کردار اخلاق آموز نصائح وتاکیدات سے معمور ہے۔اوروہ اپنے مریدوں کواحساس کمتری سے نکال کر احساس برتری کی طرف مائل کرتے ہیں۔اس سلسلہ میں عتیق اللہ لکھتے ہیں :

''حمید سہروردی کا یہ افسانہ ان کی داخلی سیاحت ہے۔ان کے باطنی اضطراب
اور روحانی بےچینی کا نقیب ہے،حمید سہروردی کے اس افسانے ہی میں نہیں
ان کے دوسرے افسانوں میں بھی فنی ایجاز کا حسن برقرار رہتا ہے۔''

یقیناً یہ افسانہ نصیحت آموز اور تزکیہ نفس کا بہترین نمونہ ہے۔جس میں مرشد نے صدق دل سے مرید کی اصلاح کا فریضہ انجام دیا ہے۔مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ افسانہ آج کے مرشدوں پر طنز ہے۔

حمید سہروردی کا اورایک افسانہ ''کربلا بہت دور ہے'' اس افسانہ کے عنوان سے ہی پتہ چلتا ہے کہ کربلائی واقعہ کواس افسانہ کا موضوع بنایا ہے۔یقیناً یہ افسانہ کربلا کے استعارہ کے حوالے سے دورِحاضر میں انسانوں پر گذرنے والی کیفیات کا بہترین موازنہ پایا جاتا ہے۔کربلا کیا ہے ایک ایسی قربانی جو دین و اسلام کی بقاء اوراس کی سربلندی وتحفظ کے لئے دی جانے والی ایک عظیم قربانی ہے جوامام حسین اوران کے رفقاء کارنے دی ہے۔اس افسانہ میں دو کردار ہیں۔ایک صاحب جی جو مالک ہیں اور ایک علی جان جوان کا ملازم ہے۔ان دونوں کی بیویاں داغ مفارقت دے چکی ہیں۔

فجر کی نماز کی ادائیگی کے بعد علی جان بےحد مسرور وشادماں نظر آنے لگتا ہے۔کیونکہ اس کے ذہن میں ایک ایسا خیال جاگزیں ہوگیا کہ اگر وہ خیال کسی فرد کو بھی آجائے تو وہ مسرور ہوگا۔اس خیال کے بعد علی جان کواپنے مالک کوخوش خبری سنانے کی بہت بےچینی محسوس ہونے لگتی ہے۔لیکن وہ وقت کی تلاش میں رہتا ہےاور بالآخر جب صاحب جی سرِشام گھر لوٹ آتے ہیں تو علی جان نے انہیں اپنے کربلا جانے کے ارادے سے واقف کروایا۔واقف کرادینے کے بعد صاحب اور علی جان میں کافی گفتگو ہوتی ہے۔علی جان کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ کربلا بہت دور ہے مگر وہ اپنے مالک صاحب جی سے اس کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا ہے کہ واقعی میں کربلا بہت دور ہے۔جب علی جان کربلا کا ذکر کرتا ہےتو صاحب جی کہتے ہیں :

''جب کربلا تمہارے احساس میں شامل ہےتو کربلا جاکر کیا کروگے! وہاں

تمہاری آنکھیں اشک بار ہو جائیں گی''

صاحب جی! آنکھیں اشک بار کیوں ہوں گی؟ ۔۔۔۔۔۔۔کربلا

تو عبرت کی جگہ ہے۔''

اس افسانہ میں حمید سہروردی نے اپنی پوری فنی مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔اس افسانہ کے مطالعہ سے کربلا کا واقعہ ہماری آنکھوں میں سماں جاتا ہے۔اس افسانہ کی گہرائی و گیرائی میں ہم ڈوب جاتے ہیں تو ہماری آنکھیں نم ہوئی بغیر رہ نہیں سکتی کیونکہ دیکھئے اس افسانہ کا ایک چھوٹا اقتباس :

''صاحب جی! میں آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گیا تھا، میری بند آنکھوں میں

سرخ رنگ ہی نظر آتا ہے۔کیا کربلا کی زمین بھی سرخ ہے؟''

اس اقتباس سے ہمیں اندازہ ہوجاتا ہے کہ حضرت امام حسینؓ اور ان کے رفقاء کار شہداء نے اپنے خون کی قربانی سے اسلام کی بقاء وتحفظ کے لئے جو کام کیا ہے وہ رہتی دنیا تک کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس افسانہ میں سرکار کے قول وفعل میں جو تضاد پایا جاتا ہے اس کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے۔دیکھئے :

''سرکار بھاشن دیتی ہے اور کیا کرتی ہے!''

''کیا وہ بھاشن ہی دیتی ہے؟''

''ہاں! وہ صرف بھاشن ہی دے سکتی ہے!''

یہ افسانہ نہایت ہی سیدھے سادھے اسلوب و انداز میں پیش کیا گیا ہے اور اس افسانہ کا مکالماتی انداز قاری کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر رہ نہیں سکتا اور اس کا اثر قاری کے دل پر گہرے نقش قائم کرتا ہے۔

''امیر بخش کون؟'' یہ افسانہ بھی تصوف پر مبنی ہے اس افسانہ کا مرکزی کردار سلطان احمد ہے۔یہ افسانہ اس بنیادی خیال کے ارد گرد گھومتا ہے کہ سلطان احمد ہڑ بڑا کر رات کے تین بجے نیند سے بیدار ہو جاتا ہے اور اس کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی مجھے پکارا ہے اور شاید مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔پھر وہ سوچنے لگتا ہے کہ میرا نام تو سلطان احمد ہے اور مجھ کو امیر بخش کے نام سے پکارا دیکھئے اس افسانہ کا اقتباس :

''رات گہری ہوتی جارہی ہے۔کیا مجھے کسی نے پکارا۔۔۔۔۔۔۔

امیر بخش! نہیں۔۔۔۔میرا نام تو سلطان احمد ہے''

بزرگ کی آواز سے سلطان احمد تذبذب کا شکار ہوتا ہے کہ آیا کیا میں امیر بخش ہوں میرا نام تو سلطان احمد ہے پھر کیونکر بزرگ مجھے امیر بخش کہہ رہے ہیں جب کہ میرا دوست صلاح الدین متقی و پرہیز گار ہے۔ اس کے سامنے تو میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ بزرگ کا امیر بخش کہنا دراصل عوام کی نمائندگی کرنا مقصود ہے کیونکہ عوام میں تبدیلی معاشرہ میں تبدیلی کا باعث ہوگی۔ بزرگ کا سلطان احمد سے یہ کہہ کر مخاطب ہونا کہ

ISSN :2582 -3612

رات آرام کے لئے سہی مگر مقصد زندگی کو فراموش کر کے یا زندگی کے مصرف سے بے خبر ہو کر آرام کرنے کے لئے نہیں ہے۔اس فسانہ میں یہ بات واضح ہو جارہی ہے کہ جو زندگی غفلت میں گذر گئی سو گذر گئی لیکن توبہ کا در تو بند نہیں ہوا۔اور عمل صالح کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے۔ یہ افسانہ یقیناً ہمیں انبیاء اکرام، صحابہ اکرام، اولیاء اکرام کی طرف توجہ مبذول کرواتا ہے کیونکہ انہوں نے رات کا ایک حصہ بھی عبادت و ریاضت ملت اسلامیہ کی فکر کے لئے مختص کیا تھا۔لہٰذا بزرگ کا امیر بخش کہہ کر سلطان احمد سے مخاطب ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان چاہے تو ناممکن کو ممکنات میں تبدیل کرسکتا ہے۔ بشرطیکہ اللہ کی ذات پر اس کا کامل یقین ہو۔دیکھئے امیر بخش سے بزرگ کس طرح مسکراتے ہوئے کہتے ہیں :

''ہر ایک کو اپنے ہونے اور نہ ہونے کے درمیان ہی خود کو تلاش کرنا ہوگا''

حمید سہروردی نے اس افسانہ میں تصوف کی پرچھائیوں کے علاوہ حالاتِ حاضرہ کی بھی بھرپور نمائندگی کی ہے دیکھئے یہ اقتباس :

''آگ اور خون کے نظارے معمول بن کر رہ گئے ہیں۔کسی پل اور کسی وقت

بھی کوئی دھماکا ہوسکتا ہے۔ بازار اور دکانیں بند ہوسکتی ہیں۔لوگوں میں

اچانک بھگدڑ مچ سکتی ہے اور نعرے ہی نعرے چاروں طرف۔۔۔۔خون،

دھول، دھوئیں اور آہ وزاری کے مناظر۔۔۔۔''

مندرجہ بالا اقتباس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حالات حاضرہ پر حمید سہروردی نے کس طرح سے طنز کیا ہے۔ دور حاضر کے حقائق کو بڑی بے باکی سے اپنے افسانہ میں سمویا ہے۔افسانہ ''کہانی در کہانی''، مستقبل میں آنے والے عذابوں کی فن کارانہ پیشن گوئی ہے۔روئے زمین پر پیغمبروں کی آمد اس بات کا ثبوت ہے کہ زمین پر بسنے والے لوگ خوشحال و اخلاقی زندگی بسر کرنے والے بنیں اللہ نے اپنی وحدانیت اور قوم کی اصلاح کے لئے انبیاء اکرام کو اس دنیا میں بھیجا اور جب لوگ نبیوں کی باتوں کے منکر ہوئے تو آسمانی قہر ان پر ٹوٹ پڑا، حمید سہروردی نے اس افسانہ کو فنکارانہ کمال اور ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ کہانی تین کرداروں کے درمیان مکالمے پر منحصر ہے۔نو وارد، نوجوان، اور گاؤں کے لوگ، مجموعی طور پر دیکھا جائے تو گاؤں والے قدامت پسندی کے پرستار ہیں اور بے راہ روی کے ترجمان اور یہ لوگ پرانے خیالات اور فرسودہ روایات پر یقین رکھتے ہیں۔ اس افسانہ کا کردار نو وارد ہر طرح سے گاؤں والوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے مگر ان کے ذہن میں روایتی خیال ہی پیوست ہے۔دیکھئے اس افسانہ کا اقتباس :

''لوگ نو وارد کی طرف دیکھنے لگے اور سبھی ایک ساتھ کہنے لگے ''کیا تم ہمیں

اس آفت سے نہیں بچاسکتے'' نو وارد نے کہا جو اپنے آپ کو نہیں بچاسکتے وہ

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

کسی کے بچانے سے کب تک بچ سکتے ہیں۔تم سب وقتی طور پر بچ سکتے ہو لیکن میں تمہاری ہمیشہ کی ذمہ داری نہیں لے سکتا بہت ممکن ہے کہ میرے یہاں سے چلے جانے کے بعد تم سب کے چہرے بدل جائیں۔میں یہاں مستقل رہنے کے لئے نہیں آیا ہوں۔میں چلا جاؤں گا۔۔۔۔۔''

اس افسانہ میں افسانہ نگار نے برگد کے درخت مندر اور درگاہ کی گمشدگی کا تذکرہ کرکے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ قومی اتحاد گم ہو چکا ہے۔اس کو علامتی طور پر بیان کیا ہے۔اور یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ گاؤں والوں نے قدامت پسندی کے دلدل میں پھنس کر اخلاقی وروحانی اقدار کو کھو بیٹھے ہیں۔آج کا انسان انتہائی مادہ پرستی اور خودغرضی میں مبتلا ہوگیا ہے۔اگر یہ خودغرضی مادہ پرستی ختم ہوگی تو ہر گاؤں میں روشنی ہی روشنی ہوگی لہٰذا مادہ پرستی خودغرضی کے غلیظ ڈھیر کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔حمید سہروردی نے اپنی سوچ وفکر کو اس افسانہ کے حوالے سے پیش کیا ہے یقیناً یہ افسانہ انسانی روح کو تروتازگی بخشتا ہے۔

Dr. Md. Samiuddin
Asst. Professor
Dept. of Urdu,
SECAB A.R.S. Inamdar Degree College for Women,
Jalnagar, Vijayapur - 586 109, Karnataka
Mob. - 93410 44679

ISSN :2582 -3612

ڈاکٹر وصی احمد شمشاد

پریم چند کے افسانوں میں فکری اور فنی پہلو پر ایک نظر

اردو کے افسانوی ادب میں پریم چند کا نام تمام افسانہ نگاروں میں اہم اور بلند درجہ کا حامل ہے۔انہوں نے افسانہ نگاری کی ابتدا ۱۹۰۷ء میں نواب رائے کے فرضی نام سے شروع کی تھی۔ان کا پہلا افسانہ ''روٹھی رانی'' رسالہ ''زمانہ'' میں تین قسطوں اپریل ،مئی اور اگست میں شائع ہوا تھا۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''سوز وطن'' ۱۹۰۸ء میں منظر عام ہوا۔اسی مجموعہ کو افسانہ نگاری کا نقطہ آغاز قرار دیا جاتا ہے۔حکومت ہند (انگریزی حکومت) نے اسے ضبط کرلیا۔اسی کے بعد انہوں نے اپنی ادبی تخلیقات پریم چند کے نام سے شائع کرانا شروع کردی۔ پہلے دھنپت رائے کے نام سے ایک افسانہ ''بے غرض محسن'' شائع ہوا پھر پریم چند کے نام سے ''بڑے گھر کی بیٹی'' شائع ہوا۔

پریم چند نے جب افسانہ لکھنا شروع کیا وہ دور سیاسی سماجی انقلاب کا دور واقع ہوا تھا۔سرمایہ داروں پر محنت کشوں کی فتح کی خبریں آرہی تھیں۔تمام عالمین میں محنت کش متحد ہو رہے تھے۔ ہندوستان میں بھی قتل عام کی تصویریں ابھر رہی تھیں۔پریم چند نے انہیں حالات سے متاثر ہوکر اپنے افسانوں کے موضوعات اخذ کئے تھے۔اس طرح وہ محنت کش ،مزدور، کسان اور پسماندہ طبقہ کی حمایت میں آواز بلند کرنے لگے۔ پریم چند نے سرکاری ملازمت ترک کردی اور پوری یک سوئی سے اس کام میں لگ گئے۔انہیں حالات اور ماحول کی عکاسی پریم چند کے افسانوں اور ناولوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

پریم چند کے افسانوں میں حقیقت نگاری کا رنگ بہت گہرا ہے۔انہوں نے جو کچھ دیکھا اسے جوں کا توں قلم بند کردیا۔وہ حقیقت بیانی کو اپنا فرض عین سمجھتے تھے۔ان کے سینے میں ایک ہمدرد انسان کا دل ہے اس لئے وہ غریب محنت کش، کسان سے ہمدردی رکھتے ہیں لیکن ظالم اور سرمایہ دار لوگوں سے بھی نفرت نہیں کرسکتے تھے۔وہ بُرے انسان کے اندر چھپی ہوئی اچھائی کو بروئے کار لانا اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ پریم چند ٹالسٹائی اور مہاتما گاندھی کے خیالات سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔وہ اصلاح انسان میں یقین رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کا ذہن بنیادی طور پر انسان دوست نظر آتا ہے۔سماجی نابرابری سے وہ بہت دل شکستہ نظر آتے ہیں۔ انہیں ذات، پات، چھوا، چھوت، امیر، غریب، میں بٹا ہوا سماج بالکل بھی پسند نہیں تھا۔ بلکہ مذہب کے اعتبار سے بھی وہ نہایت متوازن رویہ رکھتے تھے۔اس سلسلے میں سنبل نگار کے چند جملے ملاحظہ فرمائیں :

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

''فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو پریم چند بہت اہمیت دیتے تھے۔ مذہب کے سلسلے میں ان کا رویہ بہت صحت مند تھا۔ دین دھرم کو وہ انسان کا نجی معاملہ خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک زبان اور تہذیب ایک الگ چیز ہے اور مذہب ایک الگ شئے۔ مہاتما گاندھی سے وہ بہت متاثر تھے اور مہاتما گاندھی کی طرح ہی وہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو ملک وقوم کی ترقی کے لئے ایک لازمی شرط خیال کرتے تھے۔''

(اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ : مصنفہ سنبل نگار، ص۔۱۵۹۔۱۶۰)

پریم چند کی افسانہ نگاری موضوعاتی اعتبار سے بھی نہایت اعلیٰ وارفع درجہ کی حامل ہے۔ ان کے افسانوں کا کینوس کافی وسیع ہے۔ زبان وبیان کا انداز بھی نہایت موثر ہے۔ فکری اور فنی اعتبار سے موصوف کے افسانے اعلیٰ معیار قائم کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں پلاٹ سازی منظم نظر آتی ہے۔ کہانی میں کوئی خلاء بہت کم نظر آتا ہے۔ بے جا واقعات سے گریز کیا گیا ہے۔ شروع سے آخر تک واقعات میں وحدت تاثر واضح ہے۔ ان کی کہانیوں کے پلاٹ زیادہ تر بے عیب ہیں۔ منظر نگاری بھی اچھی ہے۔ افسانوں میں کہیں کہیں مکالمے بھی نظر آتے ہیں اور یہ مکالمے حقیقت کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ مکالمے کردار کی علمی صلاحیت کے اعتبار سے پیش کئے گئے ہیں جس سے کہانی کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔

پریم چند کو کردار نگاری میں بھی مہارت حاصل ہے۔ انہوں نے کئی لازوال کردار پیش کئے ہیں۔ جنہیں فراموش کرنا ناممکن ہے۔ انہوں نے کردار کی نفسیات کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔ ان کے کردار جاندار اور شاندار ہوتے ہیں۔ انہوں نے کردار نگاری کا بخوبی حق ادا کردیا ہے۔ پوس کی رات میں ''ہلکو'' کفن، کے مادھو اور گھیسو، زیور کا ڈبہّ کے ماسٹر صاحب اور ان کی بیوی ''نمک کا داروغہ'' کا بنسی دھر ایسے ہی لافانی کردار ہیں۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کے سلسلے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''پریم چند کے افسانے اپنی تکنیک کے اعتبار سے بھی اردو افسانے کے ارتقا میں ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان افسانوں میں کردار نگاری کے ارتقاء کا بڑا اچھا نمونہ ملتا ہے۔ پلاٹ اور کہانی کی ترتیب اور تنظیم ایسی ہوتی ہے کہ واقعات اچانک پیش نہیں آتے بلکہ واقعات کا سلسلہ منطقی طور پر آگے بڑھتا ہے۔ تفصیلات اور جزیات نگاری سے بھی افسانوں میں اثر انگیزی پیدا ہوتی ہے۔ پریم چند افسانے کی زبان وبیان کی سادگی وسلاست کے قائل ہیں۔ یہ بیان سادہ اور سلیس تو ہے لیکن اس کے ساتھ ہی شگفتہ اور دل آویز بھی ہے۔ ہاں کہیں کہیں ہندی اور فارسی کے الفاظ کا جوڑ بُری طرح کھٹکنے لگتا ہے۔

ISSN :2582 -3612

مکالموں میں پریم چند نے عام طور پر کرداروں کی شخصیت کے مطابق زبان استعمال کی ہے لیکن اس کے بہترین مکالمے وہ ہیں جن میں انہوں نے ہندوؤں کے مختلف طبقوں کے گھرانوں کی زبان پیش کی ہے۔''

(آج کا اردو ادب : مصنفہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ص۔۲۰۵۔۲۰۶)

پریم چند کی افسانہ نگاری اردو ادب میں نہایت قدر واحترام کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کی افسانہ نگاری اپنے دور کا آئینہ بھی ہے۔ سماج کے تمام مسائل پر انہوں نے افسانے لکھے ہیں۔ ان کا شمار ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں عورتوں کا ایک خاص مقام ہے۔ ان کی نظر عورتوں کے درپیش مسائل پر بھی نہایت باریک ہے۔ کئی افسانے عورتوں کے مسائل کی سچی تصویر کشی کرتے نظر آتے ہیں۔ اس تعلق سے پریم چند کا اپنا قول ملاحظہ فرمائیں :

''میرے ذہن میں عورت وفا اور ایثار کی مورت ہے، جو اپنی بے زبانی اور قربانی سے اپنے کو بالکل مٹا کر شوہر کی روح کا ایک جزو بن جاتی ہے۔ گو قالب مرد کا ہوتا ہے مگر جان عورت کی ہوتی ہے۔ آپ کہیں گے کہ مرد اپنے کو کیوں نہیں مٹاتا، عورت ہی سے کیوں یہ امید کرتا ہے۔ مرد میں وہ سکت ہی نہیں ہے۔ وہ اپنے کو مٹائے گا تو کچھ نہ رہ جائے گا۔ وہ کسی گپھا میں جا بیٹھے گا اور حال وقال کے خواب دیکھنے لگے گا۔ اس میں جلال کی زیادتی ہے۔ وہ اپنے گھمنڈ میں یہ سمجھ کر کہ وہ عقل کا پتلا ہے سیدھا خدا میں جذب ہونے کا تصور کیا کرتا ہے۔ عورت زمین کی طرح صبر وسکون اور برداشت والی ہے۔ مرد میں عورت کے اوصاف آجائیں تو وہ مہاتما بن جاتا ہے۔ اور عورت میں مرد کے گن آجائیں تو وہ بدکار بن جاتی ہے۔''

(پریم چند کا تنقیدی مطالعہ : قمر رئیس)

پریم چند نے اپنے افکار ونظریات کی ترسیل کے لئے مختلف پیرایہ اظہار اختیار کیا۔ افسانے، ناول، صحافت تمام ذرائع سے انہوں نے اپنے قلم کی جولانی کا ثبوت پیش کیا۔ اور صفحہ قرطاس پر بے شمار اپنے شاہکار رقم کردئے ہیں۔ وطن پرستی سے ترقی پسندی کا سفر ہمیشہ نو واردوں کے لئے مشعل راہ کا کام کرتا رہے گا۔ ان کے قائم کردہ فکری اور فنی معیار اردو ادب کو ہمیشہ سر بلندی عطا کرتے رہیں گے۔ آنے والی نسلیں ہمیشہ ان پر ناز کرتی رہیں گی۔

Dr. Wasi Ahmad Shamshad
Guest Teacher
L. N. Mithila University, Darabhanga

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ڈاکٹر جلال اصغر فریدی

اُردو ناول کا شفق

شفق کا پہلا ناول ''کانچ کا بازی گر'' ۱۹۸۲ء میں پہلی مرتبہ نکھار پبلی کیشن، مئوناتھ بھنجن یو پی سے ہوا اور دوسری مرتبہ ترمیم واضافے کے ساتھ ۲۰۱۰ء میں منظرِ عام پر آیا۔ حالانکہ رسالہ ''شب خون'' ۱۹۸۸ء میں شائع ہو چکے باقی ابواب کو شامل کرلیا جائے تو کل صفحات کی تعداد دوسو سے تجاوز کر جاتی ہے۔ بہرکیف ''کانچ کا بازی گر'' نہ صرف اردو اور شفق کا بلکہ دنیائے فکشن کا ایک نہایت ہی کامیاب ناول ہے۔ بقول مہدی جعفری :

> ''کانچ کا بازی گر'' میں میں کم سے کم دو نہیں ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی آسانی سے پہچانی جاسکتی ہیں۔ ایک دورنی تہہ جس میں مثلاً میاں اور بیوی کی آوازیں بار بار ڈوبتی اُبھرتی ہیں اور ایک عوام الناس کی خارجی تہہ جس کے درمیان تنظیم اور سیاست کا رقص آہی جاتا ہے۔ درونی تہہ میں جذباتی رشتوں کی المناک داستان صاف پہچانی جاسکتی ہے۔''
>
> (پیش لفظ۔ کانچ کا بازی گر ص ۹)

اپنی نوعیت اور ادبی اہمیت کے اعتبار سے یہ ایک شاہکار ناول ہے۔ شفق نے ناول کے بینادی رموز ونکات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان تمام مرحلوں ومنزلوں کو آسانی سے طے کیا ہے۔ منا بھوں ناول کے مرکزی کردار ہیں اور اس کے اردگرد پورا ناول رقص کرتا نظر آتا ہے کچھ معاون کردار اپنی جھلک دکھا کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ یہ ناول ایک ناسٹلجیائی کیفیت کی عمدہ مثال ہے۔ ٹوٹی بکھری یادوں اور ان کے کرب واضطراب کو جس طرح ناول نگار نے وقت اور سفر دونوں کے حسین امتزاج سے پیش کرنے کی عالمانہ و دانشوارانہ کاوش کی ہے وہ جدید اردو ناول کی تاریخ میں ایک حیرت انگیز تجربہ ہے۔ ''کانچ کا بازی گر'' اپنے گراں قدر خدمات کا اظہار کرتے ہوئے نامور ناقد اصغر علی انجینئر رقم طراز ہیں :

> ''شفق کا ناولٹ جدیدیت کے زمرے میں ہوتے ہوئے بھی نظریاتی اعتبار سے اس سے بہت مختلف ہے اس کا ہیرو شروع سے آخر تک جدو جہد کرتا ہے اور یہ جدو جہد آج کی ناقابلِ اطمینان کو بہتر صورت حال سے بدلنے کے

> لئے کرتا ہے اور ظاہر ہے اسی جوجدو جہد انتقادی شعور اور انتقادی رویّے کے ساتھ ہی کی جاسکتی ہے۔
>
> (ناول کا آخری ص ۱۸۰)

''بادل'' یہ شفق کا دوسرا ناول ہے جو پہلی مرتبہ کراؤن آفسٹ پریس، سبزی باغ پٹنہ سے شائع ہوا ۱۶۳/صفحات پر مشتمل یہ ناول بھی شفق کے کامیاب ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ناول کا انتساب ''امن کے نام'' جس کے خلاف جنگ چھیڑ دی گئی ہے۔ اس بات کی علامت ہے کہ ناول نگار کے اندر جو شعلے ابل رہے ہیں اور دنیا جو آج بارود کے ڈھیر پر کھڑی کردی گئی ہے اسے امن کی ضرورت ہے۔ ناول نگار لفظ بادل کو ایک علامت اور استعارہ کے طور پر استعمال واختیار کیا ہے۔ ناول کی ابتداء ۹/۱۱ ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پنٹا گن پر کئے گئے حملے اور اس کے بعد ہونے والے تمام واقعات وحالات کو عالمی پس منظر میں ناول نگار نے نہایت خوبصورتی اور خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کرنے کی کامیاب کاوش کی ہے۔ امریکہ نے جس طرح اس واقعہ کو بنیاد بنا کر پوری دنیا کو دہشت ووحشت کے ماحول میں جینے پر مجبور کردیا۔ تباہی وبربادی، ظلم وزیادتی کا جو قہر کئی ممالک کو نشانہ بنا کر ڈھایا وہ تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جسے کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بے قصور اور بے گناہ انسانون کا بہیمانہ قتل عام امریکہ کے دامن پر ایک ایسا داغ ہے جس کی سزا آج بھی ساری دنیا بھوگ اور اس میں سلگ رہی ہے اُسامہ اور مُلّا عمر کے بہانے امریکہ نے جو گھنونا اور ننگا کھیل کھیلا اور کئی ممالک کو کھنڈروں میں تبدیل کردیا دنیا اسے کبھی بھلا نہیں سکتی۔

''کابوس'' شفق کا تیسرا ناول ہے جو پہلی مرتبہ ۲۰۰۳ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔ ۱۳۶/صفحات پر مشتمل یہ ناول بھی شفق کی عالمانہ ودانشوارانہ صلاحیتوں کو سامنے لاتا ہیں۔ جہاں شفق نے اپنے ناول میں عالمی سیاست وسازش کو دکھایا ہے ناول ''کابوس'' میں ہندوستانی سیاست اور اس کی پس پردہ رونما ہونے والے جاذبیت، ادبیت، معنویت اور تہہ داری کے ساتھ پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اور بہت حد تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب وکامران بھی ہیں۔

ناول ''کابوس'' گجرات کے گودھرا اور یک طرفہ قتلِ عام کے پس منظر میں لکھا ہوا نہایت ہی دردناک اور دل سوز ناول ہے۔ جس سے سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جس پر یہ قہر و عذاب ڈھائے گئے ان کو اور ان کے خاندان کے افراد جو زندہ بچ گئے کن کن عذابوں سے گزرنا پڑا پوری داستان نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ۹/۱۱ کا حادثہ عالمی سیاست کا حصہ رہا وہیں گجرات کا سانحہ ہندوستانی فرقہ فرست طاقتوں کی ایک کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے آتا ہے۔ مسلمانوں کو نشانہ بنا کر اور چن چن کر قتل کیا گیا بلکہ معصوم بچوں کو نیزوں پر اُچھالا بھی گیا اور عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ اجتماعی زنا

کا ایک خوفناک منظر ساری دنیا کے سامنے آیا ان تمام مناظر کو ناول نگار نے پوری ایمانداری اور ذمّہ داری کے ساتھ اپنے ناول ''کابوس'' کا موضوع ومحور بنایا۔ سرکاری سطح پر اور حکومتِ وقت کی زیرِ نگرانی جو ننگا ناچ گجرات کی سڑکوں پر ہوا اس نے تقسیم ہند کے بعد جو فسادات کا سلسلہ شروع ہوا تھا اسے بھی فراموش کر دیا۔ ناول نگار ان تمام پہلوؤں کو پوری گہرائی وگیرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد ناول کا روپ رنگ دیا ہے۔ یہ مختصر سا مضمون شفق کے ناولوں کا ایک نہایت مختصر اور سرسری جائزہ ہے اس میں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ شفق اپنے عہد کے تمام ناول وافسانہ نگاروں میں مختلف ومنفرد تھا۔ اس کا ذہن کسی قدر بیدار اور باضمیر تھا جس نے آنے والی نسلوں کے لئے ایسی شاہکار تخلیقات رقم کیں جو پوری اردو فکشن نگاری کی تاریخ کا نہایت ہی قیمتی سرمایہ ہے۔

Dr. Jalal Asghar Faridi
"Gulistan-e-Adab"
Faridi Manzil ,Kalyani
Muzaffarpur-842 001
Mob. 74883 36042

ڈاکٹر مبارک حسین

ڈاکٹر منصور عمر دربھنگوی بحیثیت تاریخ گو

صوبہ بہار کی سرزمین فنکاروں، دانشوروں، عالموں اور شعرا وادیب کی خدمات کی بہترین مثالیں پیش کرتی ہے۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ شاعری ہو یا نثر ہر میدان میں بہار کے فنکاروں کی علمی لیاقت قارئین ادب کو مرعوب کرتی ہے اور آئندہ بھی کرتی رہے گی۔ لہٰذا میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ جس طرح شاعری کے مختلف اصناف نظم، غزل، رباعی، مرثیہ، قصیدہ، مثنوی، ہائیکو کہہ مکرنی میں ہمارے شعرا کرام نے اپنے فنی اختصاص کا ثبوت فراہم کیا ہے ٹھیک اسی طرح تاریخ گوئی کے میدان میں بھی ان کی قلمی خدمات اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ صوبہ بہار کے ادبی منظر نامے پر جس طرح مختلف تاریخ گو نے اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی وہیں ڈاکٹر منصور عمر دربھنگوی کی خدمات بھی اپنی خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ میں اپنے اس مضمون میں ڈاکٹر منصور عمر دربھنگوی کی تاریخ گوئی کے ذکر کے قبل چند باتیں قطعہ کے متعلق بھی عرض کرنا چاہتا ہوں تاکہ باذوق قارئین اور طلبا وطالبات کو اس سلسلے سے مزید معلومات فراہم ہوسکے۔ مختصر یہ کہ قطعہ کو ہیئت اور معنی کے اعتبار سے قصیدہ یا غزل مسلسل خیال کرنا چاہئے، لیکن یہ بھی توجہ طلب پہلو ہے کہ قصیدہ اور غزل میں مطلعے کا ہونا ضروری ہے اور قطعہ میں عموماً مطلع نہیں آتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے گا کہ کسی نظم کے پہلے شعر کے پہلے مصرعے سے قافیہ نہ لانے کے سبب اسے قطع کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے :

> ''وجہ تسمیہ اش انیست از مصرعہ نخستین مطلعش قافیہ منقطع شدہ والا ہم
> چوں قصیدہ مسلسل است یا غزل و باید کمتر از دو شعر نہ باشد واز رباعی ممتاز می
> شعر از یں معنی کے در اوزانِ مقررہ رباعی نہ باشد۔''

(مغزن الفوائد، الٰہ آباد، ۱۹۲۲ء، ص-۱۵۶)

میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ جس طرح دیگر شعری ونثری اصناف کے لئے شرائط مخصوص ہیں اور شاعر وادیب

حضرات اِن شرائط کو تخلیقی کاوش انجام دینے کے دوران پیش نظر رکھتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ایک تاریخ گو بھی چند شرائط کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنی قلمی کاوش کو تحریری شکل عطا کرتا ہے۔

☆ جملہ اشعار قصیدہ اور غزل کے مانند ہم وزن و ہم قافیہ ہوں۔
☆ قصیدہ غزل مسلسل یا مثنوی کی طرح ان میں معنوی ربط ہو۔
☆ کم از کم دو شعر ہوں دو سے زیادہ کے لئے کسی طرح کی پابندی نہیں ہے۔
☆ اشعار کے لئے کسی بحر یا وزن کی تخصیص نہیں ہے، لیکن رباعی کی مخصوص بحر اور اوزان سے مختلف ہونا ضروری ہے۔
☆ پہلا شعر بغیر قافیہ کا ہونا ہے، لیکن اس کی پابندی ضروری نہیں۔

اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''قطعہ بالحاظ معنی رباعی مسلسل غزل مثنوی یا قصیدہ سے مختلف نہیں ہے۔ ہیئت میں وہ قصیدہ اور غزل مسلسل سے مشابہ ہے، لیکن اس کے پہلے مصرعہ میں اکثر قافیہ نہیں ہوتا۔ قطع میں مضمون یا موضوع کی پابندی نہیں ہوتی۔ جس قسم کے خیالات اور جس قسم کے واقعات شاعر چاہے اس میں نظم کرسکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اس کے سارے اشعار معنوی حیثیت سے ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہوں۔ ہر چند کہ قطعہ صرف دو اشعار کا بھی ہوتا ہے، لیکن اردو شعرا کے دواوین میں طویل قطعات بھی کثرت سے ملتے ہیں۔''

(اردو شاعری کا فنی ارتقا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص-۴۱۲)

جب ہم عصری ادب میں تاریخ گوئی کا مطالعہ کرتے ہیں تو بیشتر شعرا کرام دو شعر کے مختصر قطعے کہنے پر خصوصی توجہ دیتے ہیں اس صنف سے متعلق یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ اس کا رواج بھی فارسی کے زیر اثر ہوا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس صنف کو قبولیت ملنی انیسویں صدی کے آخر سے شروع ہوئی۔ حالی، شبلی، اکبر، اسمٰعیل میرٹھی اور آزاد اس سلسلے سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے خصوصی طور سے اس کی طرف توجہ کی۔ اس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ ان کی ظریفانہ شاعری عموماً قطعہ ہی کی صورت میں ہے۔ اس صنف کو جن شاعروں نے ترقی کے مدارج طے کرانے میں اپنی قلمی معاونت دی ان میں احسان

ISSN :2582 -3612

دانش، ڈاکٹر منصور عمر دربھنگوی، ناوک حمزہ پوری، ڈاکٹر سید شاہ فتح اللہ قادری، سیماب اکبر آبادی، اختر انصاری دہلوی ہے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام شعرائے کرام نے فنی خصوصیات اور شاعرانہ لوازم کو پیش نظر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نگارشات انہیں انفراد عطا کرنے میں معاون و مددگار رہیں۔

ڈاکٹر منصور عمر دربھنگوی نے ۱۹۷۶ء سے شاعری کا آغاز کیا۔ آپ نے اپنے شعری سفر میں کسی استاد سے اصلاح سخن کی ضرورت محسوس نہیں کی اور اس شاہِ راہ پر خود ہی چلے اور اپنی منفرد شناخت بنانے میں کامیابی پائی۔ آپ کا ادبی سفرکئی رخ سے قابل تعریف ہے۔ خواہ ترتیب و تدوین ہو تحقیق و تنقید ہو غزل گوئی، تاریخ گوئی ہر ضمن میں آپ کا قلم قارئین ادب کو اپنا گرویدہ بناتا ہے۔ آپ کی نگارشات اس طرح ہیں۔ ''اختر اورینوی فنکار و ناقد''، ''بہار کے چند نامور شعرا''، ''مخدوم محی الدین کی شاعری کا تنقیدی جائزہ''، ''اختر انصاری حیات و خدمات''، ''سخن گسترانہ''، ''نئی دنیا نیا آدم''، ''ابابیل''، ''روائے ہنر''، ''بعد جدیدیت مضمرات و ممکنات کا جائزہ''، ''طرزی اور طرز بیان''، ''کلیات طالب گرم لہو کا سورج'' اور ''باغ خوش اسلوب'' وغیرہ۔

''باغ خوش اسلوب'' قطعات تاریخیہ کا مجموعہ ہے۔ یہ ۲۰۰۸ء میں منظر عام پر آکر داد تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اس کا مقدمہ حضرت ناوک حمزہ پوری نے تحریر کیا ہے۔ مقدمہ ملاحظہ کیجئے :

''ڈاکٹر منصور عمر اپنے گنے چنے چند لوگوں میں ہیں جنہیں میں تعلیم یافتہ سمجھتا ہوں اور ان سے امیدیں وابستہ رکھتا ہوں۔ بحیثیت ادیب و شاعر بھی ان کی مختلف الجہات وابستگی بڑی امید افزا بات ہے۔''

(باغ خوش اسلوب، ڈاکٹر منصور عمر، ص-۱۶)

مذکورہ بالا اقتباس کے حوالے سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ ڈاکٹر منصور عمر نے تاریخ گوئی کے حوالے سے بہترین کارنامے انجام دیے ہیں۔ جن کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے سے حضرت طرزی کی تصنیف ''رفتگاں و قائماں'' پر آپ کی تحریر کردہ یہ تاریخ ملاحظہ کیجئے :

چمکا ادب کا آسماں
کیا چاندنی ساون کی ہے
طرزی تری تصنیف سے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

مہکی فضا گلشن کی ہے

دربھنگہ کی یہ سرزمیں

ممنون تیرے فن کی ہے

یہ رفتگاں و قائماں

ڈاکٹر منصور عمر کی تحریر کردہ تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ آپ نے تمام ترفنی لوازم اور شرائط کو پیش نظر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تاریخ میں معنوی ربط کی خوبی دیکھنے کو ملتی ہے۔ کیوں کہ تمام اشعار معنوی حیثیت سے ایک ہی لڑی میں پروئے ہوتے ہیں۔ اس پر اضافہ یہ کہ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی آپ کا فنی اختصاص صاف عیاں نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قطعہ تاریخ کے ادبی منظر نامے پر منصور عمر کا نام بھی اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

تاریخ گوئی کے حوالے سے آپ کی تحریر کردہ یہ تاریخ دیکھئے جو ''یاسر عرفات کی وفات'' پر آپ نے کہی ہیں ؎

آفتاب جہد پیہم بھی ہوا یارب غروب

روپوش شدہ حیف چوں آں ماہ تمام

محبوب خدا شاہ امان قطب انام

اے فتح دم حزن مراگفت سروش

در خلد بریں قبلہ اہل اسلام

۱۴۰۵ھ

مختصر یہ کہ آپ نے جتنی بھی تاریخیں کہی ہیں سبھی آپ کی علمی لیاقت عمیق مطالعے اور گہرے مشاہدے کا بھرپور پتہ دیتی ہیں۔ آپ کے سلسلے سے یہ پہلو بھی اعتراف کا حامل ہے کہ آپ نے صرف اس صنف میں طبع آزمائی کی غرض سے دو چار تاریخیں کہہ کر اکتفا نہیں کیا بلکہ آپ کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ آپ نے اس صنف کی آبیاری میں اپنی قلمی معاونت دینے میں خود کو فعال رکھا۔ آپ کی تاریخ گوئی کے سلسلے سے چند قطع تاریخ ملاحظہ کیجئے۔

حضرت قتیل داناپوری کی وفات پر انہوں نے یہ تاریخ رقم کی ہے ؎

تھے اہل دل قتیل داناپوری

فن میں کامل قتیل داناپوری

اے فتح دم وداع ہاتف نے کہا

مرگ فاضل قتیل داناپوری

۱۹۸۵ء

مولانا ابوالحسن ندوی کے متعلق کیا خوب کہا ہے ؎

صد حیف کہ رہبر

شریعت رفتہ

از اوج فلک ماہ طریقت رفتہ

مولانا ابوالحسن علی ندوی آہ

آں رونق دعوت و عزیمت رفتہ

۱۴۲۰ھ

حضرت شاہ فرید الحق کی وفات پر اس طرح تاریخ کہی ہے ملاحظہ کیجئے ؎

ہے ایک نہ اک روز سبھی کو مرنا

ہوتی ہے بزرگوں کی مگر موت جدا

جب شاہ فرید حق نے لی راہ عدم

ملہم نے کہا ''رحلتِ مقبول خدا''

۱۴۲۱ھ

مذکورہ بالا تمام تاریخیں منصور عمر کی فنی گرفت کا پتہ دیتی ہیں۔ لہٰذا آپ نے تمام تر شعری لوازم کو پیش نظر رکھا ہے۔ آپ کی تاریخ کا مجموعہ ''باغ خوش اسلوب'' اس کی بہترین مثال پیش کرتا ہے۔ میں اپنی بات ناوک حمزہ پوری کے اس قول پر ختم کرنا چاہوں گا۔ کیوں کہ ناوک حمزہ پوری نے تاریخ گوئی کے سلسلے سے جن فنی معیار کا ذکر کیا ہے اس پر منصور عمر کی تاریخیں کھری اترتی ہیں۔ ناوک حمزہ پوری کا یہ قول ملاحظہ کیجئے:

''یہ سمجھنا ضروری ہے کہ چوں کہ یہ صنف بھی یعنی تاریخ گوئی بھی ایک

صنف شعری ہے اس لئے ہر تاریخ گو شاعر کو سب سے پہلے یہ خیال لازمی ہے کہ اس کے فرمودات شعریت سے خالی نہ ہوں۔''

(باغ خوش اسلوب، ڈاکٹر منصور عمر، ص-۱۷)

Dr. Mobarak Hussain
Asstt. Professro
Deptt. of Urdu
Urdu College
Gopalganj (Bihar)
Mob. - 9199680504

ڈاکٹر ذاکر حسین (ذکی ہاشمی)

اردو ادب میں نثر کی روایت

نثر لفظی اظہار کا وہ بنیادی اسلوب ہے جو خیال وخبر کی راست ترسیل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور جس کی مدد سے کسی زبان کی مخصوص لسانی ساخت اور نحوی ترکیب کو طے کیا جاتا ہے۔اس کی دو شکلیں سب سے زیادہ مشہور ہیں نثر اور شعر۔

اب جہاں تک شعر اور نثر کا تعلق ہے تو ان کا دائرۂ کار واضح طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ نثر اور شاعری کا کوئی بھی لسانیاتی تجزیہ خواہ کتنی ہی باریک بینی سے کیا جائے ان دونوں کو متحد نہیں کیا جاسکتا اور سچ پوچھیے تو ان کو ملانے کی کوئی کوشش ادبی نقطۂ نظر سے مستحسن نہیں ہے اور نہ معتبر ہی۔

نثر کے معنی بکھرنے، پاش پاش ہونے، پراگندہ ہونے اور تتر بتر ہونے کے ہیں۔اس کا مفہوم یہ نہیں کہ نثر میں جو خیالات پیش کیے جاتے ہیں ان میں بکھراؤ یا بے ربطی ہوتی ہے بلکہ نثر کے یہ معانی نظم کے مقابلے میں جس کے معنی ربط وتسلسل اور موتی پرونے کے ہیں۔نظم میں الفاظ بحر واوزان کی وجہ سے ایک لڑی میں پروئے جاتے ہیں اور ان میں بحر کی بدولت ایک خاص نوع کا ربط پیدا ہوجاتا ہے۔نثر بحر واوزان سے عاری ہوتی ہے اس لیے نثر کا مفہوم بحر واوزان سے عاری ہونے کی خصوصیت کو نمایاں کرنے کے لیے بکھرنا، پاش پاش ہونا قرار دیا گیا ہے۔

نثر کا ایک رنگ نہیں ہے وہ ایک کثیر المقاصد پیرایۂ اظہار ہے جس کی بنا پر وہ گوناگوں مقاصد کے اظہار کے لیے موزوں اسلوبی خصوصیات اختیار کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔نثر مزاجی طور پر اس سفید رنگ کی طرح ہے جس میں سارے رنگ شامل ہیں اور جس پر سارے رنگ چڑھ جاتے ہیں :

استعمال کے لحاظ سے نثر کی چار قسمیں کی جاسکتی ہیں۔کلامی نثر، بیانیہ نثر، استدلالی نثر اور ادبی نثر۔ان اقسام نثر کی مختصر وضاحت بھی یہیں پر ضروری ہے۔

کلامی نثر : یہ ایسی نثر ہے جو راست اور غیر آراستہ انداز میں کوئی خبر پہنچائے یا کسی ضرورت کا اظہار کرے۔یہ اظہار کی بنیادی افادیت رکھتی ہے۔اسی لیے کلامی نثر کو بول چال کی نثر کہا گیا ہے۔اس نثر کا دائرہ بے حد وسیع ہے کیونکہ اس میں کاروباری فقروں، گھریلو خانہ داری کی زبان اور بچوں کی زبانیں سب کچھ شامل ہے۔

بیانیہ نثر : بیانیہ نثر سے مراد وہ اسلوب ہے جس میں نثر نگار کسی واقعہ یا واردات کو من وعن رقم کر دیتا ہے۔اس کے پیشِ نظر واقعہ کی صداقت اور موضوع کی اہمیت ہوتی ہے جس کا احساس وہ قاری کو دلانا چاہتا ہے۔اس اسلوب میں سلاست کے ساتھ ساتھ نثری شگفتگی اور روانی کا لحاظ بھی رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

استدلالی نثر: یہ اپنے مواد اور اسلوب کے لحاظ سے کلامی نثر یا بیانیہ نثر سے زیادہ خصوصی ذہنی صلاحیتوں کی پیداوار ہے۔ یہ نثر عقلی، استدلالی، منطقی ترتیب اور عملی معروضیت سے اپنا اعتبار حاصل کرتی ہے۔اسے مذہب وفلسفہ، سائنس وتنقید وغیرہ پر زیرِ بحث کے لیے خاص طور پر اپنایا گیا ہے۔

ادبی نثر : اس نثر کی بنیاد خیال پر رکھی گئی ہے جس کا مقصد لطف انشا بھی ہے۔ کیونکہ یہ نثر کے پیرائے کو فنی اور تحلیلی انداز سے استعمال کرنے کی کوشش کو ظاہر کرتی ہے۔اس قسم کی نثر میں نثر نگار مواد اور اسلوب دونوں پر اپنی فنی صلاحیتوں کے استعمال پر قدرت رکھتا ہے اور تخلیقی جوہر کے عمل سے موضوعات کی پیش کش میں فنی پہلوداری اور تاثیر پیدا کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر شہناز انجم :

''نثر کی یہ اہم مخصوص اور اعلیٰ قسم ہے۔جس کا تعلق براہ راست ادب سے ہے اور ادب چونکہ زندگی کا ترجمان ہوتا ہے اس لیے اس میں ادبی زبان کی بہت سی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔جس کی وجہ سے یہ عام طور پر اعلیٰ خیالات کی حامل ہوتی ہے۔''

(اردو نثر کا ارتقا)

دارصل ادبی نثر دو حصوں پر مشتمل ہے۔ایک خالص ادبی نثر جس کو ہم سادہ ادبی نثر بھی کہہ سکتے ہیں اور دوسری تخلیقی ادبی نثر ہے۔یہیں پر ان کی مختصر وضاحت ضروری ہے۔

سادہ ادبی نثر (خالص ادبی نثر) : سادہ ادبی نثر میں تحقیق، تنقید اور تجزیہ کی زبان شامل ہے اس لیے ضروری ہے کہ وہ رنگینی بیان، جذباتی اظہار اور حسن آفرینی سے مبرا ہو۔مگر لفظوں کا اچھا استعمال، جملوں کی صحیح ترتیب، زبان کا فطری لوچ اور آہنگ ہونا ضروری ہے۔

تخلیقی ادبی نثر : جس میں افسانہ، ناول، انشائیہ اور اسی نوع کی دوسری اصناف نثر شامل ہیں۔اس میں ان تمام تخلیقات کی نثر شامل ہوگی جن کا تعلق فن وادب مثلاً ادب لطیف، ہم آہنگ نثر یا شاعرانہ نثر وغیرہ سے ہے۔

زمانہ جوں جوں بدلتا جا رہا ہے انسانی خیالات بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور اسی طرح زبان

میں بھی ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔کسی زبان کی ترقی میں دو عوامل کا بڑا ہاتھ ہے۔اول علاقہ اور دوز مانہ۔اس لحاظ سے یہ بات ضروری ہے کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اردو زبان نے جس طرح ترقی کے منازل طے کئے ان پر ایک نظر ڈالی جائے۔

اردو نثر کی ابتدا بارھویں صدی سے ہوتی ہے۔ پندرھویں صدی میں اسے ادبی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے اور سترھویں صدی میں آکر ارض دکن، شمالی ہند اور صوبۂ بہار میں چھا جاتی ہے۔اس سلسلے میں شیخ عین الدین گنج العلم، حضرت گیسودراز، ملا وجہی، فضلی اور عطا حسین تحسین کے نثری کارنامے فراموش نہیں کیے جا سکتے جنھوں نے اسے ادبی حیثیت عطا کی۔ان نثر نگاروں کا مقصد مذہبی مسائل بیان کرنا، تصوف کے رموز ونکات پیش کرنا یا محض عشقیہ قصے بیان کرنا ہے۔ایسی تصانیف فارسی کتب کے ترجمے ہیں، عبارت دقیق اور مقفیٰ و مسجع ہیں۔ابتدائی دور کا نثری نمونہ ملاحظہ ہو :

''نبی علیہ السلام کہے، انسان کو پوجنے کو پانچ تن، ہر ایک تن کو پانچ دروازے، ہور پانچ دربان......''

(معراج العاشقین)

انیسویں صدی کی ابتدا میں فورٹ ولیم کالج اردو ادب کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے جس کے زیر سایے جدید اردو نثر کی بنیاد پڑی۔فورٹ ولیم کالج کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر جان گل کرائسٹ نے ملک کے گوشے گوشے سے مایہ ناز اردو ادیبوں اور انشاء پردازوں کو جمع کیا اور ان سے پرانی کتابوں کا عام فہم سادہ اور بول چال کی زبان میں ترجمہ کرانے کا کام شروع کیا۔تقریباً اٹھارہ مصنفین ومترجمین سے غالباً پچاس کتابیں لکھوائیں جو نہ صرف مقبول ہوئیں بلکہ اردو نثر کو ترقی کی شاہ راہ پر کھڑی کر دیں۔ان میں چند کتابیں بہت اہم ہیں جیسے ''باغ و بہار'' (میر امن دہلوی)۔آرائش محفل (حیدر بخش حیدری) تذکرہ گلشن ہند (مرزا علی لطف) باغ اردو (میر شیر علی افسوس)۔اخلاق ہندی (میر بہادر علی حسینی)۔مذہب عشق (نہال چند لاہوری)۔سکنتلا ناٹک (مرزا کاظم علی جواں)۔سنگھاسن بتی (للو لال جی) وغیرہ۔

فورٹ ولیم کالج کے زیر سایے لکھی گئی ان کتابوں میں جو شہرت ومقبولیت باغ و بہار کو ملی وہ کسی کو حاصل نہیں ہو سکی جسے اردو کی زندہ نثر کی پہلی کتاب تسلیم کی جاتی ہے اور اسے فورٹ ولیم کالج کا گراں قدر تحفہ سمجھا جاتا ہے۔جس کے لیے میر امن دہلوی کو پانچ سو روپے کا انعام بھی ملا تھا۔میر امن دہلوی کے باب میں نور الحسن نقوی لکھتے ہیں :

''جس زبان میں تصنع اور بناوٹ کا دور دوراور لفاظی وعبارت آرائی کا بول بالا تھا، جس میں مقفیٰ و مسجع کا دستور تھا میر امن نے اس زبان میں باغ و بہار لکھ کر سادگی، ، صفائی اور سہل نگاری کا راستہ دکھایا۔''

(تاریخ ادب اردو)

فورٹ ولیم کالج کے بعد دلی کالج سب سے بڑا ادارہ تھا جس میں ادبی کام بڑے پیمانے پر اور بڑی ترتیب کے ساتھ کیا گیا۔ دلّی کالج کے ذہین طلبا میں مولوی ذکاءاللہ، محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد جیسے نثر نگاروں نے اس کا راستہ ہموار کیا۔

اردو نثر نگاری کی روایت میں مرزا غالب کی نثر کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے نثری سرمایے میں خطوط کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں جو مراسلہ کم، مکالمہ زیادہ نظر آتا ہے۔ باغ و بہار کے زیر اثر رجب علی بیگ سرور کی کتاب فسانۂ عجائب کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جس کی بدولت اردو نثر نگاری کا وقار بلند نظر آتا ہے اور جو کسر باقی تھی اسے سرسید احمد خاں نے پوری کردی۔

سیر سید احمد خاں نے علمی اور فطری مواد کے ذریعہ اردو نثر کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کردیا اور رسالۂ ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعے گھر گھر پہنچادیا جس میں ان کے رفقاء کی کرم فرمائی بھی شامل رہی۔ لہٰذا محسن الملک، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی اور مولوی چراغ علی نے اپنے تئیں بیش بہا خدمات انجام دیں۔

الغرض معاصرین سرسید کے بعد بھی نثر نگاری کا فن ارتقا پذیر رہا۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مہدی افادی، علامہ اقبال اور شہباز بھاگلپوری کے ذریعہ فکر و شعور کی نادیدہ راہیں بھی ہموار ہوئیں۔ ساتھ ہی ساتھ سادگی، سلاست، روانی، شگفتگی، شوخی، ظرافت اور محاوراتی زبان سے اردو نثر کا دامن مزین ہوگیا۔

المختصر فورٹ ولیم کالج کے زیر قیادت اردو نثر کی جو روایت پھیلی اور غالب کے ہاتھوں جسے فن کی بلندی ملی اسے سرسید اور ان کے رفقا نے اس قدر سنوارا اور نکھارا کہ بعد کے نثر نگاروں کو اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کا خوشگوار موقع ملا اور اردو نثر نگاری کی روایت جو قائم ہوئی وہ آج تک قائم ودائم ہے۔

Dr. Zakir Hussain (Zaki Hashmi)
Urdu College
Gopalganj (Bihar)
Mob. - 9934479225

ISSN :2582 -3612

بدر محمدی

ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی کا نظریۂ تحقیق

''تحقیق اور تحقیقی مقالہ'' ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کے مجموعہ ''خیمۂ احباب سے آگے'' (سن اشاعت 2016) کا پہلا مضمون ہے۔ اس موضوع پر ان کی کوئی مکمل کتاب نہیں۔ البتہ تحقیق سے متعلق اردو ادب میں بہت سی کتابیں ہیں مثلاً رہبر تحقیق (شبیہہ الحسن)، تحقیق و تدوین (محمد ہاشم)، تحقیق کے طریقہ کار (ش اختر)، عمادالتحقیق (کلب عابد) مبادیات تحقیق (عبدالرزاق قریشی)، ادبی اور لسانی تحقیق (پروفیسر عبدالستار دلوی)، ادبی تحقیق۔ مسائل اور تجزیہ (رشید حسن خاں)، اصول تحقیق و تدوین متن (تنویر احمد علوی)۔ ممکن ہے آفاق عالم صدیقی نے ان کتابوں سے استفادہ کیا ہو مگر، مضمون کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مضمون نگار نے اپنا نظریہ اور تجربہ بھی پیش کیا ہے۔ یہ ان کا پر مغز، معلوماتی اور کارآمد مضمون ہے۔ شاید اسی لئے انہوں نے اسے پہلے نمبر پر جگہ دی ہے۔ مذکورہ بالا کتاب میں آفاق عالم صدیقی کے اور بھی مضامین ہیں جن کا رشتہ تحقیق سے ہے۔ تحقیقی مضامین ان کی دوسری کتاب ''شنیدہ کے بود مانند دیدہ'' (سن اشاعت 2017) میں بھی شامل ہیں۔ اول الذکر کتاب کا سرنامہ آفاق عالم صدیقی نے شعر سے اخذ کیا ہے اور یہ شعر ان کا نہیں دوسرے کا ہے اور اسے انہوں نے اس کتاب میں نہیں دوسری کتاب میں درج کیا ہے۔ جو کتاب اس کتاب کے بعد شائع ہوئی ہے۔ پریم کمار نظر کے شعری مجموعہ ''لوح جہاں'' پر تبصرہ کرتے ہوئے صدیقی نے ''شنیدہ کے بود مانند دیدہ'' میں متعلقہ شعر کو یوں نقل کیا ہے ؎

اے تشنہ لبی خیمۂ احباب سے آگے
پانی جو میسر تھا وہ کثرت میں نہیں تھا

آفاق عالم صدیقی شاعر و نقاد ہیں اس لئے تحقیقی وتنقیدی مضامین پر مشتمل مجموعے کا شاعرانہ عنوان قائم کیا ہے۔ وہ تخلیق، تنقید اور تحقیق تینوں کے مرد میداں ہیں۔ آفاق عالم صدیقی کا زیر بحث مضمون بنیادی طور پر تحقیق کے مرحلے سے متعلق ہے مگر اس میں تحقیقی مقالہ جوڑ کر اسے نیا موڑ دے دیا ہے۔ عنوان میں جاذبیت پیدا کی ہے۔ چنانچہ مضمون ''تحقیق اور تحقیقی مقالہ'' نہ صرف تحقیق کی تعریف، اس کی قسمیں، خصوصیات، محقق کی خوبیاں تک محدود ہے بلکہ اس کا پھیلاؤ تحقیقی مقالے کی نوعیت، خاصیت اور اہمیت تک ہے اور دونوں کا حصہ برابر کا ہے۔ یعنی نصف حصے میں تحقیق سے متعلق نکات کو زیر نگاہ رکھا گیا ہے تو بقیہ نصف

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

حصے میں تحقیقی مقالے پر مرحلہ وار گفتگو کی گئی ہے۔ دونوں پہلوؤں پر الگ الگ ذکر کیا گیا ہے مگر دونوں حصے میں ایسی ہم آہنگی ہے کہ یہ دولخت نظر نہیں آتا بلکہ پورا مضمون ایک ہی سلسلے کی کڑی جیسا ہے۔ دراصل یہ مضمون تحقیق کی اہمیت بتانے کے لئے لکھا گیا ہے اور اسے اولیت دی گئی ہے کہ بقول آفاق عالم صدیقی تحقیق ہی تخلیق اور تنقید کو بصیرت و بصارت فراہم کراتی ہے، تب کہیں جا کر وہ اپنا وجود ثابت کرتی ہے۔

مضمون کا آغاز تمہیدی بیان سے کیا گیا ہے پھر تحقیق کا تعارف و تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ تحقیق کا لغوی معنی بتایا گیا ہے اور اس کا رشتہ عربی زبان سے استوار کیا گیا ہے۔ یہ جانکاری بھی دی گئی ہے کہ تحقیق کو انگریزی میں ریسرچ اور ہندی میں شودھ یا انوسندھان کہا جاتا ہے۔ تحقیق کی تعریف مضمون نگار نے خود کم کی ہے اور قاضی عبدالودود، گیان چند جین اور مالک رام کے اقوال سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔ منقول عبارتوں سے تحقیق کے متعلق جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ تحقیق گمشدہ سرمائے کی تلاش ہے۔ تحقیق کسی امر کو اس کی اصل شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔ تحقیق کھرے کھوٹے کی چھان بین ہے۔ تحقیق، تصدیق کا عمل ہے۔ تحقیق فن پارے کی تشریح، تعبیر اور تفہیم کا کام ہے۔ تحقیق کو متنی تنقید بھی کہتے ہیں۔ تحقیق وتنقید دونوں فلسفے کی شاخ ہے۔ تخلیق، تنقید اور تحقیق، ایک ہی کل کے اجزا ہیں اور تینوں میں آفاق عالم صدیقی نے فرق یہ بتایا ہے کہ تخلیق تولید کے ضمن میں آتی ہے تو تنقید قاضی صفت ہوتی ہے اور تحقیق قلندرانہ صفت سے متصف۔ تخلیق خامیوں کے باوجود مقبول ہوتی ہے اور تنقید مشروط وفاداری کی شکار ہو کر کئی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ تحقیق رکاوٹوں کو پار کر کے آگے نکل جاتی ہے۔

آفاق عالم صدیقی نے تحقیق کی قسمیں، تحقیق کی خصوصیات اور محقق کی صفات کو بھی واضح کیا ہے۔ مضمون نگار نے تحقیق کی قسم کے سلسلے میں زیادہ گفتگو نہیں کی ہے۔ بس اتنا لکھا ہے کہ اس کی دو قسمیں ہیں اطلاقی تحقیق اور نظریاتی تحقیق۔ البتہ یہ لکھا ہے کہ ادب میں صرف نظریاتی تحقیق پر بات ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا اطلاق تاریخی اور تجزیاتی تحقیق پر ہوتا ہے۔ اس لئے صدیقی نے تحقیق کی دیگر اقسام کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ورنہ تحقیق کی اور بھی قسمیں ہیں مثلاً دستاویزی یا تاریخی تحقیق، وضاحتی تحقیق، مطالعۂ احوال وغیرہ۔ آفاق عالم صدیقی نے تحقیق کی خصوصیات یہ بتائی ہیں کہ وہ قیاس آرائی، تصور کی رنگا رنگی، تخیل کی پرواز، علامت نگاری، استعارہ سازی، مزاح نگاری، لفاظی اور انشا پردازی سے پاک ہو۔ خاصیت کو ہی تحقیق کا مقصد بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ گتھیوں کو سلجھانا اور خامیوں کو دور کر کے حقیقت سے روشناس کرانا تنقید کا نصب العین ہے۔ غرض کہ تحقیق کا تعلق حقیقت سے ہے۔ اس حقیقت سے جو صرف اور صرف حقیقت ہو شکوک وشبہات سے اس کا کوئی علاقہ نہ ہو۔

کارِ تحقیق چونکہ مشکل ہے۔ یہ معرکہ سر کرنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ اس لئے آفاق عالم

صدیقی نے محقق کی صفات پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ اسے عیوب سے پاک، حرص سے دور اور صفات سے متصف ہونا چاہئے۔ محقق کو جن عیوب سے پاک ہونے کی بات کہی ہے وہ ہیں تعصب، خود پسندی، ضد، ہٹ دھرمی، اندھی عقیدت اور بے جا نفرت۔ جن چیزوں کی مرض سے دوری بنانے کی ہدایت دی ہے وہ ہے عجلت پسندی، سیمابیت، چاپلوسی، خوشامد۔ جن صفات سے متصف ہونے پر زور دیا وہ ہیں بردباری، انکساری، حلم، بلند اخلاقی، وسیع النظری، اعلیٰ ظرفی اور صبر وتحمل۔ پھر یہ بھی لکھا ہے کہ ہر چیز کو عقیدت اور مرعوبیت کی نظر سے دیکھنے کے باعث ضعیف الاعتقاد خود غرض لوگ اچھے محقق نہیں ہو سکتے۔ آفاق عالم صدیقی نے مزید لکھا ہے کہ علم کے حصول کی لگن، نامعلوم کو معلوم کرنے کی تڑپ اور ادبی علوم کی مبادیات سے واقفیت، محقق بننے کے لئے ضروری ہے۔ ادب کے ساتھ ساتھ مذہب، ثقافت، اخلاق، تاریخ، نفسیات، سماج، مصوری، موسیقی، نجوم کا علم بھی ایک اچھے محقق کے لئے لازمی ہے۔ غرض کہ محقق ایسا ہو کہ اس سے تحقیق اور ادب کا بھلا ہو۔

''تحقیق اور تحقیقی مقالہ'' کے دوسرے حصے میں آفاق عالم صدیقی نے اولاً تحقیقی مقالے کو define کرنے کی کوشش کی ہے مگر بس اتنا لکھا ہے کہ تحقیقی مقالہ عام مقالے اور مضمون سے مختلف ہوتا ہے۔ البتہ گیان چند جین کے حوالے سے تحقیقی مقالے کی تعریف یہ پیش کی ہے کہ جس تحریر میں زیرِ تحقیق موضوع کے متعلق جملہ مواد کو پیش کیا جاتا ہے، پرکھا جاتا ہے اور اس کے بعد مناسب نتائج اخذ کئے جاتے ہیں، اس تحریر کو تحقیقی مقالہ کہتے ہیں۔ طوالت کی بنیاد پر صدیقی نے تحقیقی مقالے کی دو قسم بتائی ہے، طویل مقالہ اور مختصر مقالہ۔ ضمنی طور پر سندی اور غیر سندی تحقیقی مقالے کی بات بھی کی ہے۔ پھر تحقیقی مقالے کے بنیادی عناصر کی نشاندہی اور تفصیل پیش کی ہے۔

آفاق عالم صدیقی نے تحقیقی مقالے کے سات جزیات مقرر کئے ہیں۔ پہلے عنصر کے طور پر موضوع سے متعلق تفصیل پیش کی ہے۔ موضوع بنیاد کی اینٹ کی طرح ہے۔ آفاق عالم صدیقی نے موضوع کے سلسلے میں بتایا ہے کہ پہلے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ تحقیقی مقالے کا موضوع کیا ہونا چاہئے اور کیسا ہونا چاہئے۔ یعنی کس قسم کے موضوع کا انتخاب کیا جانا احسن ہے اور کس قسم سے کنارہ کش رہنا چاہئے۔ انتخاب ایسے موضوع کا اچھا ہے کہ جس سے علم میں اضافہ ہو اور ادب کا کوئی دھندلا یا گم کردہ گوشہ روشن ہو۔ ساتھ ہی اس موضوع پر مواد کی فراہمی ممکن ہو۔ دوسری جانب ان موضوعات سے بچنا چاہئے جن پر پہلے کام ہو چکا ہے۔ طویل، وسیع اور عمومی موضوعات سے گریز ضروری ہے یا پھر جس پر مواد کی فراہمی نہ ہو اس سے کنارہ کشی بہتر ہے۔ ایسے میں بالکل نئے موضوعات کا انتخاب اور ان پر مواد کی فراہمی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ خود کو خطرے میں ڈالنا ہے۔

تحقیقی مقالے کا دوسرا عنصر ہے خاکہ۔ اسی سے کام کی ہیئت اور نوعیت قائم ہوتی ہے اور کام کے آغاز میں ایک خاص نظم وضبط کا عمل دخل ہوتا ہے۔ خاکہ سے تحقیقی کام کو منظّم انداز حاصل ہوتا ہے۔ خاکہ سے ہی تحقیق کے مطمح نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔ خاکہ سے تاریک گوشوں پر روشنی پڑتی ہے اور دھند دور ہوتی ہے۔ خاکہ یا Synopsis تحقیق اور تسوید کے درمیان کی چیز ہے۔ منزل مقصود کا خاکہ واضح ہونے سے غلط روی نہیں ہوتی۔ خاکہ کے تعین کے لئے خود پر اعتماد کرنا چاہئے اور ضرورتاً استاد کی مدد لینی چاہئے۔ تحقیق کی مزید وضاحت کے لئے آفاق عالم صدیقی نے عندلیب شادانی کے بیان سے بھی استفادہ کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ خاکہ کی تعمیر وتشکیل کا انحصار محقق کی صوابدید اور موضوع پر ہے کہ وہ کس طرح کا خاکہ بناتا ہے اور کام کا آغاز کرتا ہے۔

تیسرا مرحلہ ہے مواد کی فراہمی کا معاملہ۔ مواد کی روشنی میں ہی نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ مواد کی فراہمی کا تعلق عملی اقدام سے ہے اس لئے یہ ایک مشکل کام ہے۔ موضوع سے متعلق محفوظ یا بکھرے مواد کو یکجا کرنا دشوار کن عمل ہے۔ اس کے لئے محنت ومشقت درکار ہے۔ مواد یا ماخذ کی کئی صورتیں ہیں مثلاً بنیادی، ضمنی، ذیلی اور اضافی۔ بنیادی ماخذ تحقیق کی عمارت کی بنیاد ہے۔ آفاق عالم صدیقی نے مواد کی فراہمی کا اجمالی خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ مواد جن چیزوں سے حاصل ہوتا ہے وہ ہیں، مطبوعہ، غیر مطبوعہ کتابیں، اخبارات ورسائل، خطوط، تاریخی دستاویز، شجرۂ نسب وغیرہ۔ دوسرے کاغذات میں ٹیپ شدہ مباحثے، ریڈیو نشریات، ٹی وی، فلم، مائکروفلم، کتبہ، دیوار، پتھر، سکّہ، مٹی، دھات پر کندہ یا پھرا ابھرے نقوش یا تحریرات، مواد کے ذرائع ہیں۔ ملاقات اور مراسلت سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ نجی اور عوامی لائبریری سے بھی کام لیا جاسکتا ہے، مواد کی فراہمی میں وقت کے اہم محققین سے رابطہ ضروری ہے۔ قدیم موضوع کے لئے تذکروں اور مخطوطوں سے اور نئے موضوع کے لئے ہم عصر ادیبوں سے قربت لازمی ہے۔ موضوع سے متعلقہ شہر کا سفر بھی ضروری ہے۔ مواد کی فراہمی کے سلسلے میں جوش وجذبہ درکار ہے اور تیز رفتاری بھی۔

مواد کی فراہمی کے بعد اس کے مطالعہ، نوٹس اور اقتباسات کا مرحلہ آتا ہے۔ اس کے لئے اطمینان اور دل جمعی چاہئے۔ موضوع سے متعلق کتابوں کے مطالعہ میں مدت کی حد کا خیال کرنا چاہئے۔ نوٹس کے سلسلے میں لفظ بہ لفظ نہیں بلکہ کام کی چیز اخذ کرنی چاہئے۔ عجلت اور اختصار سے بچنا چاہئے۔ نوٹس مفصل ہو اور لکھاوٹ ایسی ہو کہ بعد میں یہ کام کا رہے۔ اس سے پورا فائدہ اٹھایا جاسکے۔ مقالہ لکھتے وقت اقتباس کی صحت کا بھی پورا خیال کرنا ضروری ہے۔ پانچواں مرحلہ مواد کی پرکھ کا ہے۔ جمع شدہ مواد کی پرکھ اور جانچ لازمی ہے تاکہ کسی غلطی کا گذر نہ ہو۔ مواد کی جانچ پرکھ کا مرحلہ مقالے کی تسوید سے بالکل پہلے کا کام ہے۔ یہ جانچ پرکھ، تحقیق کے نصب العین سے میل کھانا چاہئے۔ مواد کی جانچ پرکھ کا کام دقت نظر اور ذمہ داری کے احساس کے ساتھ کیا جانا چاہئے۔ تائید سے قبل ہر ممکن تحقیق سے گذرنا چاہئے۔

تحقیقی مقالے کی آخری منزل اس کی تسوید ہے۔ یہ وہ کام ہے جس میں محقق کے لاشعور میں تیار ہیولیٰ کو کاغذ پر اتارا جاتا ہے۔ صفحۂ قرطاس پر مواد کو منتقل کرنے کا کام بہ حسن وخوبی انجام پذیر ہونے کے اقدام کرنے چاہئے۔ پچھلے تمام مرحلے اس طرح کے ہوں کہ یہ مرحلہ بہ آسانی طے ہوجائے۔ اس دوران ہر ایک نکتے کی وضاحت ضروری ہے۔ آفاق عالم صدیقی نے مقالے کی تسوید کے چھ مرحلوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ مرحلے ہیں، تمہید، نفس موضوع، اس کی وسعت یا پھیلاؤ، ترتیب وپیش کش، خاتمہ اور حوالا جات۔

تحقیقی مقالہ لکھ دینے سے ہی بات ختم نہیں ہوجاتی بلکہ اس پر نظر ثانی بھی ضروری ہے۔ تاکہ کمزوریاں، کوتاہیاں دور ہوں اور سلاست وروانی در آئے۔ حشو وزوائد سے گریز بھی لازمی ہے۔ جملوں کے ربط، املوں کی صحت اور رموز واوقاف کا خیال کیا جانا چاہئے۔ حواشی کا اندراج بھی ضروری ہے۔ یہ اظہار تشکر بھی ہے اور دوسروں کے لئے مشعل راہ بھی۔ مقالے کی تسوید میں اس کے اسلوب اور زبان وبیان پر توجہ بھی ضروری ہے۔ تحقیق کی زبان کے سلسلے میں صدیقی نے ایک جملے میں بات ختم کردی ہے کہ تحقیق کی زبان کو نہایت سادہ، دوٹوک اور ٹھوس ہونا چاہئے۔ تحقیقی مقالے کا اسلوب ایسا ہونا چاہئے کہ اس میں مصنف کا چہرہ واضح طور پر دکھائی دے۔ آفاق عالم صدیقی نے مضمون کے آخری حصے میں تلخیص کے طور پر یہ لکھا ہے کہ تحقیقی مقالہ جبراً لکھے جانے کی چیز نہیں بلکہ وفور شوق میں جنم لینے والی تحریر ہے۔ مقالے کو دولخت یا لخت لخت نہیں بلکہ مربوط ہونا چاہئے۔ مقالے کا انداز وبیان معذرت خواہانہ نہیں ہو بلکہ اس کی ہر بات میں قطعیت ہو۔ اس سے دیانت داری اور جانب داری جھلکتی ہو۔

مرحلہ وار مطالعے سے آفاق عالم صدیقی نے تخلیقی مقالے کے عمل کو سمجھنے میں آسانی پیدا کردی ہے۔ تحقیق کے عناصر کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ مقالہ تحریر کرنے کی راہ آسان کردی ہے۔ اپنی بات کو صدیقی نے مثالوں اور حوالوں سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اپنے نظریات کو ثابت کرنے کے لئے ادبی تاریخ، علمی اور لسانی دلائل سے کام لیا ہے معلومات کا دائرہ وسیع کیا ہے۔ تحقیق کے بنیادی اصول سے واقف کرایا ہے۔ ہمیں تحقیق کی طرف راغب کیا ہے اور تحقیق کے لئے رہنما خطوط قائم کئے ہیں۔

تحقیق کے سلسلے میں بہت سے نکات پر آفاق عالم صدیقی نے روشنی ڈالی ہے مگر یہ نہیں بتایا ہے کہ تحقیق کی ابتدا کب، کہاں اور کس نے کی۔ تحقیق کی تاریخ کا اجمالی جائزہ پیش کرنا چاہئے تھا۔ پھر یہ کہ اردو میں تحقیق کی کیا صورت حال ہے اس پر بھی گفتگو ہونی چاہئے تھی۔ اردو میں ادبی تحقیق کا بہت کام ہوا ہے۔ ان حصولیابیوں کا بھی ذکر ہونا چاہئے تھا۔ ساتھ ہی اس ضمن میں تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھانا چاہئے تھا۔ آفاق عالم صدیقی نے محقق کی خوبیاں تو گنائی ہیں مگر اردو کے مایہ ناز محققوں کے نام نہیں گنائے ہیں۔ سرسید احمد خاں، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، حافظ محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، نصر الدین ہاشمی، قاضی عبدالودود، اختر

اور رینوی، امتیاز علی عرشی، مسعود حسین رضوی، مسعود حسین خاں، محی الدین قادری زور، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، نورالحسن ہاشمی، گیان چند جین، گوپی چند نارنگ، جمیل جالبی ان میں سے ایک کا بھی نام نہیں لیا ہے۔ مضمون میں سندی تحقیق کا ذکر ہے مگر پورے مضمون میں کہیں نگراں کے رول پر بات نہیں کی گئی ہے۔ جبکہ سندی تحقیق میں نگراں کی کارگذاری لازمی ہے۔ آفاق عالم صدیقی خود بھی نگراں ہیں۔ تحقیقی مقالے کے اہم جز مواد کے ذرائع کی صدیقی نے فہرست پیش کی ہے مگر ایک اہم ذریعہ انٹرنیٹ کے ذکر سے چشم پوشی کی ہے۔ دوسرے محققین کے مطالعے کی حواشی اور دوسری زبانوں نیز دوسرے سبجکٹ کی کتابوں یا ان کے ترجمے کے مطالعے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ آفاق عالم صدیقی نے صرف قاضی عبدالودود، گیان چند جین، مالک رام جیسے معدودے چند محققوں کے اقتباس نقل کئے ہیں۔ صدیقی نے اور بھی محققین، اور بھی تحقیقی تصانیف کا مطالعہ کیا ہوگا مگر اس کا ذکر نہیں آیا ہے۔ ان سب کا ذکر کیا جانا چاہئے تھا یا پھر مطالعہ نہیں کیا ہے تو کرنا چاہئے تھا تاکہ گفتگو اور بھی جامع ہوتی۔ تحقیق میں بے تعصبی اور غیر جانبداری کا کیا رول ہے اس کا ذکر بھی ہونا چاہئے تھا۔ محقق کی یادداشت کا فائدہ اور اس کے آنکھ، کان کھلے رکھنے کے فوائد پر بھی روشنی پڑنی چاہئے تھی۔

آفاق عالم صدیقی کا مضمون ''تحقیق اور تحقیقی مقالہ'' اگرچہ تحقیق کے زمرے میں آتا ہے مگر اس میں تنقیدی رنگ بھی ہے۔ تنقید کی اہمیت مضمون کے شروع میں بھی واضح کی گئی ہے۔ یہ مضمون تخلیقی ادب سے حظ اٹھانے اور سمجھنے کی کدوکاوش کا حصہ ہے جس طرح تحقیق سب کے لئے نہیں ہے یہ مقالہ بھی سب کے لئے نہیں ہے۔ البتہ تحقیق سے جڑے طلباء و طالبات کے لئے یہ مضمون معاون ہے۔ غیر سندی محققین کے لئے بھی اس میں فائدے کی چیز ہے۔ تحقیق کے سلسلے میں لائحۂ عمل تیار کرنے کے لئے یہ کارگر ہتھیار ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اس مضمون سے تحقیقی سفر پر روانہ مسافر استفادہ کرینگے۔ ابھی یہ دیکھا جانا چاہئے کہ آفاق عالم صدیقی نے تحقیق اور تحقیقی مقالے کے سلسلے میں جو باتیں بیان کی ہیں، اپنے تحقیقی مقالات میں وہ خود ان پر کاربند ہیں کہ نہیں۔ تو ہم پاتے ہیں جو تحقیقی مضامین شامل کتاب ہیں وہ ہر لحاظ سے قابل قبول ہیں۔ زبان و بیان بھی لائق فہم ہے۔ صدیقی نے جتنے اچھے تنقیدی مضامین تحریر کئے ہیں اتنے ہی اچھے تحقیقی مقالات بھی لکھے ہیں۔ تحقیق سے ان کا رشتہ مستحکم ہے۔ نقاد شاعر نے اپنے مضمون میں جہاں ناقدانہ فہم و فراست اور ذہانت کا ثبوت دیا ہے وہیں محققانہ مہارت پر بھی مہر ثبت کی ہے۔

Badr Mohammadi
AT - Chandpur Fatah
P.O. - Bariarpur - 843102
Distt - Vaishali (Bihar)
Mob. - 9939311612

ڈاکٹر احسان عالم

شین مظفرپوری کے افسانوں کا اسلوبیاتی مطالعہ

نام محمد ولی الرحمٰن اور قلمی نام شین مظفرپوری تھا ان کے والد کا نام حافظ عین الحق تھا۔ ۱۵/جولائی ۱۹۲۰ء کو ان کی پیدائش موضع باتھ اصلی، ضلع سیتامڑھی میں ہوئی۔ آپ کم و بیش ساٹھ برسوں تک اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ آپ نے اردو افسانہ نگاری کے دوسرے دور میں ترقی پسند دور سے لکھنا شروع کیا تھا اور چوتھے دور یعنی مابعد جدیدیت تک لکھتے رہے۔ اردو فکشن میں آپ کا نام معتبر و محترم بن چکا ہے۔ دس افسانوی مجموعے اور نصف درجن ناول شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سی کتابیں اور مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

شین مظفرپوری کے افسانوں میں گھریلو زندگی کی ناہمواریاں، معاشی بدحالی، سماجی نابرابری، اخلاقی زوال، جنسی مسائل، جہیز کے بڑھتے ہوئے لین دین اور فرقہ وارانہ فسادات جیسے اہم مسائل ملتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے مطالعہ سے ان کے گہرے مشاہدے اور مطالعے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں عام طور پر شمالی بہار کے دیہی علاقوں کی عکاسی کی ہے۔ کردار عام طور پر نچلے اور غریب طبقے کے ہوتے ہیں اور معاشرتی ماحول مسلم گھرانوں کا ہوتا ہے۔ چونکہ انہوں نے شمالی بہار کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور مسلم گھرانوں کے معاشرتی ماحول سے گہرا لگاؤ رہا ہے اس لئے ان کے یہاں ایسے ہی کردار اور ایسے ہی ماحول کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں غیر مسلم کردار بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے بہت سے مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ بہت سے موضوعات پر کہانیاں لکھی ہیں۔ انہوں نے ایک جگہ خود ہی لکھا ہے :

> ''میں کسی خاص موضوع یا مسئلہ پر افسانے نہیں لکھتا۔ میرے افسانے رنگا رنگ ہیں۔ عام طور پر سماجی مسائل، انسانی نفسیات، حادثات، سیاسی غلط کاریاں وغیرہ میرے عام موضوعات ہیں.....خدا ترسی اور خدا پرستی اور روحانی احساسات میرے فکر و فن میں under current محرکات کی حیثیت رکھتے ہیں۔''

(بحوالہ ''بہار میں اردو افسانہ نگاری'' ڈاکٹر قیام نیر، ص:۱۵۴)

شین مظفر پوری کی سب سے بڑی خوبی یہ رہی ہے کہ انہوں نے افسانہ نگاری کے فنی مطالبات کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ وہ افسانے میں قصہ پن کے ہمیشہ قائل رہے۔

''آدھی رات کے سناٹے میں دروازے پر دستک کی آواز نے گورے کو چونکا دیا۔ دوسری بار دروازے سے دستک ہوئی تو گورے کی ماں بھی جاگ پڑی۔ وہ ڈرے ہوئے لہجے میں بڑبڑائی——ذرا دیکھ اے گورے! کون دروازہ پیٹ رہا ہے۔'

'ہوگا کوئی'۔ وہ بظاہر بے پروائی سے بولی۔

'آخر کون ہوگا اتنی رات گئے؟'

(کینسر کینسر)

شین مظفر پوری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اجتماعی مسائل پر زور دیا ہے۔ انفرادی مسائل پر ان کے بہت کم افسانے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کو موضوع بنا کر انہوں نے بہت سے افسانے لکھے ہیں۔ ''سرخ لہو''، ''ماجرا جو گزر گیا''، ''ودیا نگر کی مسجد''، ''سفید دودھ'' اور ''کارواں'' وغیرہ ایسے ہی افسانے ہیں۔ ان افسانوں کے ذریعہ انہوں نے اجتماعی مسائل کو اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی فرقہ وارانہ فسادات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے :

''دانت کاٹی روٹی کھانے والوں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا دیکھا ہے۔ انسان کی لاش گدھوں اور کوؤں کو نوچتے دیکھا ہے۔ شیر خواہ بچوں کو دودھ اور پانی کے قطروں کے لیے ترس ترس کر اور تڑپ تڑپ کر دم توڑتے دیکھا ہے۔ انسانی حرمت وتقدس کو شیطانی شہوت کے مقتل پر خون میں لت پت دیکھا ہے۔ میں نے ہوا اور پانی میں خون کی بو سونگھی ہے اور میری نگاہیں نگر نگر اور شہر شہر ڈھونڈتی پھریں کہ شاید کسی چوراہے پر کسی قاتل کی لاش بھی لٹکتی ہوئی دیکھ پائیں مگر انصاف نے شرم کے مارے خودکشی کر لی تھی۔''

(ماجرا جو گزر گیا)

شین مظفر پوری نے اپنے افسانوں میں کسانوں، مزدوروں اور متوسط طبقہ کے لوگوں کی زندگی کے مسائل کو متاثر کن انداز سے پیش کیا ہے۔ استحصال پسندی کی مختلف صورتوں اور عورتوں کے اندر پائی جانے والی اندھی عقیدت اور شادی بیاہ کے غلط رسومات کی عکاسی بھی انہوں نے بڑی ہوشیاری سے کی ہے۔

اسلوب افکار وخیالات کی ترسیل وابلاغ کا ایک دلکش پیرایہ ہے۔ ہر آدمی کا اسلوب الگ الگ

ہوتا ہے۔ جس طرح ہر آدمی ایک دوسرے سے چال ڈھال، خد وخال، عادات واطوار اور انداز گفتگو میں الگ الگ ہوتا ہے اسی طرح ہر ادیب وشاعر کا اسلوب بھی الگ الگ ہوتا ہے۔ ہر ادیب اپنے اسلوب اور اسٹائل کی وجہ سے پہچانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نے اسلوب کو مصنف کی جلد، کسی نے مصنف کا جامہ، کسی نے مصنف کے خیال کا سایہ اور کسی نے اسے مصنف کے دل کی ترنگ قرار دیا ہے۔

ہر صنف ادب کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔ اردو فکشن کا تقاضہ ہے کہ اس کی زبان آسان سادہ اور سلیس ہونے کے ساتھ ساتھ دلکش اور دلنشیں ہو تاکہ قاری اسے آسانی سے سمجھ سکے اور آگے بڑھنے میں اس کی دلچسپی بھی قائم رہے۔ جب ہم شین مظفر پوری کے افسانوں کے اسلوب کا مطالعہ کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ وہ موقع محل کی مناسبت سے زبان کا ستعمال کرتے ہیں۔ جس طرح آدمی کے اندر وقت کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے اسی طرح مصنف کا اسلوب بھی وقت اور حالات کے مطابق کچھ نہ کچھ بدلتا رہتا ہے۔

شین مظفر پوری (۱۹۲۰۔۱۹۹۶) کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۷ء میں افسانہ نگاری سے ہوا جو آخری دم تک جاری رہا۔ ان کے دس افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ افسانوں کے علاوہ تین ناول، دو ناولٹ، ایک انشائیوں کا مجموعہ، ایک ڈراموں کا مجموعہ بچوں کے لئے دو کتابیں اور ایک خودنوشت یادداشت منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں کچھ حد تک ترقی پسند خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اس لیے اس دور کے افسانوں کے اسلوب اور اس دور کے بعد کے افسانوں کے اسلوب میں تھوڑا بہت فرق ہے لیکن ان کا اپنا جو ایک الگ خاص اسلوب ہے وہ کم وبیش ہر جگہ قائم ہے۔

شین مظفر پوری کے افسانوں میں سماجی نابرابری، معاشی بدحالی، گھریلو زندگی کی ناہمواریوں، فرقہ وارانہ فسادات اور جہیز کی لعنت جیسے موضوعات کی فراوانی ہے۔ انہوں نے موضوع کے لحاظ سے اسلوب اختیار کیا ہے۔ ''ماجرا جو گزر گیا''، ''سفید دودھ''، ''سرخ لہو''، ''ودیا نگر کی مسجد'' اور ''کارواں'' وغیرہ میں موضوعات کی مناسبت سے اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے افسانے کی اہمیت دوبالا ہوگئی ہے :

''دانت کاٹی روٹی کھانے والوں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا دیکھا ہے۔ انسان کی لاشوں کو گدھوں اور کووں کو نوچتے دیکھا ہے۔ شیر خوار بچوں کو دودھ اور پانی کے قطروں کے لیے ترس ترس کر اور تڑپ تڑپ کر دم توڑتے دیکھا ہے۔ انسانی حرمت وتقدس کو شیطانی شہوت کے مقتل پر خون میں لت پت دیکھا ہے۔''

شین مظفر پوری کے کچھ افسانے جنسی اور نفسیاتی مسائل پر مبنی ہیں۔ ایسے افسانوں میں وہ منٹو، عصمت چغتائی، واجدہ تبسم اور سید محمد محسن کے قریب دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں اس

موضوع کو آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے۔ کچھ لوگوں نے اس طرح کے افسانوں کو عریاں اور فحش کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے ایسے افسانوں میں اپنے معاشرے کے اخلاقی زوال پر طنز کرنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے ایسے افسانوں کے لیے رنگین الفاظ اور رومانی دل آویزیوں سے پر جملوں کی ضرورت ہوگی۔ شین مظفر پوری سے ایسے افسانوں کے اسلوب کو دلکش اور دلنشیں بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ ''انو آپا''، ''بند کمرہ''، ''غسل خانہ میں''، ''آخری بدنامی'' اور ''لذت بے زبان'' میں ان کے رنگین، رومان آمیز اور قارئین کے ذہن کو ابھارنے والے اسلوب دیکھے جاسکتے ہیں :

> ''انہیں دنوں ایک شام ایسا ہوا کہ سلما بیگم کے فلیٹ پر ایک نوجوان نے دستک دی۔ نکلتا ہوا قد مسکین صورت اور شرمیلی آنکھیں۔ وہ نوجوان سلمہ بیگم کو دیکھنے میں بوکھلا گیا۔ جلدی سے بولا ''کیا زہرہ ہاشمی یہیں رہتی ہیں؟'' میں بیگم سلمہ ہاشمی سے ملنا چاہتا ہوں مگر فوراً اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ بے چارہ گڑ بڑا کر الٹا بول گیا تھا۔''

(دوسری بدنامی)

شین مظفر پوری نے اپنے بیشتر افسانوں میں کسان، مزدور اور نچلے اور متوسط طبقے کی زندگی کے مسائل، ان کی مجبوریوں اور محرومیوں کو متاثر کن انداز سے پیش کیا ہے۔ عورتوں کے اندر پائی جانے والی اندھی عقیدت اور غلط رسم و رواج کی عکاسی بڑی ہوشیاری سے کی ہے۔ ''دستک''، ''معاوضہ''، ''بے زباں''، ''بازار بند ہے'' اور ''قانون'' وغیرہ میں ان صورتوں کو دیکھا جاسکتا ہے اور ان کے انداز بیان کو سمجھا سکتا ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ افسانوں میں زبان اور اسلوب کی کتنی اہمیت ہوتی ہے۔ وہ اس ہنر سے اچھی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سادگی اور فنکاری کے ساتھ افسانوی کو آگے بڑھانا ہے :

> ''اس نے سنا جن کے پاس طاقت ہے وہ قانون کی آنکھ میں بھی دھول جھونک سکتے ہیں جن کے پاس دولت ہے وہ قانون کے پاسبانوں کو بھی خرید سکتے ہیں جو کمزور اور غریب ہیں وہ طاقت اور دولت کے دو پانوں کے درمیان بس رہے ہیں۔ ہر طرف لوٹ کھسوٹ اور اکھاڑ پچھاڑ کا بازار گرم ہے۔ قانون ایک طمع ہے، سماج ایک بھیس ہے، حکومت ایک آڑ ہے۔''

(قانون کی بستی)

شین مظفر پوری زبان اور اسلوب کے لحاظ سے ایک اہم ترین افسانہ نگار ہیں۔ اظہار بیان اور جملوں کی ساخت میں ان کا ایک الگ انداز ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانوں میں زبان و اسلوب کا وہ فنی

ISSN :2582 -3612

اظہار موجود ہے جس میں ان کی اپنی شخصیت ان کے اپنے جذبات و احساسات، ان کے اپنے تجربات و مشاہدات، ان کا اپنا عہد اور ان کا ماحول ایک مخصوص انداز اور منفرد لب ولہجہ کے ساتھ قاری کے سامنے آجاتا ہے۔ ان کا تعلق متھلا کے جس معاشرہ سے تھا اس معاشرے کے افسانے انہوں نے کثرت سے لکھے ہیں۔ زمیندرانہ سرمایہ دارانہ اور جمہوری نظام تک کی خامیوں اور کمزوریوں کو انہوں نے اپنے ایک الگ انداز میں پیش کیا ہے :

> ''اعلانات اور بیانات سن سن کر نرسا یا سوان دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ یہ خوش نصیب لوگ کس نگری کس بستی کے رہنے والےہیں جن پر سرکار اس قدر مہربان ہے؟ کیا پٹنہ سے سیتا کی دھرتی کی طرف کوئی راستہ نہیں آتا! ___ سیتا مڑھی ___ بہار کا یتیم ضلع جس نے سچ مچ کا ایک اچھا نیتا پیدا نہ کیا۔ کبھی اپنا کوئی فعال نمائندہ، ایسا نہ چن سکا جس کے منہ میں زبان بھی ہو۔ نرسا بے چارہ بھی ووٹ دیتے دیتے تھک چکا تھا اس کی قسمت میں ووٹ دینا ہی تھا۔ ووٹ کا چمتکار تو نمائندے کی قسمت میں تھا۔''

(لچکا)

شین مظفر پوری کے افسانوں کے کردار اور مکالمات عام انسانوں کی طرح ہوئے ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار اور ان کے ذریعہ ادا کرائے گئے مکالمات بالکل فطری رنگ میں ہوتے ہیں۔

> ''کیلاش کی بے ساختہ ہنسی پر ساس نے ٹوک دیا
> ''کیا پڑھ کر ہنس رہی ہو بہو؟''
> ''خط ہے ___ زبیدہ کا، بڑی مزیدار باتیں لکھی ہیں۔''
> ''زبیدہ ___ زبیدہ کون؟''
> ''وہی میری سکھی جس کے خط آیا کرتے ہیں۔''
> ''یہ تو کوئی مسلمانی نام معلوم ہوتا ہے؟ کون ذات ہے؟''
> ''بس ذات وات کچھ نہیں۔ مسلمان ہے۔ میری بڑی چہیتی سکھی ہے۔''
> ''تمہارے نیہر میں مسلمان بھی ہیں؟ اور مسلمان لڑکی تمہاری ایسی چہیتی ہے؟''

(نئی الف لیلیٰ)

شین مظفر پوری کے افسانوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زبان و بیان کے لحاظ سے وہ ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ ان کی زبان سادہ، سلیس اور پرتاثیر ہوتی ہے۔ وہ ترتیب ماجرا اور تعمیر عروج

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

کے فن سے واقف تھے۔ مقامی الفاظ جیسے گمچھا، اوسارا، پچھوٹہ، گھمواں، الگنی اور پوال وغیرہ کے استعمال دیہاتی محاورے، خوبصورت تمثیلیں اور تشبیہیں اور حسین استعاروں نے انہیں ایک کامیاب افسانہ نگار بنادیا ہے۔

قصہ پن کی دلچسپی اور بیان کی سادگی کے لحاظ سے وہ سہیل عظیم آبادی کے بہت قریب ہیں۔ ان کا اسلوب سیدھا سادہ ہے لیکن اس میں ایسی تازگی، رنگینی اور پرکاری ہے کہ پڑھنے والا قصہ پن کے سحر میں اس طرح کھو جاتا ہے کہ افسانہ ختم کرکے ہی دم لیتا ہے :

> ''ناصر کو نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاہینہ بیوی ہے یا مشین ! پھر اس نے سوچا کہ وہ خود بھی تو کولھو کا بیل بن کر رہ گیا ہے۔ ایک دائرے میں چکر کاٹتے، زندگی گزرتی رہتی ہے۔ اس دائرے کے اندر بیوی، بچہ، چولھا، پلنگ، الگنی، برتین، کپڑے اور ایک چھوٹا سا گھر، پھر دفتر، میز، فائلیں، ہیڈ کلرک، افسر چند رفقائے کار، چپراسی اور سبزی مارکیٹ۔ اس دائرے کے اندر سورج کا طلوع وغروب ہوتا ہے اور اس کے اندر چاند بھی چمکتا ہے۔ سردی گرمی اور برسات کے موسم بھی آتے ہیں۔''
>
> (سرد جنگ)

مختصر یہ کہ شین مظفرپوری کو الفاظ پر قدرت حاصل ہے۔ انہوں نے موضوع، ماحول اور کرداروں کے معیار کو سامنے رکھ کر، اس کے مطابق زبان استعمال کی ہے۔ زبان اور اسلوب کے لحاظ سے بھی ان کے افسانے ہمیشہ یاد کئے جاتے رہیں گے۔

Dr. Ahsan Alam
Principal
Alhera Public School
Darbhanga
Mob. - 94314 14808

ڈاکٹر اسلم محبوب خان

مظہر محی الدین کا شعری اسلوب

ادبی مضمون لکھتے ہوئے پہلی دفعہ ایسا خیال آیا کہ باوضو رہوں اور اپنی نیت کو بھی طہارتِ فکر عطا کروں تب مظہر محی الدین جیسی شخصیت پر کچھ لکھنے کیلئے قلم کو وا کروں۔ مظہر محی الدین کی شخصیت ''ادب'' کا آئینہ ہے اور ان کا فن ''مشرف بہ اسلام'' ابتداء ہی سے رہا ہے۔ انسان کی شخصیت کا اثر اس کے ادب پر ضرور پڑتا ہے۔ جب ہم مظہر محی الدین کے فن کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک ایک شعر میں ان کی شخصیت پر سے پردہ اٹھتا چلا جاتا ہے۔ مصاحبین کے ذریعہ ان پر لکھے گئے خاکوں اور تبصروں سے تو اور بھی زیادہ ان کی شخصیت سے محبت ہونے لگتی ہے۔ قحط الرجال کے دور میں ایک رجال مومن کی دستیابی اپنے آپ میں ایک معجزہ ہی تو ہے۔ شخصیت میں بہت سادگی، علمی تبحر ان کے کپڑوں اور ہلکی مسکراہٹ سے جھلکتا ہوا۔ آنکھوں میں تفکرات کی سرخی، اس پر کثرتِ مطالعہ کا شاہد چشمہ اور ریش و سر پر سپیدی اس بات کی علامت ہے کہ وہ تجربہ کار بھی ہیں اور نیکوکار بھی۔ تقویٰ سمجھنا ایک الگ امر ہے اور تقویٰ محسوس کرکے اس کو برتنا بہت مشکل امر ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اچھے اچھوں کو متزلزل ہوتے دیکھا ہے۔ لیکن یہ وہ شخص ہے جس نے اپنی زندگی کے ہر ایک تارِ نفس پر اور اپنے فن کے لفظ لفظ حرف حرف پر اسلام اور خداترسی کی چھاپ رقم کی ہے۔ ابتداء سے ہی مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے فکری وابستگی رہی اور جماعت اسلامی و ادبِ اسلامی کے فعال رکن رہے۔ اس سلسلے میں جو لٹریچر انہیں مولاناؒ کی نسبت سے پڑھنے ملا وہ ان کی ذہنی پرداخت اور تربیت کا ذریعہ بنا۔ سب سے بڑھ کر گہرے نقوش مطالعہ قرآن نے چھوڑے اور بس صبغۃ اللہ یعنی قرآن کے رنگ میں مظہر محی الدین کی ذات، ان کا فن اور ان کی شاعری رم گئے۔

ادبی لحاظ سے مظہر محی الدین کا فن خود جوہری کے سامنے کسوٹی کا مقام رکھتا ہے۔ وہ ۸۴؍ برس کی عمر میں بھی ادبی و علمی حلقوں میں مقبول ہیں۔ اپنی ساحر صفت شخصیت سے لوگوں کو اپنا دلدادہ بناتے چلے جاتے ہیں۔ انہیں اپنی اولاد سے بے انتہا محبت ہے۔ جس کا ثبوت ان کے شعری مجموعے ''بشارت'' کے انتساب سے ملتا ہے۔ شاید انہوں نے اپنی اولاد کی تربیت ہی اتنی اچھی کی ہے کہ انہیں خدمت گزار اور فرمانبردار اولاد سے اللہ نے نوازا۔

پروفیسر م پ راہی (شموگہ) اپنی گراں مایہ تحریر میں مظہر محی الدین کے شعری اسلوب کا ذکر کچھ

اس طرح کرتے ہیں :

''ریاست کرناٹک میں جن شعراء نے اپنے مخصوص شعری رویے، انفرادی اسلوب اور شائستہ لہجہ کی بنیاد پر اپنی الگ پہچان بنانے میں پوری طرح کامیابی حاصل کی ہے ان میں ایک معتبر نام مظہرمحی الدین کا ہے۔ جاگتی دہلیز، اعتبار اور لفظ لفظ روشنی جیسی گراں مایہ شعری تخلیقات سے اُردو ادب کے دامن کو مالا مال کرنے کے بعد ان کا یہ چوتھا شعری مجموعہ ''بشارت'' اپنے دامن میں بہت ساری بشارتیں لے کر منظرِ عام پر آرہا ہے۔ اول الذکر تینوں مجموعے ملک بھر کے باذوق اور بالغ نظر قارئین سے بے تحاشہ داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں نہ صرف قارئین بلکہ بیشتر مبصرین اور ناقدین ادب نے بھی کھل کر ان کے محاسن پر اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جیسے جیسے شاعر کی عمر بڑھتی ہے اس کا فن جوان ہوتا جاتا ہے۔ یہی بات ہے کہ ''جاگتی دہلیز'' سے لے کر ''بشارت'' تک آتے آتے مظہرمحی الدین شعروادب کے کئی نشیب وفراز سے گزر چکے ہیں۔ عمیق مطالعہ، گہرا مشاہدہ، وسیع تجربہ اور مسلسل مشق نے انہیں آج فنافی الشعر کے بلند وارفع مقام پر پہنچادیا ہے۔ جس کی وجہ سے اب ان کا شمار ملک کے اساتذہ میں ہونے لگا ہے۔''

(پیش لفظ بشارت: مظہرمحی الدین، حنا پبلی کیشنز، ایقان ہاؤس، گیسودراز کالونی، گلبرگہ۔ ص ۵)

مظہرمحی الدین کی شاعری نے ہر نسل کے ادیب کو اپنا مرید بنایا ہے۔ چار چار شعری مجموعوں کے خالق مظہرمحی الدین نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خود ایک بڑے ادیب واستاد شاعر ہیں۔ کیونکہ یہ ان کی بنیادی فکر سے میل نہیں کھاتا کہ وہ خودی سے بڑھ کر خود ہی میں لگ جائیں۔ وہ تو پل پل اپنی نیت کا احتساب کرتے ہیں۔ شعر کہتے وقت وہ مکمل ذمہ دارانہ کردار نبھاتے ہیں اور شعر کا مضمون کہیں بکھرنے نہیں دیتے۔ ہندوستان کے تمام ہی موقر رسائل میں بڑے اعتبار واحتشام کے ساتھ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی شاعری بشریت اور عبدیت کا حسین امتزاج ہے۔ وہ ربوبیت اور آفاقیت سے انسلاکیت کے قائل ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شاعری الہامی صنف ہے۔ جس میں واردات قلبی کو ایک بڑا دخل ہے۔ اس کے باوجود شعر میں پیکر تراشی اور ارضی تمثیلات کو شامل کرنا شاعر کی مشقِ سخن اور فنی صلاحیتوں پر انحصار کرتا ہے۔ ۱۹۸۴ء میں مظہرمحی الدین کے اولین مجموعہ ''جاگتی دہلیز'' پر ڈاکٹر وہاب عندلیب نے خالص ادبی تبصرہ کیا تھا :

''جاگتی دہلیز مظہرمحی الدین کا اولین شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۸۴ء کے اواخر میں شائع ہوا۔ ان کا تعلق جدید شعراء کے اس گروہ سے ہے جو عصری آگہی کے ساتھ ساتھ فنی اقدار کی پاسداری کو عزیز رکھتا ہے اور صالح اور صحت مند روایات کو اپناتے ہوئے جدید عہد کے

تقاضوں سے بھی چشم پوشی نہیں کرتا۔ مظہرمحی الدین ۱۹۷۰ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ملک کے معیاری رسائل میں ان کا کلام چھپتا ہے۔ زیرنظر مجموعے کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ادب میں کسی خاص نظریے کے حامی نہیں۔ اچھی تخلیق کے لیے شعریت، رچاؤ اور جذبے کو ضروری سمجھتے ہی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری تقلیدی نہیں ہے۔ انہوں نے مجموعے کی ابتداء میں ''اتنی سی بات'' کے ذریعہ یہ واضح کردیا ہے کہ تقاضائے فن کیا ہے وہ شاعری کو صرف زلفِ جاناں اور جام ومینا تک محدود کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس کے کینوس کو خارجی وداخلی محسوسات کی بھرپور ترجمانی کے ذریعہ وسیع کرنا چاہتے ہیں۔''

(تارِنظر: وہاب عندلیب، قومی کونسل برائے فروغ زبان اُردو، نئی دہلی، ص ۲۱۲)

یہ کہنا شاید بجا ہوگا کہ مظہرمحی الدین کی شاعری میں قرآنی تعلیمات کا پرتو شامل ہے۔ مظہرمحی الدین کا لہجہ راست اور تیکھا ہے۔ انہوں نے حق گوئی میں بیباکانہ رویے کا انتخاب کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ پیشۂ شعر وسخن دروغ گوئی اور مبالغہ آرائی سے تعبیر ہے۔ لیکن مظہرمحی الدین نے اسے حق گوئی کا مظہر بنادیا اور خالص سونے کی طرح اس میں کسی طرح کی ملاوٹ کو پسند نہیں کیا۔ وہ جانتے ہیں کہ ہر ایک شخص اپنی جگہ جوابدہ ہے۔ ایک شاعر بھی امت کا رہبر ہے یا انہیں گمراہ کرنے کا ذریعہ۔ اس لئے ایک شاعر کو بھی عادلانہ مزاج رکھنا چاہئے۔ حق کا طلبگار وطرفدار ہونا چاہئے اور حق و باطل میں تمیز کرنے والا منصب ہی شاعر کا اصل منصب ہے۔ مظہرمحی الدین نے اپنی شاعری میں فنون ومعارفِ شاعری پر چھا جانے والے چند بندھے ٹکے آواز کے دھنی لوگوں کو واضح طور پر طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ بے جا اور فضول شاعری کے قائل ہی نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کو منصب امامت پر پہنچایا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ حق بیان کیا جائے چاہے کسی کو کڑوا ہی کیوں نہ لگے۔ طاہر رحمانی نے مظہرمحی الدین کی شعری پیرہن کے نور کو محسوس کرتے ہوئے اپنا مشاہدہ ان لفظوں میں بیان کیا ہے :

دنیا آپ کو ایک پختہ مشق اور ادبِ اسلامی کا نمائندہ شاعر مانتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ادب اسلامی کے نمائندہ شاعر ہیں۔ آپ کے شعری قد کو ناپنے کے لئے سر اٹھائیں تو پگڑیاں گرجائیں۔ آپ کی شاعری مسرت سے شروع ہو کر بصیرت پہ ختم ہوتی ہے۔ آپ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ جب کوئی سنجیدہ قاری آپ کا کلام پڑھتا ہے تو اس کا ذہن جھومنے لگتا ہے اور معنی کی ایک سطح سے دوسری سطح تک کا سفر کرتا ہے۔''

(ص ۱۲، بشارت)

جب ہم مظہر محی الدین کی شعری بافتوں کو کھولتے ہیں اور ان میں منقش رموز ونکات کی تشریح میں مصروف ہوتے ہیں تو اس بات کے کھلے طور پر معترف ہوجاتے ہیں کہ مظہر محی الدین ایک شاعرِ دہر ہیں اور اپنی تجدیدی کارناموں کو اپنی شاعری کے ذریعے سے انجام دے رہے ہیں۔ان کی غزل اکثر تلمیحات سے پُر ہے۔اس غزل میں بھرپور جوش وولولہ پوشیدہ ہے۔اس میں شعریت اور حسن آرائی کی تمام شکلیں موجود ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ مظہر محی الدین اپنی شاعری کے ذریعہ ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے'' کے مصداق کچھ بورہے ہیں اور عنقریب اس کے پودے نمو پاکر قاری کے ذہن پر نشو پانے لگیں گے۔ان کی غزلیں حیات وممات کے راز اور مقصدیت کے پہلو کو اُجاگر کرتی ہیں۔وہ رمز ہائے زندگی کو بالکل اسی نہج پر اُٹھاتے ہیں۔جس نہج پر اقبالؒ نے اپنی شاعری میں اُٹھایا ہے۔حالانکہ بہت سارے تبصروں میں مظہر محی الدین کو غیر تقلیدی رجحان سے پرے بتایا گیا ہے۔لیکن ان کی شاعری کے سرسری مطالعے سے یہ پہنچانا مشکل نہیں کہ وہ مولانا مودودیؒ اور اقبالیات کے ساتھ ساتھ سرسید کی افکار سے متصف شعروشاعری کرتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ وہ اسی سلسلے کی ایک کڑی کی حیثیت سے فکری نمائندگی کررہے ہیں۔

مظہر محی الدین کی غزلیات سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے جو ان کی فکری اور شعوری مسلک کی نمائندگی کرتے ہیں۔

خانہ خانہ بٹ گئی امت روش عام ہے
تھام لو رسی کلام حق کی ،یہ پیغام ہے
رت جگا چاروں طرف اور بے قراری عام ہے
ایک کھٹکا بے گھری کا دل میں صبح و شام ہے
قدم در قدم خیر و شر جلوہ گر ہے
تمیزِ ہنر کا سفر عمر بھر ہے
اُدھر اک قیامت اِدھر اک قیامت
نہ اُس پر نظر ہے نہ اِس پر نظر ہے
کڑا امتحاں ہے یہ دنیا کا جینا
یہ دنیا فریب اور دھوکہ کا گھر ہے

مظہر محی الدین روزِ محشر جزاوسزا پر ایمان رکھتے ہیں۔لیکن وہ دنیا میں بھی کردار کی جلوہ نمائی اور اثرات کے قائل ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ انسان کا کردار اس کا پیچھا کبھی نہیں چھوڑتا چاہے انسان کتنے ہی شہر بدل لے۔وہ اندھی تقلید اور پیش رونقوش پر اندھا دھند چلنے کے قائل نہیں وہ چاہتے ہیں ہر انسان اپنے ضمیر

ISSN :2582 -3612

کے آئینے میں نورِ حق کو پہچان کر عارف باللہ بن جائے۔وہ ایک ایسے شاعر ہیں جو فن شناس ہیں ایسے سخنوروں سے انہیں تنفر ہے جنہوں نے فن کو محض بازار کا سامان بنادیا ہے۔

خود اپنے شہر سے ہوکر گذر رہا ہے وہ
نظر ملانے سے اک اک سے ڈر رہا ہے وہ
پجاری تب بھی تھا، اب بھی ہے چڑھتے سورج کا
یوں اپنے دل میں اندھیروں کو بھر رہا ہے وہ
ہاں' کور دشموں میں خوش نام ہے بہت لیکن
سخنوروں میں کہاں معتبر رہا ہے وہ

مختصر بحروں اپنے جاندار اشعار کے ذریعہ نورانی پیغام شامل کرنے کا ہنر مظہر محی الدین خوب سے خوب تر انداز میں جانتے ہیں۔وہ حقیقتِ زندگی کے شناسا ہیں اور اس سے ہر کسی کو باخبر رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں انسان مشتِ خاک ہے تو منکسر ہی رہے فرعون کی طرح سرکشی کا راستہ نہ چنے۔یہی ہوتا رہے گا جو آج ہورہا ہے۔یعنی عالمِ انسانی اب ایک جنگل بن گیا ہے۔انسان کو اپنی چند روزہ زندگی میں ہرگز بھی غافلانہ رویے سے کام نہیں لینا چاہئے۔

حیاتِ بشر کس قدر مختصر ہے
سفر کی نزاکت کی کس کو خبر ہے
ابد کے سفر سے اگر بے خبر ہے
الم زندگی بھر، خوشی مشت بھر ہے
یہ مانا کہ فرعونیت سربسر ہے
کوچہ کوچہ جنگل ہے
رستے رستے دنگل ہے
غفلت کا انجامِ بد
آج نہیں ہے تو کَل ہے

مظہر محی الدین ظلم سہنے کو بھی ظالم کا حامی قرار دیتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ ظلم کو جواب دیا جائے ۔وہ ہجرت وحرکت کے قائل ہیں۔وہ چاہتے ہیں ایک بھائی دوسرے سے حاسد ومحسود کے رشتے میں نہ بندھے۔کیونکہ یہ حسد ہی ہے جو کسی قوم کے اتحاد کا شیرازہ بکھیر دیتا ہے۔اسی لئے ان کے اشعار میں شفافیت ہے اور سیدھے ترسیل کی صفت بھی۔ان کی شاعری میں بہت جگہ تجنیس کا اور تلمیح کا استعمال موقعہ و

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

مناسبت سے انہیں فن کا مہارتوں کا علمبردار بناتا ہے۔

زائر کو اگر حاجتِ ہجرت نہیں ہوتی
ہرگز کبھی کعبہ کی زیارت نہیں ہوتی
یوسفؑ کے عزیزوں کی طرح دل میں کدورت
کردار فضیلت کی حفاظت نہیں ہوتی
ظالموں کا حساب باقی ہے
ان پہ رب کا عتاب باقی ہے
ظلم کی انتہا تو کب کے ہوئی
ظلم کا اب جواب باقی ہے
زخم آخر زخم ہے بھر جائے گا شمشیر کا
وار خالی کب گیا ہے حرفِ حق کے تیر کا
چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات ہے
پُرزہ پُرزہ، لرزہ لرزہ عارضی شہتیر کا

مظہرمحی الدین گرچیکہ سرخیِ زمین اور باطل قوانین سے متنفر ہیں لیکن قدرت کے انصاف وعدل پرانہیں پورا بھروسہ ہے۔ان کی ایقانی وایمانی کیفیت بہت بلند اور پختہ ہے۔وہ امید سحر کے پاسدار ہیں۔وہ بدی کے بدلے نیکی اور برائی کے بدلے اچھائی کے قائل ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ اسلام بس نور اور مثبت سوچ کا مبلغ ہے وہ امن وانسانیت کے قیام میں اسلام کو کلید حقیقی گردانتے ہیں۔وہ امید ہے کہ ایک ظلمتوں کا گھٹاٹوپ اندھیرا مضمحل ہوکر ٹوٹ جائے گا اور تاریکی کے کسی گوشے نورِحق کی کرن پھوٹیگی اور شرق وغرب کو منور کردیگی۔وہ خود کو اس عظیم آفاقی سلسلے کی ایک ادنی کڑی گردانتے ہوئے اپنے سفر میں پورے جوش کے ساتھ امین وصادق کا کردار نبھانے میں مصروف ہیں۔

پیش گوئی ہے قیامت کی نشانی دیکھنا
پھر زمیں پر ہوگی حق کی حکمرانی دیکھنا
ہوگئی ہندہ بالآخر پانی پانی دیکھنا
فاتحِ مکہ کی شب بھر شکر خوانی دیکھنا
امن و انسانیت عنوان ہے تقریر کا
بس یہی پیغام ہے صبح و مسا تنویر کا

روشنی پھیلے گی ہر سو دیکھ لینا ایک دن
ٹل نہیں سکتا کبھی لکھا ہوا تقدیر کا

مظہرمحی الدین نے طویل غزلیات،طویل نعتیں اور نظمیں کہیں ہیں۔انہوں نے سخن وادب کی خوب سے خوب مشق کی ہے اور وہ اپنی فنکارانہ جبلتوں میں نورِحق کے پرتو کو منعکس کرانے میں بے حد کامیاب ہوئے ہیں۔ان کے چاروں مجموعے ان کی عقیدت، ان کی حقانیت اور ان کی فنی سفر کا قیمتی توشہ ہے۔انہوں نے اپنے فن کو نہایت سلیس اور خوش نما زبان میں پیش کیا ہے۔گویا وہ ''قولِ لین'' کے قائل ہوں اور انہوں نے اپنا پیغام روحانی تربیت کی طرح سامعین کی سماعتوں اور قارئین کے دل تک پہنچانے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔مظہرمحی الدین کی شاعری اقبال کی زندہ جاوید احساس اور ایمانی کیفیات کی حامل ہیں۔ابتداء عامی ذہن یہ محسوس کرسکتا ہے کہ یہ کلام بڑے سرسری انداز میں کہا گیا ہے۔لیکن اہلِ نظر وبینش کے پاس ان کا عندیہ مختلف رہے گا۔وہ جانتے ہیں کہ مظہرمحی الدین کوئی سادہ لوح انسان ہی نہیں ہے بلکہ اس لوح پر زمین وآسمان کی سنہری کرنیں منقش حروف کی صورت پھوٹ رہی ہیں۔استفادہ کرنے والے فائدے سے خالی نہیں اور کورِ باطن کا اللہ ہی مالک ہے۔مظہرمحی الدین نے فن شاعری، سخنوری اور ادبیات کو اسلامی ادب کے پیکر میں اس خوبصورتی سے ڈھالا ہے کہ اکثر اشعار پر قاری پر کیفیت جذب ومستی طاری ہوجاتی ہے۔بعض اوقات بعض اشعار پر جی بھر کے جھومنے کو جی چاہتا ہے۔ان کے اشعار میں عرفانیت خداوندی اور معرفتِ ربوبیت کی بھرپور نمائندگی ہے۔مظہرمحی الدین پر فنی تبصرے میں ڈاکٹر غضنفر اقبال کے ان الفاظ کو موزوں اور قیمتی سمجھتا ہوں کہ ''مظہرمحی الدین غزلیہ شاعری کا درخشندہ نام ہیں۔''اور بقول ع صمد خانہ پوری ''مظہرمحی الدین کی شاعری محض تفریح طبع نہیں ہے بلکہ ''کارِپیغمبری'' سے تعلق رکھتی ہے۔''اور افتخار امام صدیقی تو سچ ہی کہتے ہیں کہ ''وہ شاعری میں نئی روشنی سموتا ہے۔''۔

ڈاکٹر مظہرمحی الدین کی ذات سے معرفت حاصل کرنے والا نہ ان کی شخصیت سے دور ہوسکتا ہے اور نہ ان کی شاعری سے۔

Aslam Mahboob Khan
Asst. Teacher,
Govt. P.U. College for Boys,
Basawakalyan, Dist. Bidar - 585327
Mob. : 9972009286

ڈاکٹر تسنیم فاطمہ

اردو تنقید کا ایک معتبر نام : کلیم الدین احمد

اردو ادب میں کلیم الدین احمد کی شناخت کئی پہلو سے قائم ہے۔ایک ناقد، ایک شاعر اور سوانح نگار کی حیثیت سے انہوں نے کئی قیمتی تخلیقات سے قارئین ادب کو مالا مال کیا ہے۔اردو ادب میں انہوں نے اپنا ادبی آغاز ''گل نغمہ'' سے کیا۔''گل نغمہ'' ان کے والد ڈاکٹر عظیم الدین احمد کا مجموعہ کلام ہے جس کا مقدمہ کلیم الدین احمد نے لکھا اور ۱۹۳۹ء میں یہ شائع ہو کر ادبی حلقے میں دادِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔اسی مقدمے میں کلیم صاحب نے یہ جملہ ''غزل نیم وحشی صنف سخن ہے'' رقم کیا تھا۔ان کی تنقیدی کتابوں میں اردو شاعری پر ایک نظر (۱۹۴۰ء)، اردو تنقید پر ایک نظر (۱۹۴۲ء)، اردو زبان اور فن داستان گوئی (۱۹۴۴ء)، سخن ہائے گفتنی (۱۹۵۵ء)، اقبال ایک مطالعہ، تحلیل نفسی اور ادبی تنقید کے اصول (۱۹۴۸ء) اور عملی تنقید (۱۹۶۳ء) ہیں۔یہ تمام کتابیں ان کے تنقیدی شعور کا پتہ دیتی ہیں۔کلیم الدین احمد کا تنقید کے میدان میں یہ اختصاص رہا کہ انہوں نے خواہ اصناف سخن ہو یا شعرائے ادب سبھوں کے متعلق اپنے نظریہ نقد سے قارئین ادب کو روبرو کرایا ہے۔جس کا مثبت اثر یہ ہوا کہ اردو تنقید کو ایک نیا رنگ و آہنگ اور نئی شاہ راہ ملی۔جہاں جانبداری اور تعصب پسندی کو کوئی دخل حاصل نہیں تھا۔بلکہ وضاحت اور صفائی کے ساتھ نظریہ فکر اور تنقیدی نقطہ نظر کی پیشکش پر زور تھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید نگاری کی اہمیت کا اعتراف جس طرح پہلے کیا گیا تھا وہ سلسلہ آج بھی قائم ہے۔مختصر یہ کہ کلیم الدین احمد نے اردو تنقید کو معروضی اور تجزیاتی شعور سے ہمکنار کیا۔اس کی خاص وجہ ہے کہ کلیم الدین احمد نے اپنی تنقیدی نگارشات کے حوالے سے اس پہلو کا انکشاف کیا کہ ''قاری کو تنقید کے اہم اور ذمہ دار اغراض کی طرف متوجہ کیا جائے۔'' اردو تنقید کے حوالے سے کلیم الدین احمد کا نظریہ خاصا معیاری اور جامع ہے۔تنقید کے سلسلے سے وہ فرماتے ہیں کہ :

> ''تنقید کوئی کھیل نہیں جسے ہر شخص بہ آسانی کھیل سکے۔یہ ایک فن ہے، ایک صناعی ہے، فن تو ہر طرح کے ہوتے ہیں، مشکل بھی اور آسان بھی، تنقید مشکل ترین فن ہے۔ہر فن کی طرح اس کے بھی اصول وضوابط اور اغراض ومقاصد ہیں۔''
>
> (اردو تنقید پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، ص-۱۶)

ادبی حلقے میں جب کلیم الدین احمد کے نظریہ تنقید سے لوگ روبرو ہوئے تو یہ بات بلا تامل تسلیم کی جانے لگی کہ تنقید کا اصل مقصد ادبی تخلیقات کو سمجھنا، پرکھنا اور معروضی انداز میں سمجھانا ہے۔تنقید کا مطلب

یہ نہیں کہ تنقید نگار اپنی پسندیدہ شخصیت کی ادبی تخلیق کی یا نظریے کی تحسین وتشہیر کرے۔تنقید کے علاوہ غزل کے حوالے سے بھی کلیم الدین احمد نے اپنے نظریہ نقد سے قارئین ادب اور مکتبہ فکر کو روبرو کرایا، اس ضمن میں انہیں مغرب زدہ بھی قرار دیا گیا، لیکن ان سب سے الگ ہٹ کر ان کے تنقیدی نقطہ نظر کے ہم معترف ہیں کیوں کہ یہاں کسی طرح کا ابہام نہیں ملتا بلکہ کلیم الدین احمد کا اختصاص یہ رہا ہے کہ انہوں نے اردو تنقید کو ادب کے عالمی معیاروں سے روشناس کرایا۔انہوں نے اپنی تنقید کے حوالے سے ادبی خوبیوں، تجربات کی اہمیت، اسلوب کی تاثیر اور دلکشی پر مزید روشنی ڈالی۔کلیم الدین احمد غزل کے تعلق سے رقم طراز ہیں :

> ''غزلوں کے ناموزوں سیلاب کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نئی دنیا میں جا پہنچے ہیں جہاں کا آئین، جہاں کا نظام بالکل علاحدہ ہے۔بے ربطی اور پراگندگی کا نام ونشان نہیں۔پراگندگی اور انتشار کے بدلے تعمیری یکسانی ہے۔ہر شعر ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں۔بہ اعتبار معنی ایک دوسرے کا محتاج ہے اور خیالات کی تکمیل اختتام قطعے سے پہلے ممکن نہیں۔''
>
> (اردو شاعری پر ایک نظر حصہ اول، کلیم الدین احمد، ص-۹۰)

اس اقتباس کی روشنی میں یہ کہا جائے گا کہ کلیم الدین احمد غزل میں نظم وربط پر خصوصی توجہ چاہتے ہیں۔مختصر یہ کہ کلیم الدین احمد کے لئے خیال اور ارتقائے خیال غزل کے لئے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔اپنی تنقیدی تصنیف ''اردو شاعری پر ایک نظر'' میں جہاں غزل کے حوالے سے کلیم الدین احمد نے اپنا تنقیدی نظریہ پیش کیا ہے وہیں قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی کے تعلق سے بھی اپنے خیالات اور نظریات سے قارئین کے روبرو کیا ہے۔قصیدہ کے تعلق سے فرماتے ہیں :

> ''پہلی بات تو یہ ہے کہ قصیدہ کی غرض وغایت کسی کی تعریف ہوتی ہے اور وہ بھی نہایت مبالغہ آمیز کسی بادشاہ یا کسی امیر کی تحسین مدنظر ہوتی ہے اور یہ تحسین اس بادشاہ یا اس امیر کے عدل یا جود وسخاوت سے متاثر ہو کے نہیں بلکہ نفع کی امید میں کی جاتی ہے......کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ شاعر قصیدہ کو اظہار عقیدت کا ذریعہ بناتا ہے۔اس طرح قصیدہ میں مذہب اور مذہبی عقائد کی رنگ آمیزی ہوتی ہے، لیکن یہ رنگ آمیزی کسی گہرے پر جوش مذہبی جذبہ سے متاثر ومجبور ہو کر نہیں ہوتی اس قسم کے قصیدوں میں عقیدت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔قصیدے مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے ہوں یا دنیاوی آلائشوں سے ملوث ہوں غرض وہ کسی قسم کے کیوں نہ ہوں ان میں تمام آورد ہوتی ہے۔''
>
> (اردو شاعری پر ایک نظر حصہ اول، کلیم الدین احمد، ص-۴۲-۲۴۱)

اس اقتباس کی روشنی میں یہ کہا جائے گا کہ کلیم الدین احمد نے قصیدے کی جن کمزوریوں کا تذکرہ

کیا ہے ان کی نشاندہی دوسرے تنقید نگاروں نے بھی کی ہے۔اس کے علاوہ وہ قصیدے کے تعلق سے اس بات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں کہ اس کے شعروں میں خوب گہرا ربط و تسلسل نہیں ہوتا ہے۔اس کے برعکس وہ اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ قصیدہ نگار کے زور ادراک کا مرکز الفاظ ہوتے ہیں۔وہ نئے الفاظ ڈھونڈ نکالتا ہے اور نئی بندشیں اور ترکیبیں ایجاد کرتا ہے۔مطلب یہ کہ قصیدہ گوئی بنیادی طور پر اسلوبی طمطراق کی شاعری ہے جسے کلیم الدین احمد نے قابل اعتراف کہا ہے۔

اصناف سخن کے بعد کلیم الدین احمد نے ادیب وشاعروں آزاد، حالی، شبلی، اقبال، اکبر، شوق، چکبست، جوش، مجاز، فیض اور اختر شیرانی کی ادبی وشعری خدمات کے سلسلے سے بھی اپنی قیمتی رائے سے قارئین کو نوازا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کلیم الدین احمد اپنی تنقیدی نگارشات کے حوالے سے تنقید کی مروجہ روایتوں کی کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اردو تنقید کے اغراض و مقاصد پر بھرپور روشنی بھی ڈالی ہے۔ان کے تنقیدی اسلوب میں کسی طرح کی پیچیدگی نہیں بلکہ سادگی اور صفائی موجود ہے۔ان کی تنقید اردو تنقید کے لئے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری کے تعلق سے پروفیسر آل احمد سرور رقم طراز ہیں :

> ''پروفیسر کلیم الدین احمد ہمارے چوٹی کے نقادوں میں سے ہیں۔میں انہیں ایک بہت اہم نقاد ہی نہیں، تنقید کا ایک بہت اچھا معلم بھی سمجھتا ہوں۔نقاد کا کام صرف بت گری نہیں بت شکنی بھی ہے اور کلیم الدین احمد نے بہت سے بت توڑے ہیں۔ان کی کتابوں میں اردو شاعری پر ایک نظر فن داستان گوئی اردو تنقید پر ایک نظر اور عملی تنقید بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔وہ تنقید کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں اور سانس لینے کی طرح اسے ضروری سمجھتے ہیں ....کلیم الدین احمد کی تنقید ہمارے افق ذہنی کو وسیع کرتی ہے ہمیں طرف داری کے بجائے سخن فہمی کے آداب سکھاتی ہے اور ادب کی مخصوص بصیرت اس کی تنظیم اس کے حسن اس کی اعلیٰ سنجیدگی اس کی قدروں کی تلاش اور زندگی میں اس کی اہمیت اور معنویت کی طرف اشارہ کر کے اس کی ایک ضروری تہذیبی اور سماجی فرض انجام دیتی ہے۔''
>
> (کلیم الدین احمد کی ادبی خدمات، ڈاکٹر عبدالمالک، ص ۱۹-۲۱۸)

ان تمام باتوں کی روشنی میں ہم یہ کہیں گے کہ تمام نکتہ چینیوں اور اعتراضات کے باوجود کلیم الدین احمد کے ناقدانہ مزاج واسلوب نے اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے۔یہ بھی کہا جائے گا کہ موجودہ تنقیدی مزاج واسلوب کی سمت نمائی انہوں نے جس غیر جانبدارانہ شعور اور ہمت واستقلال کے ساتھ کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔

Dr. Tasnim Fatima
D/o. Md. Tahir Husssain
Sadar Gali,Patna City. Patna

ڈاکٹر دستگیر احمد

فنون لطیفہ کے مظاہر اور عورت

فنونِ لطیفہ حیات انسانی اور انسانی معاشرے کا ایسا فن ہے جو معاشرہ کے تمام شعبوں اور تمام انسانوں کا احاطہ کرتا ہے۔ چنانچہ فنون لطیفہ کے مظاہر میں عورتوں کی موجودگی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ بلکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کائنات کے اندر انسانی معاشرے کے ہر شعبے میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر عورتوں کا حصہ رہا ہے۔اس آفاقی حقیقت سے ہم انکار نہیں کر سکتے ہیں۔

جہاں تک فنون لطیفہ کے مظاہر میں عورتوں کی حصہ داری کی بات ہے تو ہمیں اس حقیقت کو بلا چوں وچرا تسلیم کر لینا چاہیے کہ عورتوں کے وجود کے بغیر فنونِ لطیفہ کی معنویت مکمل نہیں ہوسکتی ہے۔ہم اس بات میں فنونِ لطیفہ کے تمام شعبوں میں عورتوں کے وجود سے متعلق الگ الگ جائزہ لیں گے۔

ہندستانی فوٹوگرافی کی تاریخ میں جئے پور کے راجہ سورئی رام سنگھ پہلے شخص تھے جنھوں نے اپنی فوٹو گرافی میں عورتوں کی بھی تصویریں لیں اور ان کے لیے الگ سے اسٹوڈیو کھولے۔ان کے علاوہ متعلقہ عہد کے فوٹوگرافروں میں نارائن واجی، گنپت راؤ، ابھیاجی کالے اور نصیروان جی وغیرہ پارسی تھے۔ چند ہندستانی فوٹو گرافروں سے شادی بیاہ اور مختلف رسوم ورواج کے موقع پر گھریلو تصویریں کھینچ کر ہندستانی مناظر کو روایتی شناخت کے فریم میں اُتارنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی اس عہد کی فوٹوگرافی میں ہندستانیت کی خصوصیت نہیں تھی۔اس عہد کے بہت سارے حقائق گرچہ ہمارے سامنے دستیاب نہیں ہیں لیکن ان تصاویر سے یہ اندازہ تو بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے کہ ہندستانی فوٹوگرافی میں عورتوں کے مظاہر پورے طور پر موجود ہیں۔اس وقت کے فوٹو گرافوں کو اپنی ان منفرد طرز کو فروغ دینے اور انھیں استعمال کرنے کی کتنی آزادی رہی ہوگی۔

اس کے باوجود موجودہ دور میں فوٹوگرافی کے میدان میں عورتوں کی موجودگی بہت کم دکھائی پڑتی ہے۔جو کچھ دکھائی پڑتی ہے اس میں بھی زیادہ تر مقامی سطح کی ہی ہوتی ہیں۔لیڈی فوٹوگرافروں کو شہر کے باہر کام کرنے کے مواقع نہیں ملتے۔ چونکہ یہ پیشہ شروع سے ہی مردوں کے اختیار میں رہا ہے۔حالانکہ عورتوں کے لیے اس میں کسی طرح کی پابندی نہیں ہے۔ایک لیڈی فوٹوگرافر کی دوربینی ایک مرد فوٹوگرافر کی نظر سے

بالکل مختلف ہوسکتی ہے۔ان کے ذریعہ لی گئی تصاویر پرکئی ایسے موضوعات کواُجاگر کرنے میں کامیاب ہوسکتی ہیں جوکسی بھی طرح مردوں کی نگاہ میں نہیں آپاتے۔خاص موضوعات کاانتخاب کرکےان پر گہرائی اور باریک بینی سے کام کرنے کے لیےاگرخواتین فوٹوگرافروں کولگایاجائےتواس کےبہترنتائج سامنےآئیں گے۔

ہندوستانی مصوری میں عورت کے مظاہر : گُپت عہد کی زیادہ تر مصوری اَجنتا کے غاروں میں ملتی ہے۔ اجنتا کی مصوری دیواروں پر بہت فنکاری کے ساتھ اُبھاری گئی ہے۔ اَجنتا کے غاروں میں نقش کی گئی تصویروں کا موضوع مہاتما بدھ کی حیات سے متعلق مفصل جاتک کہانیوں نے ،اپسرا، جانور، پرندے، پھولوں اورزیورات سے متعلق ہوا کرتے تھے۔اجنتا کی مشہور مصوری میں اپسرا، سیاہ شہزادی، بودھستد اپدم پنی وغیرہ خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

گجرات کے اپ بھرمشا اسکول کی مصوری بھی قابل ذکر ہے۔اس مصوری کے مظاہر میں بھی عورتوں کواُبھارا گیا ہے۔اس مصوری کی اہم خصوصیات میں عورتوں کی مچھلی نما آنکھیں،چپٹی ناک، ابھری ہوئی تھوڑی، بے ترتیب ہاتھ اورساکت تصویریں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔مصوری کےان نمونوں میں چھاتیوں کا اُبھار زیادہ ہی نمایاں معلوم ہوتا ہے۔جانوروں اور پرندوں کوکھلونوں کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا۔اس مصوری میں قدرتی مناظر کا فقدان ہے۔اس کے علاوہ مصوری کے حاشیے پر رنگ وروغن دیکھنے کو ملتے ہیں۔تصویروں میں چمکیلےاورسنہرے رنگوں کا استعمال کیا گیا ہے۔

اٹھارھویں صدی کے اختتام پر کانگڑا اسکول کی مصوری منظرعام پر آئی۔اس اسکول کی مصوری مغلیہ اورراجستھانی مصوری کا امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔راجہ سنسار چند کی سرپرستی میں مصوری کا یہ اسکول فروغ پاتا گیا جوکرشن کا بہت بڑا معتقد تھا۔اس لیےاس نے مصوروں کوخاص طور سے اس بات پرآمادہ کیا کہ وہ کرشن کی زیادہ سے زیادہ راس لیلاؤں کوتصویروں کوزبانی فنکاری کے ساتھ اُجاگر کریں۔لہٰذا بیشتر تصویروں میں گوپیوں کے ساتھ کرشن کے جذبہ محبت اور عشق کی مختلف کیفیات کوپیش کیا جانے لگا جس سے فنونِ لطیفہ میں عورتوں کے مظاہر کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اسی عہد میں مصوری کا گلیر اسکول منظرعام پرآیا جس میں عورتوں کے مظاہر کونمایاں طور پرپیش کیا گیا۔جس میں جھکے ہوئے سر کے ساتھ خوبصورت لڑکیاں، ان کا پُرکشش لباس اور کہیں کہیں ادھ کھلے لباس ،جھانکتا جوبن اس اسکول کی مصوری میں خاص طور سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔مصوری کےان نمونوں میں رنگوں

ISSN :2582 -3612

کا استعمال علامتی طور پرکیا جاتا تھا۔راجہ پرتھوی سنگھ نے بسوہلی کی شہزادی سے شادی کی جس کی بنا پر چمپا اور برہ مور میں بسوہلی کی مصوری کا رواج خودبخود شروع ہوگیا۔مغلیہ دور میں فروغ پانے والی مصوری کے زیراثر اس کی بدلی ہوئی شکل مصوری کے اودھ اسکول میں بھی دکھائی دینے لگی اور اس کا سہرا بہو بیگم کے سر ہے۔اودھ اسکول کی مصوری مغلیہ عہد کی مصوری کے کچھ معنوں میں مختلف ہیں۔اس کے علاوہ حرکات و سکنات اورعورتوں کی خوبصورتی کے ضمن میں بھی دونوں کی مصوری قدرے مختلف معلوم ہوتی ہے۔آرٹ کے تعلق سے پکاسو کا یہ قول یادرکھنے کے لائق ہے :

''آرٹسٹ کا واحد مقصد صرف پینٹ کرنا ہے اور آرٹ نمونہ خودبخود اسے استعجاب میں مبتلا کردے گا۔''

پیرس میں کے ڈونڈروہل نے مصوری میں اپنی ایک انفرادی شناخت قائم کی۔اس نے مجسمہ سازی کی جملہ خصوصیات اورشوخ رنگوں کے استعمال سے اپنی تصویروں کو انفرادی آہنگ بخشا اور اپنی تصویروں میں اس نے روزمرہ کی عام زندگی اوراس سے متعلق واقعات کوفنکاری کے ساتھ پیش کیا۔سماج اور معاشرے کی ستائی ہوئی مظلوم عورتوں کو خاص طور سے نمایاں کیا اسکے علاوہ اس نے معصوم بچوں کے حوالے سے تصویروں میں اپنے جذبات کا اظہار اس شدت سے کیا ہے کہ آنے والا دور اسے کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔اس کے علاوہ قدرت اور کائنات کے پوشیدہ اورعورتوں کے حسن وجمال کے اچھوتے پہلوؤں کی کامیاب پیش کش بھی اس کی انفرادیت کوواضح کرتی ہے۔

ہندوستانی موسیقی عورت : ہندستان زمانہ قدیم سے ہی رقص اور موسیقی کا مرکز رہا ہے۔اس بات سے ہندستانی موسیقی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔موسیقی سے متعلق جڑیں ہندستان کے قدیم روایات میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔وقت اروزمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں خاطرخواہ تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں لیکن سنگیت کی مدھرتان پرکوئی حرف نہیں آیا۔ ہندستانی موسیقی میں نغمگی ، آہنگ اور فطری بہاؤ کا ایسا خوبصورت امتزاج دیکھنے کوملتا ہےجس کی سحرانگیزی ہمیں مسحورکردیتی ہے۔

ہندستانی موسیقی میں راگ بھیروں کوتمام راگوں میں افضل مانا جاتا ہے۔راگ بھیروں کی ایک شاخ شری راگا ہے جس کا رشتہ عشق اور رومان کی کیفیات سے ہے۔راجستھان میں ڈھولا مارو کی مشہور داستان محبت کوشری راگا میں بطورخاص جذب کرلیا گیا۔ایک راگ توڈی ہے جوایک ناخوشگوار محبت کا نغمہ

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ہے۔ جوتنہائی اور زندگی کی اداسی کو ظاہر کرتا ہے۔ ان راگوں میں کہیں نہ کہیں عورتوں کی کارفرمائی ملتی ہے۔

ہندستانی رقص اور عورت : فنونِ لطیفہ کے مظاہر میں عورت کی شرکت خواہ جس قدر اور جس حیثیت سے ہو وہ سب کی سب معروضی انداز میں پیش ہوتی ہیں لیکن رقص ایسا فن ہے جو براہ راست عورتوں سے متعلق ہے اور عورتوں کا فن ہے۔ ہندستانی تہذیب کے تناظر میں رقص کا مذہب سے ایک خاص رشتہ قائم ہے اسے بعض اوقات عبادت کا ذریعہ بھی سمجھا جاتا ہے جس سے اس کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کی بھرپور عکاسی کے لیے رقص سب سے زیادہ کارگر اور کامیاب وسیلہ ہے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی رقص کی قدیم کلاسیکی روایت موجود ہے لیکن شدت جذبات کی بھرپور پیش کش اور حرکات وسکنات کی مکمل ادائیگی کے لحاظ سے ہندستانی رقص کو بلاشبہ ایک انفرادی حیثیت حاصل ہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ جسم، چہرہ، ہاتھوں اور پیروں کی حرکات وسکنات ایک دوسرے سے اس طرح منسلک ہوتی ہیں کہ انھیں کسی طرح الگ نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ رقص کا ہر زاویہ ایک مخصوص نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہوئے اس سے وابستہ ہوتا ہے۔

۱۹ویں صدی کے ابتدائی عہد میں اودھ کے نواب واجد علی شاہ نے اس رقص کی سرپرستی فرمائی۔ ساتھ ہی ساتھ اس رقص کے تئیں اپنی عملی وابستگی کا بھی مظاہرہ کیا۔ کتھک رقص کی خاص بات یہ تھی کہ رقص دیگر قسموں کے برخلاف اس میں عورتوں کے ساتھ مردوں نے بھی اپنی دلچسپی دکھائی۔ رقص کے سلسلے میں بلاشبہ یہ نئی روایت تھی جو اب تک صرف خواتین کا فن تھا اس میں اب مرد لوگ بھی حصہ لینے لگے۔ یہ الگ بات ہے کہ رقص میں مردوں کی حصہ داری اس وقت بھی ضمنی تھی اور آج بھی ضمنی ہے۔

مینکا نام کی رقاصہ نے کتھک رقص میں نت نئے گوشوں کا اضافہ کیا۔ کتھک رقص کے دیگر قابل ذکر فنکاروں میں ستارہ دیوں، برجو مہاراج، سمبھو مہاراج، لیتھو مہاراج، اچھن مہاراج، آنند شنکر، درگا داس، اوما شرما، شوبھا نارائن، میندنا منگلا کل گردنی بھٹ اور گیتانلی لال خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

رقص بنیادی طور پر ایک ایسا فن ہے جس میں صدفی صد عورت کا حصہ ہے جس میں صرف عورتوں کے مظاہر پیش کئے جاتے ہیں اور ہمارے داخلی محسوسات پوری شدت کے ساتھ مخصوص کیفیات کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اور ہمارے ذوق لطیف کی تسکین کا سامان بنتے ہیں۔ گھنگھرو کی تال پر تھرکتے قدموں

سے داخلی جذبات کی جیسی عمدہ کتھارس رقص کے ذریعہ ہوتی ہے۔ کسی اور وسیلے سے یہ بات ممکن نہیں خصوصاً ہندوستانی رقص میں مذکورہ خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔

ہندوستانی مصوری کی اصطلاح میں رنگین ظروف سازی کی ابتدا یہیں سے ہوئی اس لئے مصوری کے شعبہ میں ظروف سازی کی ابتدا سندھو گھاٹی تہذیب سے ہی سمجھنا چاہیے۔ لیکن وہ فن مصوری کے لیے بالکل ابتدائی دور تھا۔ لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ یہ فن بھی بتدریج ارتقا پذیر رہا لیکن ہزاروں سال کے بعد جب گپت عہد کا آغاز ہوا تو اس فن کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ چنانچہ قدیم تصنیف کام سوترا میں جنسیات کے متعدد پہلوؤں کے ساتھ ہی ساتھ اس عہد کی مصوری کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ جس سے جنس کے متعلق تصویر بنانے میں طرح طرح کے برش اور رنگ کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس مصوری کا براہ راست تعلق عورتوں کے مظاہرے سے ہے۔ کیونکہ فن مصوری کے فن میں گپت حکمرانوں کے عہد کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ فن مصوری کو ہر لحاظ سے اسی دور میں فروغ حاصل ہوا اور نئے نئے امکانات اس فن میں روشن ہوتے چلے گئے۔ اس عہد کے فنی سرگرمی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں مصوری کے چھ بنیادی اصول وضع کئے گئے جو مصوری کے فن میں چین کے اصولوں سے ملتے جلتے تھے۔ چنانچہ اس دور کی دیواروں کی نقاشی اسی کی زندہ مثالیں ہیں۔

لیکن جب ہندوستان میں مغلوں کی حکومت قائم ہوئی تو مصوری کے فن میں کافی پیش رفت ہوئی۔ خصوصاً عبدالصمد اور میر سید کے آنے کے بعد اس سلسلے میں کافی عمدہ پیش رفت ہوئی۔ یہاں تک کہ ہمایوں سے ہوتے ہوئے اکبر اعظم کے زمانے میں فن مصوری بام عروج کو پہنچ گئی۔ مصوری کے فروغ کے لئے اکبر نے اپنے عہد حکومت میں خاص اہتمام کیا اور ایک کارخانہ تعمیر کرایا تھا۔ جہاں ملک کے مختلف حصوں سے مصور آتے اور اپنے فطری صلاحیتوں کا استعمال کرتے تھے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں فن مصوری زوال پذیر ہونے لگی اور ہندوستان کے پہاڑی علاقوں میں آزاد حکمرانوں کی سرپرستی میں فروغ پانے لگی۔ یہاں تک کہ انگریزوں کے زمانے میں ہندوستانی مصوری پر مغربی اثرات مرتب ہونے لگے چنانچہ اس کے تحت ہندستانی مصوری کے مختلف نمونے سامنے آنے لگے۔ ان مصوری کے نمونوں میں عورتوں سے متعلق گہرے اور واضح نشان کے ذریعہ ان کے جذبات واحساسات کو مختلف شکلیں دی گئیں۔ جن میں لال، پیلے اور خاکستری رنگوں کا استعمال کیا گیا ہے اور بہت فنکاری کے ساتھ پتھروں پر اُبھارے گئے ہیں۔ ان نمونوں

کو دیکھ کر بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی مصوری میں عورتوں کے مظاہر بدرجہ اتم موجود ہیں۔

مختصر یہ کہ فنون لطیفہ میں عورتوں کے مظاہر کے تعلق سے گزشتہ صفحات میں جو جائزہ لیا گیا ہے اس کے تحت دنیا بھر کے فنون لطیفہ میں عورتوں کے مظاہر پائے جاتے ہیں خصوصاً ہندوستانی فنون لطیفہ میں تو قدم قدم پر عورتوں کے مظاہر موجود ہیں۔ خواہ وہ انواع واقسام کے رقص ہوں، مصوری ہوں یا پھر کوئی بھی فنون لطیفہ ہو ہر جگہ عورتوں کے مظاہر موجود ہیں۔ یہاں تک رقص تو ایسا فن ہے جس میں اول وآخر سراپا عورتوں کی کارفرمائی ہے۔

Dr. Dastagir Ahmad
Lecturer
Ambedkar-Degree College
Barharia,Siwan (Bihar)

ڈاکٹر احمد معراج

شاد عارفی کی غزلیہ شاعری

غزل مقبول ترین اور لطیف ترین صنفِ شاعری ہے۔ یہ دراصل ایمائیت اور رمزیت کا فن ہے۔ کھلے لفظوں میں گفتگو کرنے میں وہ کہاں جو پردہ داری میں ہے۔ غزل کم سے کم لفظوں میں گہری سے گہری اور بڑی سے بڑی بات کہہ گزرنے کا سلیقہ خوب جانتی ہے۔ اس میں سخت سے سخت اور تلخ سے تلخ بات بھی نرم اور شیریں زبان میں بیان کی جا سکتی ہے۔ غزل کا شعر موزوں کرنا تو بڑا آسان ہوتا ہے لیکن اسے غزل کا شعر بنانا ایک کارِ دشوار ہے۔ اس مشکل کام کو وہ شعرا ہی بخوبی انجام دے سکتے ہیں جو غزل کی روایت وتہذیب سے پوری طرح واقفیت رکھنے کے ساتھ ساتھ غزل کے مزاج داں بھی ہوں اور جنہیں زبان وبیان پر مکمل قدرت ہو۔ ایسے شاعروں کی تعداد ہر عہد میں کم رہی ہے۔ ان ہی میں سے ایک قابلِ ذکر نام شاد عارفی کا ہے۔

شاد عارفی بیسویں صدی کے ایک اہم شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی ایک اہم خوبی ان کا اچھوتا اسلوب ہے۔ پروفیسر مسعود حسین (سابق وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) نے معروف شاعر و ادیب ڈاکٹر مظفر حنفی کی کتاب ''شاد عارفی: فن اور فن کار'' کے پیش لفظ میں بڑی اہم بات تحریر کی ہے جس سے شاد عارفی کی ادبی قدر وقیمت اور ان کے اسلوب کی انفرادیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے:

> ''میں سمجھتا ہوں کہ یہ حقیقت کئی لحاظ سے ڈاکٹر مظفر حنفی کا حاصل عمر ہے۔ اسے قلم بند کر کے انہوں نے ایک ایسی ادبی شخصیت کو پھر سے تولا ہے جسے ناقد (رے) پاسنگ سمجھ بیٹھے تھے، اردو شعر ونثر کے ایک ایسے اسلوب سے روشناس کرایا جو اس صدی کے تیسرے اور چوتھے دہے کا سب سے چونکا دینے والا اسلوب ہے۔''
>
> (''شاد عارفی: فن وفن کار'' صفحہ ۷ اور ۸)

روایت پرست غزل گو عشق کے تصور کو حقیقی زندگی سے جوڑنے میں ناکام رہے۔ ان کا محبوب خیالی ہوا کرتا تھا۔ شاد عارفی نے عشق کا رشتہ انسانی وجود سے جوڑا۔ ان کا محبوب اس مادی دنیا کا ہے۔ انہوں نے عشق کا وہ تصور پیش کیا جس کی نوعیت مادی ہے۔ شاعری میں ارضی حسن کو انہوں نے اہمیت دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں دیرینہ روایات کی جگہ نئی روایات قائم کرتی ہیں۔

سانولا رنگ ، کشیدہ قامت
نہ پری ہے نہ کوئی حور ہے وہ

مسکرا دیں گے ، مرا نام کوئی لے دیکھے
وہ کسی فکر میں بیٹھے ہوں ، کسی کام میں ہوں

ابھی انگڑائیاں لی جارہی ہیں
سمجھتے ہیں ابھی دیکھا نہیں ہے

دیکھئے! معمولی اور سادہ سی بات کو کس خوبصورتی سے غزل کا شعر بنایا گیا ہے۔کسی واقعہ یا تجربہ کو شعر بنانا آسان کام نہیں۔اس کے لیے تخلیقی ذہن کی ضرورت پڑتی ہے۔تخلیقیت کے بغیر شعر صرف ایک statement بن کر رہ جاتا ہے۔

شادؔ عارفی نے زندگی میں دو بار عشق کیا۔دونوں بار ناکامی ہی ہاتھ لگی۔ان کے پاس دو معاشقوں کے حقیقی تجربات ہیں۔انہوں نے غزلوں میں جن عشقیہ واقعات کا ذکر کیا ہے وہ ان کے ذاتی تجربات کے پروردہ ہیں۔اپنی غزلوں میں زیادہ تر انہوں نے آپ بیتی کو جگہ دی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی عشقیہ غزلوں میں روایتی موضوعات پر مبنی اشعار بہت ہی کم ہیں۔انہوں نے خود ایک شعر میں کہا ہے :

دوسروں کے واقعاتِ عشق اپناتے ہیں وہ
جن سخن سازوں کی اپنی داستاں کوئی نہیں

معاملاتِ حسن وعشق کو غزل میں بھرپور شاعرانہ کیفیات کے ساتھ پیش کرنے میں شادؔ کو بڑی مہارت ہے۔اس ضمن میں چند اشعار دیکھئے۔

دیکھ کر مجھ کو مسکرادیں آپ
اس قدر احتیاط کافی ہے

خط غلط تقسیم ہو جاتے ہیں اکثر ، تم نے بھی
کہہ دیا ہوتا یہ کس کا خط مرے نام آگیا

کیا لکھ رہے ہو میری طرف دیکھ دیکھ کر
میں نے دیا جواب غزل کہہ رہا ہوں میں

بہ پاسِ احتیاطِ آرزو یہ بارہا ہوا
نکل گیا قریب سے وہ حال پوچھتا ہوا

ڈاکے سے بھیگی خوشبو والے خط پر خط آئے تو اک دن
پوچھے گا خط لانے والا ، بابو جی ! یہ خط کس کا ہے؟

شادؔ عارفی کسی بات کو اس ڈھنگ سے کہتے ہیں کہ سننے والے کو نئی نئی سی لگتی ہے۔

سوتے ہی اپنے بستر پر
میں ہوتا ہوں اس کے گھر پر

وہ زبانِ بے زبانی سے ابھی واقف نہیں
ہاتھ رکھنا پڑ رہا ہے بارہا دل پر مجھے

بڑھ جاتی ہے اُسی روز مناظر کی اداسی
جب اس سے ملاقات کا امکاں نہیں ہوتا

سلیم احمد نے شادؔ عارفی کی عشقیہ غزل کو ایک 'پورے آدمی' کے عشق کی داستان کہا ہے۔ان کی آواز میں بقول مظفر حنفی جو مردانہ پن ہے وہ غزل کو ایک نئے زاویے سے روشناس کرتا ہے۔ان کی غزلوں میں داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج ہے۔بقول ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی :

''بعض شعراء کا خیال تھا کہ غزل ضرورت سے زیادہ داخلی ہونے کی وجہ سے انفعالیت کا شکار ہوگئی ہے اس لیے اسے مردانہ لہجہ اور صلابت عطا کرنے کے لیے خارجیت کو بھی ایک حد تک اپنانا چاہیے۔یگانہ اور شادؔ عارفی نے اس عنصر کو ایک بار پھر اپنی غزل میں جگہ دی۔''

(جدید غزل-ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی ،سہ ماہی 'فنون'-لاہور، جدید غزل نمبر حصہ اول،صفحہ۲۷)

شادؔ ایک خوددار عاشق ہیں۔وہ محبوب سے عشق تو کرتے ہیں مگر روایت پسند شاعروں کی طرح ان کے ہاتھ اپنی عزت داؤ پر نہیں لگاتے۔

جھٹک کے ہاتھ سے دامن کو جانے والے ، بس
ترے خیال کا دامن بھی چھوڑتا ہوں میں

یہ تومت محسوس ہونے دیجیے
اجنبی ہیں آپ کی محفل میں ہم

بعض حضرات عام بول چال کی زبان کو شاعری کے لیے مناسب نہیں مانتے۔لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ شاعر اگر لفظوں کو برتنے کا ہنر جانتا ہو تو وہ بول چال کی زبان کو بھی معتبر بنا سکتا ہے۔کون جانتا تھا کہ پتھروں سے تاج محل جیسی شاندار عمارت بھی بنائی جاسکتی ہے۔یہ تو فن کار کے ہاتھوں کا کمال ہے جس کے چھو جانے سے معمولی چیز بھی غیر معمولی بن گئی۔شآد عارفی کے کلام کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے عام بول چال کی زبان میں اس سلیقے سے شعر کہے کہ ایک حیرت انگیز تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

شآد عارفی نے اپنی غزلوں میں تشبیہات کا خوب استعمال کیا ہے۔انہوں نے روایتی تشبیہوں سے دامن بچاتے ہوئے اپنے لیے نئی تشبیہات تلاش کیں۔چند اشعار ملاحظہ کیجیے ۔

مقابل قد آدم آئینہ ہے
بڑا دلچسپ مطلع لڑ رہا ہے

جاڑے کی وہ بھیگی راتیں ، گرمی کے یہ جلتے دن
یادوں کے دانتوں سے ناخن کاٹ رہا ہوں لیکن وہ

جیسے کسی حسین کے ہونٹوں پہ سرد آہ
پھولوں کی پتیوں پہ کرشمے ہوا کے دیکھو

مندرجہ بالا اشعار میں محبوب کو نسیم چمن کہنا، قدِ آدم آئینے کے سامنے محبوب کی موجودگی سے دلچسپ مطلع لڑنا، یادوں کے دانتوں سے ناخن کاٹنا، پھول کی پتیوں کے ہوا سے لرزنے کو کسی حسین کے ہونٹوں پر سرد آہ سمجھنا خوبصورت تشبیہات ہیں جنہیں بڑی فن کاری سے برتا گیا ہے۔

شآد عارفی کے کلام کا ایک خاص وصف طنز ہے۔شآد عارفی عام طور پر طنزیہ شاعری کرتے تھے۔ان کے شعری اثاثے کا بڑا حصہ اسی رنگ میں ڈوبا ہوا ملتا ہے۔جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ ان کی شاعری کا امتیازی پہلو طنز نگاری ہی ہے۔وہ جس چیز پر نظر ڈالتے ہیں اس کے عیب پر طنز کرتے ہیں اور اپنے رنگِ سخن کو ایک جداگانہ اسلوب سے مرصع کرتے ہیں۔بقول مظفر حنفی :

''..........تابڑ توڑ مشکلات کے پہاڑ شآد عارفی پر ٹوٹے تو غالب کی طرح آباو اجداد کی سپہ گری پر ناز کرنے والا یہ پٹھان شاعر بھی لچکنے کی جگہ انا کو بلند کرتا چلا گیا اور اپنے قلم، زبان اور طرزِ بیان سے تیغ جوہر دار کا کام لے کر مخالف اور منفی قوتوں

پر طنز کے بے محابا وار کرنے لگا..........''

(شآد عارفی: فن اور فن کار......مظفر حنفی، صفحہ ۸۴)

شآد عارفی کی 1942ء کے بعد کی تمام تر شاعری بقول مظفر حنفی طنز کی بنیاد پر کھڑی ہے۔انہوں نے طنزیہ شاعری کا سہارا کیوں لیا؟اس سوال کا جواب خود انہوں نے ایک شعر میں یوں دیا ہے ۔

بیکسوں پر ظلم ڈھاکر ناز فرمایا گیا
طنز کی جانب میں خود آیا نہیں لایا گیا

شآد عارفی نے ان تمام واقعات کے خلاف قلم اٹھایا جو ان کے مزاج کے خلاف تھے۔زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جو ان کی طنز کا نشانہ نہ بنا ہو۔چند طنزیہ اشعار ملاحظہ کیجیے ۔

جب چلی اپنوں کی گردن پر چلی
چوم لوں منہ آپ کی تلوار کا

کہنے والوں نے کہا ظلِ الٰہی جن کو
ہم انہیں سایۂ دیوار نہیں کہہ سکتے

دیکھ لینا کہ ہر ستم کا نام
عدل ہوگا کسی زمانے میں

بیکسی میں سابقہ پڑے پہ اندازہ ہوا
آپ کو میں دوست سمجھا تھا، بڑا دھوکہ ہوا

وہ لہجہ و رفتار بول دیں کہ نقابیں
پہچاننے والے انہیں پہچان رہے ہیں

ناجائز پیسے کی اجلی تعمیروں کے ماتھے پر
آپ نے لکھا دیکھا ہوگا یہ سب فضلِ باری ہے

پہلے شعر کو دیکھیے۔اپنوں کی گردن پر چلنے والی تلوار کو چومنا خوب ہے۔لفظ چومنے کے استعمال سے ایک عجیب طنزیہ کیفیت پیدا کی گئی ہے۔دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں 'ظلِ الٰہی' اور دوسرے مصرعے میں 'سایۂ دیوار' کی ترکیب لاجواب ہے۔ان الفاظ کی بدولت طنز میں غضب کی شدت پیدا ہوگئی

ہے۔اس طرح کی تراکیب کا استعمال ایک باکمال شاعر ہی کرسکتا ہے۔بقول احمد ندیم قاسمی :

''شادؔ مرحوم اردو غزل اور نظم میں جذبے کی شدت اور طنز کی تیزی کی واحد مثال تھے اور ایک ایسی انفرادیت کے مالک تھے جو مدتوں کے فنی ریاض کے بعد حاصل ہوسکتی ہے۔''

(ادارہ یہ سہ ماہی 'فنون' لاہور-اشاعت خاص نمبر 65-1964ء، صفحہ ۱۲)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو شادؔ عارفی کے یہاں صرف سماجی خرابیوں پر ہی طنز نہیں ہے بلکہ محبت اور نفسیاتِ انسانی کی سچی تصویریں بھی ان کی غزلوں میں ملتی ہیں۔ان کا تیور اور بانکپن ذہن پر نقش ہو جاتا ہے اور جو نیا تصور ابھرتا ہے وہ ان کی شوخیِ تحریر کو انفرادی شناخت کا ضامن بناتا ہے۔

مختصر یہ کہ شادؔ عارفی اردو کے ایک ناقابل فراموش شاعر ہیں۔ان کو وہ مرتبہ نہ مل سکا جس کے وہ مستحق ہیں۔اس سلسلے میں اختر انصاری دہلوی نے اپنی تصنیف 'ایک ادبی ڈائری' کے 1942ء کے ایک اندراج میں لکھا ہے :

''شادؔ عارفی بھی اُن شاعروں میں ہیں جو درجہ اوّل کے شاعر ہوتے ہوئے بھی نقادوں کی نگاہِ التفات سے محروم ہیں۔صرف اس لیے کہ اب تک کسی بڑے نقاد نے اپنے اشاروں پر چلنے والے دوسرے نقادوں کو ان کی طرف متوجہ نہیں کیا۔اُن کا قصور صرف اس قدر ہے کہ وہ شاعری کرنے کے ساتھ ساتھ پروپیگنڈا کرنا نہیں جانتے۔انہوں نے اپنے آپ کو کسی با اثر گروہ کے ساتھ وابستہ نہیں کیا، نہ مشاعروں میں جاجا کر گلے بازی کی۔''

شادؔ عارفی کے فن کا دائرہ کافی وسیع ہے۔وقت آ گیا ہے کہ ان کے فن کا احاطہ کر کے اس کی ادبی حیثیت کا تعین کیا جائے تاکہ اس جینوئن شاعر کو اس کا جائز حق مل سکے۔

Dr. Ahmed Meraj
8/B,K.B. 1st Lane
P.O. - Narkeldanga,
Kolkata - 700 011
Mob. - 96813 18473

ڈاکٹر شائستہ

غیاث احمد گدی کی افسانہ نگاری : ایک تجزیہ

غیاث احمد گدی اردو ادب میں بحیثیت افسانہ نگار اعلیٰ مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ان کی افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۴۷ء میں ''دیوتا'' نام کے افسانہ کی اشاعت سے ہوا۔جو ادبی جریدہ ''ہمایوں'' لاہور میں شائع ہوا تھا۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''بابا لوگ'' ۱۹۶۹ء میں گیا سے شائع ہوا۔اس میں کل نو افسانے ہیں۔ان میں پانچ افسانے اینگلو انڈین سے تعلق رکھتے ہیں۔اور تمام افسانوں کا مقام جھریا اور اس کے آس پاس کا علاقہ ہے۔دوسرا افسانوی مجموعہ ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی'' جو ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔اس میں کل گیارہ افسانے ہیں۔جو علامتی انداز کے ہیں۔تیسرا افسانوی مجموعہ ''سارا دن دھوپ'' جو ۱۹۸۵ء میں منظر عام ہوا۔اس میں کل بارہ افسانے ہیں۔

غیاث احمد گدی کا شمار اردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔انہوں نے جس وقت اپنی افسانہ نگاری کا آغاز کیا اس وقت اردو ادب پر ترقی پسندی کے گہرے اثرات تھے۔ترقی پسندی کی چکا چوند کے آگے کوئی دوسری تحریک یا فکر اپنے قدم جمانے میں ناکام ثابت ہو رہی تھی۔اس دور میں کرشن چند، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور حسن عسکری وغیرہ کا بول بالا تھا۔ان بڑے افسانہ نگاروں کے سامنے کسی نو وارد کا اپنی پہچان قائم کرنا ایک دشوار امر تھا۔لیکن موصوف نے ان تمام مشاہیر ادب سے الگ اپنی راہ نکالی اور انفرادو امتیاز قائم کیا۔انہوں نے اپنے افسانوں میں زندگی کی ساری دشواریوں کو، محرومیوں کو، خواہشات کو اور مجبوریوں کو موضوع بنایا ہے۔

غیاث احمد گدی کا پہلا افسانوی مجموعہ ''بابا لوگ'' کے جائزہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس میں شامل افسانوں میں ترقی پسندی کے اثرات جابجا نظر آتے ہیں۔لیکن انہیں ترقی پسند تحریک کا علم بردار قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔اس افسانوی مجموعہ پر کرشن چند کے اثرات واضح نظر آتے ہیں لیکن یہاں بھی موصوف نے اپنا انفرادو امتیاز قائم رکھا ہے۔اس لئے افسانہ نگاری کی روایت میں ان کا نام بھی قدر و احترام سے لیا جاتا ہے۔اس سلسلے میں مشہور معروف ناقد جمشید قمر کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''غیاث احمد گدی نہ تو عہد ساز افسانہ نگاروں مثلاً پریم چند منٹو، بیدی، اور کرشن چندر کے زمرے میں آتے ہیں اور نہ ہی ان کا شمار رجحان ساز افسانہ نگاروں مثلاً قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین یا انور سجاد اور بلراج مین را میں کیا جاسکتا ہے

،البتہ ہم انہیں افسانہ نگاروں کی اس نسل میں یا گروہ سے متعلق ضرور سمجھ سکتے ہیں ۔جس نے آزادی کے بعد اردو افسانے کی دنیا میں اپنی انتھک فنی عرق ریزی اور بے پناہ تخلیقی لگن کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے سفر کو جاری رکھا اور اپنی گہری تخلیقی انہماک شراکت اور سرگرمی سے نہ صرف یہ کہ اپنی اہمیت جتائی بلکہ اس کے سرمایے میں قابل قدر افسانوں کی تخلیق سے بیش بہا اضافے بھی کئے ۔غیاث احمد افسانہ نگاروں کی اس نسل یا گروہ کے ایک ممتاز و منفرد رکن ہیں۔''

(غیاث احمد گدی کے افسانے تعارف انتخاب مرتبہ جمشید قمر،ص ۷)

غیاث احمد گدی کے افسانے فنی اعتبار سے اعلی درجہ کے حامل ہیں انہوں نے اپنی ادبی عمر میں زیادہ افسانے نہیں لکھے ہیں ۔ان کے کل تین افسانوی مجموعے ہیں اس کے علاوہ مقتدر رسائل و جرائد میں بھی کئی افسانے شائع ہوئے ہیں جنہیں موصوف نے یا دیگر ادب نوازوں نے یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع نہیں کیا ہے۔ جو ایک دقت نظر کا کام ہے۔

غیاث احمد گدی کے افسانوں میں وہی فضا اور ماحول ہے جہاں ان کی زندگی پھلی پھولی اور پروان چڑھی ہے۔ جیسے کوئلے کی کان اور کان میں کام کرنے والے مشقت اور استحصال سے چور مزدور اور افلاس سے پیدا ہونے والے مسائل اور ان مسائل کی زد میں آنے والی مزدوروں کی بیویاں وغیرہ۔موصوف کا سب سے مقبول افسانہ ''بابا لوگ'' میں بوڑھا انکل کا کردار افسانوں کی بھیڑ میں ایک مسیح کی حیثیت رکھتا ہے جس میں بلا کا جذبۂ ایثار ہے۔اس کردار کو مثالی کردار بنانے میں فنکار کو کس قدر تخلیقی کرب سے گذرنا پڑا ہوگا یہ کوئی ادیب ہی محسوس کر سکتا ہے۔

غیاث احمد گدی نے انگلو انڈین پر کئی افسانے لکھے ہیں ۔ان کے بیشتر کردار ایک دوسرے سے ملتے جلتے نظر آتے ہیں ۔جیسے بابا لوگ ،ڈورتھی جان سین ، پیاسی چڑیا ، بدصوت سیاہ صلیب اور صبح کا دامن وغیرہ ایک ہی پس منظر کے پانچ افسانے پہلے افسانوی مجموعہ میں موجود ہیں ۔غیاث احمد گدی کی ایک کہانی جس کا عنوان ڈورتھی جان سین ہے ۔ یہ بھی انگلو انڈین سماج کی ترجمان ہے۔کہانی بے حد اثر انگیز ہے ۔اس کہانی میں موصوف نے انسانی جذبات ونفسیات کے خوبصورت نقوش بہتر طریقے سے پیش کئے ہیں ۔اس کہانی میں افسانہ نگار نے آپ بیتی پیش کی ہے۔افسانے میں ٹی ۔ بی کے مرض میں مبتلا شوہر کو بچانے کی خاطر باوفا اور خدمت گار بیوی کی مسلسل جدوجہد کو سامنے لایا گیا ہے۔شوہر کی زندگی کی قومی امید میں وہ بے حد معاشی مجبوری کے پورے جذباتی منظر میں غیاث احمد گدی کی اپنی زندگی جلوہ گر ہے ۔ کیونکہ غیاث احمد نے خود مذکورہ حالات کا مقابلہ کیا ہے۔ جب غیاث احمد گدی کی بیگم بانو اس موذی مرض میں مبتلا

ہوئی تھی ۔اس کہانی کے متعلق جمشید قمر نے لکھا ہے :

'' کردار اور مقام کی ماہیت قلب کے باوجود ، افسانے کی بیانیہ ساخت میں موجود جذباتی بناؤ کی شدید صورت ان لمحوں کو یاد کرنے کی ایک تخلیقی کوشش بنتی نظر آتی ہے۔''

(غیاث احمد گدی کا تخلیقی ذہن ، چند گوشے: جمشید قمر آج کل دسمبر ۱۹۸۶ء)

غیاث احمد گدی کے بہت سے افسانوں میں جنس کی مختلف شکلیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔'' پیاسی چڑیا '' میں غیاث احمد گدی نے موجودہ دور کی مشینی اور شہری زندگی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے ایک کال گرل کی زندگی پیش کی ہے ۔عورت بیوی کے علاوہ مختلف شکلوں میں مرد کی خواہش نفس کو پورا کرتی ہے ۔اس کے علاوہ بھی موصوف کے کئی افسانے ہیں جو فکری اور فنی دونوں اعتبار سے انفرادو امتیاز کا درجہ رکھتے ہیں ۔

غیاث احمد کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی'' کی ایک اہم کہانی ''خانے تہہ خانے'' ہے ۔ یہ کہانی غیاث احمد گدی کے افسانوں میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے ۔ یہ افسانہ انسان کی نفسیاتی حقیقت نگاری کا نہایت بہترین نمونہ ہے یہ افسانہ علامتی انداز کا افسانہ ہے ۔کہانی کا مرکزی کردار ایک خاتون ہے جس کا نام کلاَ ہے ۔ جو اپنے شوہر کے ساتھ زندگی گذار رہی ہے لیکن ذہنی طور پر نا آسودہ معلوم ہوتی ہے ۔اس نا آسودگی کی جانب غیاث احمد گدی نے ایک نازک سا اشارہ کیا ہے جس سے اس کی نا آسودگی کا سبب واضح طور پر سامنے نہیں آتا وہ مبہم رہ جاتا ہے ۔جس کا احساس قاری کے ذہن پر دیر پا رہتا ہے اور قاری شروع سے آخر تک ذہنی کشمکش میں مبتلا رہتا ہے ۔اس کہانی میں گدی کو کہانی کے فن پر پورا دسترس حاصل ہے ۔ وہ بڑی ہنر مندی سے اپنے تجربات ومشاہدات پیش کرنے کا فن جانتے ہیں اس سلسلے میں محترمہ قمر جہاں کا اعتراف حقیقت ملاحظہ فرمائیں :

'' اس امر میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ غیاث احمد گدی کو صحیح معنوں میں کہانی کا ہنر معلوم ہے ۔ان کی زیادہ تر کہانیاں اچھی ہیں ۔لیکن ''خانے تہہ خانے'' اور کوئی روشنی کو اگر ہر قسم کے تعصّبات کی عینک کو اتار کر دیکھا جائے .... فن کا جو سلیقہ غیاث احمد گدی کو معلوم ہے وہ سلیقہ کسبی نہیں وہبی ہے ۔''

(معیار : ڈاکٹر قمر جہاں ،ص ۵۱)

غیاث احمد گدی کی افسانہ نگاری فنی اعتبار سے اعلیٰ ہے، پلاٹ سازی ، کردار نگاری ،فضا بندی ، مکالمہ نگاری وغیرہ میں موصوف کا ہنر درجہ کمال پر نظر آتا ہے ۔اسلوب و بیان اور معنی کے اعتبار سے بھی نہایت عمدہ فن کا مظاہرہ ہوا ہے ۔اسلوب سادہ اور سلیس ہے ۔لیکن ان میں معنی کا ایک سمندر موجزن معلوم ہوتا ہے ۔ان کے الفاظ میں گہرائی اور گیرائی دونوں ہے ۔اشارے اشارے میں وہ قاری کو اپنے خیالات کے ساتھ لیتے ہوئے چل

پڑتے ہیں ۔ ایسا لگتا ہے کہ قاری ان کے افسانوں کے ساتھ بندھ گیا ہو۔ ایسا تاثر مرتب ہوتا ہے اور قاری افسانوں کے ساتھ بندھا رہنے میں لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔ یہی فنکارانہ کمال قاری کو ذہنی طور پر قید کر لیتا ہے۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ غیاث احمد گدی کی افسانہ نگاری ایک اعلیٰ درجہ کی افسانہ نگاری ہے۔ انہیں اپنے امتیاز وانفراد کی بدولت بحثیت افسانہ نگار ایک مقام ومرتبہ حاصل ہے۔ ان کے افسانوں میں فکری اور فنی پہلو عمدہ ہیں۔ ان کے افسانے قاری کو حددرجہ متاثر کرتے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری واقعیت پسندی کی خوبصورت مثال ہے۔ ان کے افسانے ادب میں نہایت قیمتی ہیں۔

Dr. Shaista
25/326
Near Railway West Cabin
Abu Bakar Nagar
Deoria - 274 001
(U.P)

Priya Rani Roy Degree College
Bairagania, Sitamarhi - 843 313
Run & Managed by Lord Buddha Peace Mission
Social Welfare Organisation
Bairagania, Sitamarhi (Bihar)
Regd. No. - 404/06/07
Affiliated to B. R. A. Bihar University
Muzaffarpur (Bihar)

Salient Features :

1. Permanent Affiliation in all subjects (Science, Arts & Commerce)
2. A team of experienced teachers for imparting education.
3. Free education for poor students.
4. Facilities of electicity, fan, and furniture along with girl's common room
5. Well equipped laboratory and a good library.
6. Splendid playground.
7. Drinking water points and toilets.
8. Centre for practical and various competitive examinations.

Prof. (Dr.) M. N. ROY — Secretary
Prof. ILLA ROY — Principal

ISSN :2582 -3612

ڈاکٹر شبنم بیگم

سوؔدا : ایک عظیم قصیدہ نگار شاعر

سوؔدا کا نام اردو قصیدہ نگاری کے آسمان پر شمس وقمر کی طرح تاب دار ہے۔ انہوں نے دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور اپنی استادی کا ثبوت فراہم کیا۔ لیکن قصیدہ بطور خاص ان کی شناخت بن چکا ہے۔ اردو قصیدہ نگاروں کی روایت میں انہوں نے سب سے زیادہ ۵۳/قصائد کہے ہیں۔ جس میں بادشاہ وقت کی مدح بھی ہے اور دینی ومذہبی قصائد اور ہجویات بھی ہیں۔ انہوں نے سرورِ کائنات ﷺ، حضرت علیؓ، محمد شاہ سرائے محمد شاہی، نواب حسن رضا خان، سیف الدولہ احمد علی خان، مہربان خان، آصف جاہ نظام الملک، رچرڈ جانسن (ریزیڈنٹ) طبیب میر محمد کاظم اور ہجویات میں تضحیکِ روزگار وغیرہ کو موضوع سخن بنایا ہے اور اردو ادب کو دیگر زبانوں کے مقابلے بلند قامت اور افتخار بخشا ہے۔ ان قصائد میں مذہبی قصیدے فقید المثال ہیں۔ موصوف نے اردو قصیدہ کو جو معیار عطا کیا ہے اس کی مثال پوری اردو دنیا میں موجود نہیں ہے۔ اس سلسلے میں شیخ چاند کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ''قصائد سوؔدا پر اس تفصیلی بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کو قصیدہ نگاری میں غیر معمولی قدرت ومہارت حاصل تھی۔ مصحفی نے اس کے متعلق بالکل سچ لکھا ہے کہ ''نقاش اول نظم قصیدہ در زبان ریختہ اوست'' حالا ہر کہ گوید پیرو متبعش خواہد بود'' اس نے قصیدے میں متنوع مضامین وموضوعات کو داخل کیا اور داخلی وخارجی شاعری کا کمال دکھایا۔ حکیمانہ خیالات اور اخلاقی تعلیمات کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کے قصیدوں میں لفظی، نحوی، بیانی اور عروضی خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ہر چیز ہمارے قدیم معیار پر پوری اترتی ہے۔ اس کے قصائد کا جواب ہماری زبان میں موجود نہیں۔ اور اب چوں کہ زمانے کا مذاق بدل گیا ہے اس لئے توقع نہیں کہ اس رنگ میں آئندہ بھی اس کا کوئی جواب پیدا ہو۔''
>
> (اردو قصیدہ نگاری : شیخ چاند ص ۸۰)

سوؔدا نے قصیدہ میں جو راہ اختیار کی وہ فارسی زبان کے قصیدہ کے مزاج سے ہم آہنگ ہے صرف زبان کا فرق نظر آتا ہے۔ بلکہ یہ حقیقت بھی عیاں ہے کہ سوؔدا نے فارسی قصائد کو سامنے رکھ کر اردو

قصائد کہے ہیں یہاں تک کہ فارسی قصائد کی زمین بھی نہیں تبدیل کی ہے اس طرح انہوں نے فارسی اساتذہ کی تقلید کی۔ اور صنف پر اپنا قبضہ جمالیا۔ ساتھ ہی ساتھ انہیں ایک نیا لبادہ بھی عطا کیا۔ جو فارسی سے مختلف بھی ہے اور منفرد بھی۔ اس سلسلے میں محمود الٰہی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''اس طرح سوداؔ کا سلوک قصیدے کے ساتھ مثبت بھی رہا اور منفی بھی۔ انہوں نے اس صنف کو چمکایا بھی اور بگاڑا بھی۔ تشبیب و گریز کے انہوں نے جو جو کمالات دکھائے ہیں واقعی وہ اکثر فارسی شعراء سے آگے نکل گئے ہیں۔ لیکن ان کے برتنے میں اتنی پابندی شدت اور انہماک سے کام لیا کہ بعد کے قصیدہ نگاروں کے لئے اس روش سے ہٹنا ممکن نہ ہو سکے اگر وہ قصیدے کی کوئی الگ راہ سوداؔ سے ہٹ کر نکالتے ہیں تو ان کے قصیدے بے مزہ اور پھیکے معلوم ہوتے۔''

(اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ : ڈاکٹر محمود الٰہی ص ۱۹۰۔۱۹۱)

واضح ہے کہ سوداؔ نے قصیدہ کو جس بلندی پر پہنچا دیا اس سے اوپر کی پرواز سے قصیدہ بالکل مصنوعی معلوم ہونے لگا۔ اس سے قصیدہ کا نقصان بھی ہوا ہے۔ اس صنف کی اہمیت کم ہوتی گئی اور یہ فن بالکل محدود ہو کے رہ گیا۔ جس سے زبان و ادب کا بھی نقصان ہوا ہے۔

سوداؔ کے قصائد فکری اور فنی اعتبار سے لاجواب ہیں۔ سوداؔ نے اپنے قصیدوں میں تشبیہات و استعارات کا بہترین استعمال کیا ہے۔ اس طرح موصوف کے قصائد میں بے شمار نادر تشبیہات داخل ہو گئے۔ جو زبان و ادب کے لئے سرمایہ ہیں۔ سوداؔ کے قصائد میں مضمون آفرینی، تخیل کی بلند پروازی اعلیٰ درجہ کے معلوم ہوتے ہیں۔ ان قصیدوں سے پہلے ایسے نادر نمونے اردو زبان میں عنقا تھے۔ موصوف معمولی سی معمولی بات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ بات بالکل الگ اور مؤثر ہو جاتی ہے۔ سوداؔ نے اپنے قصائد کے مطالع میں اپنا پورا زورِ قلم لگا دیا ہے۔ اس لئے ان کے قصائد کا پہلا شعر فقید المثال ہوتا ہے۔ چند قصائد کے مطلع ملاحظہ فرمائیں۔

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زنّار تسبیح سلیمانی

اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل
تیغ اُردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل

ISSN :2582 -3612

سوائے خاک نہ کھینچوگا منتِ دستار
کہ سر نوشت لکھی ہے میری بخطِ غبار

ہے پرورشِ سخن کی مجھے اپنی جاں تلک
جو شمع زندگانی ہے میری زباں تلک

مستغنیٔ ذاتی نہ مہوّس کی ہو تسخیر
معدن ہے جہاں سونے کا واں خاک ہے اکسیر

مرغ معنیٰ اگر صید پر اپنا ہو خیال
عرش پرواز ہو کھل نہ سکیں اس کے بال

کہے ہے کاتب دوراں سے منشیٔ تصویر
سمجھ کے دفترِ قسمت کیا کر اب تحریر

صباحِ عید ہے اور یہ سخن ہے شہرۂ عام
حلال دخترِ زر بے نکاح و روزہ حرام

برج حمل میں بیٹھ کے خاور کا تاجدار
کھینچے ہے اب خزاں پہ صفِ لشکرِ بہار

فلک بتادے مجھے اپنے عیش و غم کی طرح
کرم کی کون طرح کون سے ستم کی طرح

سوداؔ کے قصائد میں تشبیب کے اشعار اتنے جاندار اور شاندار ہوتے ہیں کہ یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ تشبیب و گریز کے لئے قصیدے لکھے گئے ہیں یا قصیدے کے لئے تشبیب و گریز لکھے گئے ہیں۔ موصوف نے تشبیب میں اپنا جس قدر خون جلایا ہے اور ایک ایک لفظ اس قدر ترتیب و تنظیم سے پیش

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

کئے ہیں کہ اس کی گھن گرج پورے قصیدے پر طاری رہتی ہے۔ سوداؔ کے بہاریہ اشعار میں غضب کی شگفتگی ہے۔ انہوں نے خیالی اور تصوراتی چیزوں کی اتنی حسین تصویریں پیش کی ہیں کہ اس پر حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند بہاریہ اشعار پیش کر دئے جائیں تا کہ اس کی خوبیاں بروئے کار آجائیں اور میری بات مدلل ہوجائے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

چمن میں سبزہ روئیدہ پر نہیں شبنم
ہوئے ہیں خسروِ گل پر نثار لالہ قلم

ادھر کو لعل کے ساغر میں ارغوانی مَے
بھرے ہیں لالۂ حمرانے ہو خوش و خرّم
مہک رہا ہے ادا سے ادھر کو نافرماں
لے اپنے ہاتھ نزاکت سے طرۂ نیلم

بہاریہ اشعار کے بعد سوداؔ کے قصائد میں مکالماتی انداز بھی نہایت دلفریب ہے۔ موصوف نے بسنت خاں کی مدح میں جو مکالماتی انداز اختیار کیا ہے وہ قابلِ دید ہے۔ اسی طرح آصف الدولہ کی مدح میں بھی جو قصیدہ کہا ہے اس میں بھی ''خوشی'' سے سوال جواب کا یہ خوشگوار منظر ملاحظہ فرمائیں۔

فجر ہوتے جو گئی آج مری آنکھ چھپک
دی وہیں آکے خوشی نے دردِ دل پر دستک

پوچھا میں کون ہے بولی کہ میں وہ ہوں غافل
نہ لگے شوق میں جس کے کبھو شائق کی پلک

ہے خوشی نام میرا میں ہوں عزیز دلہا
زندگانی کی حلاوت ہے جہاں میں مجھ تک

کھول آغوش دل اور لے مجھے جلدی ناداں
پھیر خدا جانے یہ دن کب تجھے دکھلائے فلک

سن کے یہ مژدۂ جاں بخش جو میں کھولی آنکھ
اشعۂ نور کی مجھ کو نظر آئی جھلک

غرض اس شکل سے آئی جو نظر وہ کافر
کہا دل کی طرف دیکھ کے اللہ معک

ناگہ اس شوخ نے مجھ سے یہ کہا اے سوداؔ
اب تو شیشہ مئے اندوہ کا پتھر سے ٹپک

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سوداؔ کی قصیدہ نگاری میں وہ تمام اجزائے ترکیبی موجود ہیں۔ جو قصیدہ کے لئے لازم ہیں۔ تمام اجزائے ترکیبی کو برتنے میں سوداؔ نے اپنی قادرالکلامی اور فنی مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے اور خیال وفکر کی بلند پروازی کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔ اور پرشکوہ الفاظ کا ایک ذخیرہ جمع کر دیا ہے جس سے قصیدہ کا فن موسوم ہے۔ اس طرح سوداؔ کی قصیدہ نگاری اردو ادب میں اپنی مثال آپ رکھتی ہے۔ اس درجہ کا دوسرا کوئی قصیدہ نگار اردو میں قصیدہ کہنے سے قاصر ہے۔ میں اخیر میں ڈاکٹر ایم۔ کمال الدین کے اقتباس اپنی بات ختم کرتی ہوں :

''شمالی ہند میں سوداؔ نے اردو قصیدہ کو شاندار ترقی عطا کی۔ سوداؔ کے مقابلے میں متقدمین کے قصیدے کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ سوداؔ نے کیسے اتنے زوردار اور معیاری قصیدے کہے۔ یک بہ یک اردو زبان میں اتنی توانائی کہاں سے آگئی۔ اس نے نہ صرف قصیدے کو ترقی ہی دی بلکہ اس کو معراج کمال عطا کیا اور سب سے بڑا قصیدہ نگار بن بیٹھا۔''

(قصیدہ کا فن اور اردو قصیدہ نگاری : ڈاکٹر کمال الدین ص ۱۲۱)

Dr. Shabnam Begum
Asstt. Teacher
Urdu Middle School
Barhampur, Chapra

ڈاکٹر مرزا صبا عالم بیگ

سعادت حسن منٹو : ایک منفرد افسانہ نگار

سعادت حسن منٹو ایک بڑے افسانہ نگار تسلیم کئے جا چکے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری نہایت متنازعہ رہی ہے۔ انہوں نے جو بھی افسانے لکھے ان میں جنسی پہلو نہایت شدت کے ساتھ پیش کیا اور یہی پہلو ان کی افسانہ نگاری میں منفرد رنگ بھرتا ہے۔ اسی وجہ کر ان کی افسانہ نگاری اپنے دور میں موضوع بحث رہی ہے۔ اس سلسلے میں منٹو پر کئی مقدمات بھی چلائے گئے جس کا جواب منٹو نے بہت صبر و استقلال کے ساتھ دیا اور اپنی بات پر قائم بھی رہے۔ موصوف کی دلیل تھی کہ میں جس موضوع پر افسانہ لکھتا ہوں یا میرے افسانے میں جو پہلو نہایت شدت کے ساتھ واضح ہوتا ہے۔ وہ ہمارے سماج میں ہو رہی برائیوں کی دین ہے۔ اور میں حقیقت بیان کرتا ہوں، میں حقیقت سے چشم پوشی نہیں کر سکتا، مجھے اپنے سماج سے گہرا لگاؤ ہے۔ اس لئے میں سماج کی برائیوں پر پردہ نہیں ڈالتا بلکہ انہیں کورید کر صاف کرنے کی کوشش کرتا ہوں یا ان برائیوں کی طرف لوگوں کا ذہن مبذول کر کے ان کی روک تھام کرنے کی ہمدردانہ کوشش کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں منٹو کا موقف اور بیان ملاحظہ فرمائیں :

> ''زبان کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں۔ اگر آپ اس سے واقف ہیں تو میرے افسانے پڑھئے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں، جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، وہ دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔''
>
> (بحوالہ سعادت حسن منٹو مصنفہ پریم گوپال متّل ص ۱۶)

سعادت حسن منٹو کا مندرجہ بالا بیان حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ ہمارا سماج صدیوں سے ان برائیوں میں ملوث رہا ہے۔ اہل قلم اور دانشوروں نے اس طرف سے چشم پوشی کا رویہ قائم رکھا ہے۔ ان موضوعات پر زبان بند رکھی ہے۔ لیکن ادب چونکہ ہمارے سماج کی آئینہ داری کرتا ہے اس لئے ان برائیوں کا ذکر ہمارے اردو ادب میں ہونا بھی لازم ہے۔ اسی لئے سعادت حسن منٹو کی یہ ہمدردانہ کوشش ہے۔ انہوں نے ان موضوعات کو اپنے افسانہ میں جگہ دی تا کہ ان برائیوں سے سماج کو آزاد کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں مشہور و معروف ناقد وارث علوی کا تجزیہ ملاحظہ فرمائیں :

> ''جنس کی کارفرمائی منٹو کے بیشتر افسانوں میں نظر آتی ہے۔ لیکن اس میں جنس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ کرداروں کی شخصیت کے دوسرے پہلو بھی سامنے آتے ہیں اور ان کے نیک و بد انجام میں دوسرے جذبات بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ مثلاً طوائفوں پر ان کی جنتی کہانیاں ہیں۔ ہم انہیں جنسی کہانیاں نہیں کہہ سکتے۔ حالانکہ جنس طوائف کی زندگی اور کردار کا حاوی جزو اور اس کا پیشہ ہے۔ لیکن ان افسانوں کے مرکز میں یا تو مامتا کا جذبہ ہے یا بے بسی اور تنہائی کا، یا بے لوث خدمت گزاری کا، یا پھر طوائف کے کردار کے ایسے پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔ ان افسانوں میں دلچسپی کا مرکز جنس نہیں بلکہ دوسرے نفسیاتی اور اخلاقی عوامل ہیں۔''
>
> (منٹو ایک مطالعہ مصنفہ وارث علوی ص ۶۷)

سعادت حسن منٹو کے افسانے میں جنسی پہلو ایک حقیقت بیانی کے طور پر نظر آتا ہے۔ جنس کے علاوہ ان کے افسانوں میں فکری اور فنی پہلو بھی نہایت عمدہ اور بالیدہ ہیں۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی ان کے افسانوں میں ایک دلکش قوت ابھرتی ہے۔ جو قاری کو متاثر بھی کرتی ہے۔ اور افسانوں کی مقبولیت کی ضامن بھی بنتی ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے بھی ان کے افسانوں میں تنوع ہے۔ ان کے افسانوں میں عشق و رومان، مذہب و سیاست نفسیاتی حقیقت بیانی، جرأت آموز حق پرستی، طنز و ظرافت اور تلخ واقعات کا انکشاف یعنی اچھے بُرے تمام موضوعات ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں مشہور و معروف ناقد وقار عظیم کا تجزیہ ملاحظہ فرمائیں :

> ''منٹو کو اس کی حقیقت نگاری، اس کی نفسیاتی موشگافی، اس کے دور بین و دور رس نگاہ، اس کی جرأت آمیز اور بے باکانہ حق گوئی، سیاست، معاشرت اور مذہب کے اجارہ داروں پر اس کی تلخ لیکن مصلحانہ طنز اور اس کی مزے دار فقرہ بازیوں کی وجہ سے سراہا گیا ہے۔ اور سیاسی مذہبی، معاشرتی اور ان سب سے بڑھ کر جنسی زندگی پر اس نے مخصوص اور منفرد انداز میں نظر ڈالی ہے۔ اس پر اُسے مطعون کیا گیا ہے۔ اور اس داد و تحسین اور ہجو و تضحیک میں لوگوں کا جو رویہ رہا ہے۔ اُسے میں حق پسندی اور توازن بھی ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ افراط و تفریط کا جذب غالب نظر آتا ہے۔ تنقید و تبصرہ کے اس سارے کھیل میں جو برسوں سے منٹو کی زندگی کے افسانوں کے محور پر کھیلا جا رہا ہے، منٹو ایک مثالی ہیرو بھی نظر آتا ہے اور مثالی ولین بھی............ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے

تو ان دونوں طرح کے دیکھنے والوں کو جذباتی شدت پسندی نے اصل حقیقت
تک پہنچنے اور اس کے کھوٹے کھرے کو پہچاننے کا موقع نہیں دیا۔''

(داستان سے افسانہ تک مصنفہ وقار عظیم ص ۲۸۲)

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہے کہ سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری مختلف بنیادوں پر اپنے ہم عصروں میں اور افسانہ نگاری کی روایت میں منفرد اور امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔منٹو افسانہ نگاری میں ایک الگ راہ پر گامزن نظر آتے ہیں۔ان کا یہی رویہ انہیں افسانہ نگاری کے سفر میں اپنی شناخت قائم کراتا ہے۔ان کے افسانوں میں تصنع اور بناوٹی پہلو کا گمان محال نظر آتا ہے۔منٹو کا اسلوب نہایت سہل، سادہ اور سلیس ہے۔منٹو جو کچھ دیکھتے ہیں اُسے بغیر کوئی رنگ و روغن کی آمیزش کئے صفحہ قرطاس پر رقم کر دیتے ہیں۔
اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ منٹو کے افسانوں کے ایک دو اقتباسات نقل کر دئے جائیں تا کہ افسانہ کے فکری وفنی پہلو کے ساتھ اسلوب بھی واضح ہو جائے:

''منگو کوچوان اپنے اڈّے میں بہت عقلمند سمجھا جاتا تھا گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا۔لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔اڈے کے تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے۔استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب استاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اس نے گاماں چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دیکر مدبرانہ انداز میں پیش گوئی کی تھی، دیکھ لینا چودھری، تھوڑے ہی دنوں میں اسپین میں جنگ چھڑ جائے گی'' اور جب گاماں چودھری نے اس سے پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو استاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا تھا ''ولایت میں اور کہاں'' اسپین میں جنگ چھڑی اور جب ہر شخص کو اس کا پتہ چل گیا تو اڈے میں جتنے کوچوان حلقہ بنائے حقہ پی رہے تھے دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے۔''

(افسانہ نیا قانون (ابتدائیہ)

''جب گورے نے بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رخ بچا کر سگریٹ سلگا رہا تھا مڑ کر تانگے کے پائیدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو اور اس کی

نگاہیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولہ بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اترنے والا تھا۔اپنے سامنے کھڑے گورے کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے وجود کے ذرے ذرے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلوں پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا ہے گویا وہ استاد منگو کے حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگریٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا ''جانا مانگتا یا پھر گڑبڑ کریگا۔''

(افسانہ نیا قانون (اختتامیہ)

سعادت حسن منٹو کے تمام افسانوں کی ابتدا اور اختتام اسی انداز کے تاثر مرتب کرتے ہیں جن سے دلکشی اور تجسس کا عنصر خود بخود ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔یہ موصوف کی فنی گرفت کا مترشح بھی ہے اور عظیم و منفرد افسانہ نگار ہونے کی دلالت بھی کرتا ہے۔اسی وجہ کر مشہور و معروف ناقد حسن عسکری نے منٹو کو موضوع اور ہیت کا پیشوا قرار دیا ہے۔اس کے علاوہ کردار سازی، منظر طرازی، قصہ کی سحر بیانی، داخلی اور خارجی نفسیات، مکالمہ نگاری اور پلاٹ سازی اپنے کمال پر ہوتی ہے۔
خلاصہ کلام یہ کہ منٹو کا شمار عظیم افسانہ نگاروں کی فہرست میں کیا جاتا ہے۔اور ان کے افسانے کسی بھی زبان و ادب کے افسانوں سے کمتر قرار نہیں دئے جا سکتے ہیں۔کسی بھی زبان و ادب کے ادبی اقدار و معیار ان کے افسانوں کے اقدار و معیار سے بالاتر نہیں ہیں۔اس سلسلے میں مشہور و معروف ناقد پروفیسر وہاب اشرفی کے جملے پر اس مضمون کا اختتام کرتا ہوں:

''منٹو ایک عظیم افسانہ نگار ہے۔جس کا موازنہ کسی بھی بڑے عالمی سطح کے فکشن نگار سے کیا جاسکتا ہے۔''

(تاریخ ادب اردو (جلد دوم) مصنفہ وہاب اشرف ص ۸۷۱)

Mirza Saba Alam Beg
Asstt. Professor
S. M. Z. A. T. T. College
Bahera, Darbhanga

ڈاکٹر دل آرا خاتون

پریم چند کی افسانہ نگاری

پریم چند کی ادبی زندگی کا آغاز بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ان کی پہلی کہانی ''دنیا کا سب سے انمول رتن زمانہ'' کانپور میں (۱۹۷۰ء) میں شائع ہوئی۔ان کے افسانوی مجموعے اس طرح ہیں۔''سوز وطن'' (۱۹۰۸ء) ''پریم پچیسی''(۱۹۱۴ء) ''پریم بتیسی'' (۱۹۲۰ء) ''خاک پروانہ'' (۱۹۲۸ء)''خواب وخیال''(۱۹۲۸ء)''فردوس خیال''(۱۹۲۹ء)''پریم چالیسی''(۱۹۳۰ء)''آخری تحفہ'' (۱۹۳۴ء)''زادراہ'' (۱۹۳۶ء) ''دودھ کی قیمت'' (۱۹۳۷ء) اور''واردات'' (۱۹۳۷ء) افسانوی دنیا میں پریم چند کا یہ اختصاص رہا کہ انہوں نے ابتدا ہی سے اپنی کہانیوں میں سماجی، سیاسی اور عصری حالات کی پیش کش پر خصوصی توجہ دی۔اس سلسلے سے پریم چند کا نظریہ ملاحظہ کیجئے :

> ''میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدہ یا تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں۔اس میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر واقعہ کے اظہار کے لئے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم ہی نہیں اٹھتا،لیکن کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا جب تک کہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔''

(پریم چند کے خطوط، مکتبہ جامع ، جون ۱۹۶۸ء،ص-۳۰۱)

پریم چند کے سلسلے سے یہ کہا جائے گا کہ وہ پہلے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے شہری زندگی کے علاوہ دیہاتی زندگی کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ مطلب یہ کہ سماجی حقیقت کو اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر طشت ازبام کیا۔ یا یوں کہیں کہ پریم چند نے اردو افسانوی ادب کو سماجی سروکار سے جوڑنے کا کارنامہ انجام دیا۔اس سلسلے سے پروفیسر لطف الرحمٰن رقم طراز ہیں :

> ''میرے نزدیک پریم چند ایک مکمل اور بھرپور سچے فنکار تھے جنہوں نے فنکارانہ امکانات کی حدوں تک جا کر زندگی اور کائنات کے باہمی ربط و تعلق اور کرب و عمل کا تخلیقی اظہار کیا ہے۔یہی پریم چند کی عظمت و بلندی ہے۔آپ ان کی کوئی تخلیق پڑھیں محسوس کریں گے کہ انہوں نے ہمیشہ ظالم کے مقابلہ میں مظلوم سرمایہ دار

ISSN :2582 -3612

> کے مقابلہ میں مزدور امیر کے مقابلہ میں غریب زمیندار کے مقابلے میں پست کا ساتھ دیا ہے۔ان کی ہمدردیاں قاتلوں کے ساتھ نہیں مقتولوں کے ساتھ رہی ہیں اور یہ بھی ایک عظیم ادیب کی منفرد پہچان ہے۔اس لئے کہ ادیب تخلیقی مرحلوں میں اپنے تعصّبات و تاثرات سے بلند ہوتا ہے۔یعنی مصلحت کوشی بوالہوسی اور خودغرضی کی تاریکیوں سے بلند ایک نشاط روحانی کی منزل میں ہوتا ہے۔ جہاں ساری دنیا کا دکھ اس کا اپنا دکھ بن جاتا ہے...... پریم چند پر کوئی لیبل نہیں لگایا جاسکتا۔وہ ایسے ادیبوں میں ہیں جو کسی لیبل سے بے نیاز ہوتے ہیں۔''

(رسالہ جہانِ اردو، ڈاکٹر مشتاق احمد،ص-۵۹-۵۸)

پریم چند نے اپنے افسانوں میں جہاں نچلے طبقے کو جگہ دی وہیں تاجر، مہاجن، ملا، پنڈت، راجے مہاراجے، ڈاکٹر، وکیل اور سیاسی رہنماؤں کے کردار کو بھی اہمیت عطا کی،لیکن پریم چند جس عہد میں کہانیاں لکھ رہے تھے اس وقت مزدوروں، کسانوں کے مسائل سے اَن دیکھی نہیں کی جاسکتی تھی، لہٰذا پریم چند نے بھی اپنے زمانے کے تقاضے کے تحت سماج کے پسماندہ طبقے کی زندگی اور ان کے مسائل کو سمجھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس سلسلے سے پروفیسر قمر رئیس فرماتے ہیں :

> ''پریم چند نے اردو زبان و ادب اور اس کے سرمایہ فکر کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔انہوں نے زندگی اور کائنات کو فکر و نظر کے مروجہ زاویوں سے ہٹ کر ایک نئی سطح سے دیکھا۔ ایک ایسی بلند سطح سے جہاں سے زندگی اور انسانیت کا سمندر کروٹیں لیتا اور ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ وہ پہلے ادیب ہیں جن کی نظریات انسانی کے اس انبوہ میں ان مجبور اور مقہور انسانوں تک پہنچی جو قدرت کے دوسرے بے زبان مظاہر کی طرح صدیوں سے گونگے اور بے زبان تھے۔ پریم چند نے انہیں زبان دی۔''

(پریم چند کی روایت اور معاصر اردو فکشن، ایوان اردو دہلی، نومبر ۲۰۰۶ء،ص-۵)

اس سلسلے سے افسانہ ''آخری تحفہ''، ''کفن''، ''دودھ کی قیمت''، ''معصوم بچہ''، ''قاتل''، ''دو بیل''، ''زیور کا ڈبہ''، ''آشیانہ برباد''، ''زادراہ''، ''عیدگاہ''، ''ریاست کا حیوان''، ''گلی ڈنڈا''، ''وفا کا دیوتا''، ''نئی بیوی'' اور ''پوس کی رات'' کافی اہمیت رکھتا ہے۔افسانہ ''آخری تحفہ'' میں سودیشی تحریک اور چرخہ تحریک کے حوالے سے پریم چند نے کئی اہم نکتے پیش کئے ہیں وہیں وطن دوستی کے تعلق سے بھی اپنے نظریۂ فکر سے قارئین کو روبرو کرایا ہے۔افسانہ ''قاتل'' میں گاندھی جی کے نظریہ کی پیش کش پر خصوصی توجہ دی

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

گئی ہے۔ افسانہ ''دوبیل'' میں جانوروں کو کردار بنا کر انسانی جذبوں کی اہمیت کو پیش کیا گیا ہے۔ ''زیور کا ڈبہ'' میں انسانی اقدار اور اخلاقیات کی پامالی جیسے اہم معاشرتی مسائل پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔

جب ہم پریم چند کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہیں تب یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ انہوں نے بچوں کی نفسیات کی بہترین عکاسی بھی کی ہے۔ اس سلسلے سے افسانہ قزاقی کا بچہ، بوڑھی کاکی کی لاڈلی اور عیدگاہ کا حامد یہ ایسے معصوم کردار ہیں جن کے ذریعہ پریم چند نے معصوم ذہنوں میں روشنی کے چراغ جلائے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ پریم چند نے اپنے بیشتر افسانوں میں بچوں کے نفسیاتی عمل اور ردعمل کے بعض دلکش مرقعے پیش کئے ہیں۔ افسانہ ''عیدگاہ'' کا کردار حامد کے سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''کیا عیدگاہ کسی میلے کی کہانی ہے؟ یا ایک بچے کے چند پیسوں سے چمٹا خرید لینے پر اس کہانی کی دنیا ختم ہو جاتی ہے؟ آخر پریم چند نے ایک ایسا ماحول کیوں منتخب کیا جہاں نہ باپ ہے، نہ ماں اور بھائی بہن بھی نہیں ایک کم عمر بچہ ہے اور بوڑھی نڈھال اس کی دادی۔ پریم چند ایک غریب زدہ قدرت کا ستم ظریفی کا شکار اور حالات کی مخالف ہواؤں کے تھپیڑے کھانے پر مجبور حامد کو کسی دوسرے طبقے اور عمر کے فرد کے مقابلے میں زیادہ ہوش مند، ذمے دار، معاملہ فہم، انسانی ہمدردی سے لبالب اور نئے خوابوں کا تمنائی مانتے ہیں۔ ایک نئے بننے والے سماج کا نمائندہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ پریم چند میلے ٹھیلے کی کہانی بیان کر کے اصل میں نئی دنیا کے اس نوخیز شہزادے کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔''

(رسالہ جہانِ اردو، ڈاکٹر مشتاق احمد، جنوری تا مارچ ۲۰۱۰ء، ص-۹۶-۹۵)

افسانہ ''کفن'' میں پریم چند کا نظریہ حیات اور فنی اختصاص بام عروج پر نظر آتا ہے۔ اس افسانے میں پریم چند نے مادھو اور گھیسو کو مجرم کے طور پر تو پیش کیا ہے، لیکن ان کے عوامل اس طرح ظاہر کئے ہیں کہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں کردار اپنی مجرمانہ ذہنیت کے لئے تنہا ذمہ دار نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی اس ذہنیت کے لئے معاشرہ زیادہ ذمہ دار ہے۔ مختصر یہ کہ پریم چند نے ان کرداروں کی سائیکی کا رشتہ معاشرتی عوامل اور تحرکات سے جوڑ کر جس طرح افسانے میں پیش کیا ہے اسے فنکاری کا اعلیٰ نمونہ کہا جائے گا۔ اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''یہ دونوں کردار طبقاتی زندگی کے المیہ کو لیے اور اپنی نفسیاتی کیفیتوں کے ساتھ کیرکٹر بن گئے ہیں اس لئے کہ اپنے کردار کی نہیں بلکہ اپنی شخصیتوں کو شدت سے محسوس بناتے ہیں۔ ایسے المیہ کرداروں کی اندرونی، ویرانی، غیر معمولی ہے۔ کرداروں کے عمل سے اندرونی، ویرانی (Havolc) کا جھٹکا

غیر معمولی ہے۔ یہ اردو کا شاہکار ہے۔ پریم چند نے انسانی فطرت کی جس طرح نقاب کشائی کی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ کفن فنکار کے وژن اور فنکارانہ دروں بینی کا ایک ناقابل فراموش نمونہ ہے۔''

(پریم چند: فکشن کے فنکار، پروفیسر شکیل الرحمٰن، ص ۱۳۴-۱۳۳)

پریم چند نے اپنے افسانوں ''وفا کی دیوی''، ''سوتیلی ماں''، ''راہِ نجات''، ''ستی''، ''حج اکبر'' اور ''پوس کی رات'' میں عورتوں کے کردار کے ذریعہ معاشرتی مسائل، موجودہ اقدار اور طبقاتی زندگی کے ہنگامی لمحات کی بہترین عکاسی کی ہے۔ مختصر یہ کہ پریم چند کے سلسلے سے یہ بات واضح ہے کہ وہ واقعات کی پیشکش میں حقیقت پسندی کا بہترین ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اس کی خاص وجہ ہے کہ پریم چند کے لئے معاشی بدحالی اور اخلاقی زوال کے پیش نظر انسانی دوستی کے جذبے کو ابھارنا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے کی نسوانی کردار متوسط طبقے کی کھوکھلی زندگی اور صنعتی عہد کی آلوگیوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس ضمن میں پریم چند داد کے مستحق ہیں کہ وہ عورتوں کے جسمانی اخلاقی وجود کو سامنے لانا خوب جانتے ہیں اسی لئے ان کے افسانے کی نسوانی کردار اپنے حسن، اپنی بدصورتی اور شخصی خوبیوں اور خامیوں سے اپنی الگ شناخت رکھتی ہیں۔ اس سلسلے سے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ پریم چند کی نسوانی کردار حساس بھی ہیں۔ بے خوف بھی ہیں اور بے لوث محبت کرنا بھی خوب جانتی ہیں۔

تمام باتوں کے پیش نظر یہ کہنا درست ہوگا کہ پریم چند نے خواہ موضوعات کی پیش کش ہو یا اسلوب بیان دونوں اعتبار سے افسانوی ادب میں اپنے فنی اختصاص کا بہترین ثبوت فراہم کیا ہے۔ کیوں کہ جہاں ان کے افسانے موضوعات کی رنگارنگی کے حوالے سے اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں وہیں اسلوبیاتی اعتبار سے بھی ان کے افسانے اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے افسانے اسلوب کی مختلف جہت کا پتہ دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ چند افسانوں میں تجربہ اور تکنیک کی ہم آہنگی و جذبی کیفیت سے اسلوب میں تیکھا پن اور بلندی پیدا ہوتی ہے اور کچھ افسانوں میں علامتی سطحوں کے تصادم سے علامتی اسلوب خلق ہوا ہے اور نقطہ نگاہ کے تصادم سے اشاریت کا اسلوب جنم لیتا ہے۔ یہ تمام اسلوبیات پریم چند کے فنی اختصاص کا پتہ دیتے ہیں۔

Dr. Dil Ara Khatoon
Bankers Colony
Khwajepur Sadpura
P.o. Ramna, Muzaffarpur
(Bihar)

ڈاکٹر محمد نثار عالم

عبدالغفور شہبازؔ کی شاعری کے چند امتیازات

سید محمد عبدالغفور شہباز کی شناخت اُردو ادب میں محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ ان کی پیدائش ۱۸۵۷ء میں ریاست بہار کے ضلع نالندہ کے قصبہ سرمیرا میں ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم مظفر پور کے ضلع ہائی اسکول میں ہوئی۔ ۱۸۸۷ء میں انٹرنس کا امتحان نیشنل کالجیٹ پٹنہ سے پاس کیا۔ بی۔ اے کا امتحان ۱۸۹۱ء میں صحت کی خرابی کی وجہ سے نہ دے سکے اور یہیں تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ والد کا نام سید طالب علی تھا۔ والد کی نگرانی میں عربی، فارسی اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ان ابتدائی تعلیم کی ذمہ داری کو ایک برادرِ نسبتی خان بہادر سید عبدالعزیز نے اپنے کندھوں پر اٹھایا۔ جو مظفر پور میں سب جج تھے۔ عبدالغفور شہباز کی پہلی شادی صرف بیس برس کی عمر میں منشی داؤد علی کی دختر شمس النساء بیگم سے کردی گئی جو پٹنہ کے باڑھ ضلع میں رہتی تھیں۔ ٹھیک دس برس کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کی دوسری شادی اشرف زمانی بیگم سے ۱۸۹۸ء میں ہوئی جو دہلی کی رہنے والی تھیں۔ شہباز نے کلکتہ کے ایک اخبار ''دارالسلطنت'' کے اِڈیٹر کا عہدہ سنبھالا کچھ دنوں کے بعد یہ اخبار بند ہوگیا۔ ایک اور اخبار ''نور بصیرت'' بھی ان کی ادارت میں نکلا تھا۔ انہوں نے ''جریدہ نمائش'' کے نام سے بھی ایک رسالہ نکال کر اس کی نمائش کرائی تھی جس کے بڑے چرچے ہوئے تھے۔ ۱۸۸۵ء میں نواب عبدالطیف خان بہادر جب بھوپال بحیثیت وزیر تشریف لے گئے تو انہوں نے شہباز کو اپنا پرسنل اسسٹنٹ رکھ لیا۔ ۱۵؍ جولائی ۱۸۹۷ء کو اورنگ آباد انٹرمیڈیٹ کالج میں علم طبیعات کے لکچرار ہوگئے۔ طب کی کئی انگریزی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کیا۔ انگریزی نظموں کو منظوم اردو نظم میں ترجمہ کیا۔ ۱۹۰۵ء میں نواب شاہ جہاں بیگم، ریاست بھوپال نے ان کو محکمہ تعلیمات کی نظامت کا عہدہ دیا۔ ان کا انتقال ۳۰؍ نومبر ۱۹۰۸ء کو کلکتہ میں ہوا۔

پروفیسر عبدالغفور شہباز بیک وقت شاعر، مترجم، صحافی، مرتب اور محقق بھی ہیں۔ ان کی شخصیت اپنے دور کے ایک نابغہ کی سی ہے۔ انہوں نے اردو ادب کی جس قدر خدمت کی ہے وہ لائق تحسین اور قابلِ قدر بھی ہے۔ ان کی شخصیت کی ہر جہت بے مثال اور لاجواب ہے۔ ان کی شخصیت مجموعی طور پر ایک دبستان کی سی ہے۔ انہوں نے اصناف شعری ونثری دونوں میں اپنی عدیم المثال صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ شہباز حالیؔ کی نیچرل شاعری سے بہت متاثر تھے اسی لئے انہوں نے غزل کے عوض نظم نگاری پر زیادہ توجہ دی ان کی

نظموں میں نیچرل شاعری کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ نظم نگاری میں وہ اکبرؔ الٰہ آبادی سے بھی متاثر نظر آتے ہیں ان کی نظموں میں طنز ومزاح اور بذلہ سنجی کے عنصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ وہ ایک وہبی شاعر ہیں۔ ان کی بسیار نویسی کا اندازہ ان کی تخلیقاتِ کلام ونثر سے لگایا جاسکتا ہے۔ ان کی شاعری میں مناظر فطرت، رموز فطرت، تجربات انسانی اور کوائف ذہنی پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے غزلیں بھی کہیں ہیں، لیکن غزلوں سے زیادہ ان کا فطری میلان نظم نگاری کی طرف ہے۔ ان کی نظمیں فکری اور فنی دونوں اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی حامل ہیں۔ ان کی شاعری کے متعلق ڈاکٹر محمد اختر الحسن کا خیال ملاحظہ فرمائیں :

> ''شہبازؔ ایک وہبی شاعر تھے۔ قدرت نے انہیں شاعری کی فطری صلاحیت سے مالا مال کیا تھا۔ نوعمری ہی سے انہوں نے شاعری شروع کردی تھی۔ اور جلد ہی ایک کامیاب شاعر ہوگئے۔
>
> شہبازؔ کی شاعری اعلیٰ درجہ کی شاعری ہے۔ ان کو تمام اصنافِ سخن پر یکساں کمال حاصل تھا۔ غزل ان کی محبوب صنف نہیں رہی ہے۔ پھر بھی انہوں نے اردو غزل گوئی کے روایتی انداز میں بہت سی غزلیں کہی ہیں۔ حروف تہجی کے اعتبار سے ایک مکمل دیوان مرتب کیا جاسکتا ہے ان کی منتشر غزلیں تقریباً چار سوابیات پر مشتمل ہیں۔
>
> شہباز کی حیات اور شاعری سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ نہایت بالیدہ شخصیت اور اعلیٰ انفرادیت کے مالک تھے، وہ اپنے عصری وادبی میلانات و رجحانات سے متاثر رہے اور شاعری میں جدت، ندرت اور انفرادیت کے قائل رہے ہیں۔''
>
> (عبدالغفور شہبازؔ: حیات اور ادبی خدمات مصنفہ ڈاکٹر اختر الحسن ص ۵۹۔۶۰)

کلام شہبازؔ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انہوں نے اردو شاعری کی تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف میں اپنی زود گوئی اور قادرالکلامی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کے کلام میں جیسا کہ پہلے ہی عرض کیا ہے، حالیؔ کی فکری جھلک اکبرؔ الٰہ آبادی کی بذلہ سنجی، سرسید احمد خاں کا مقصد اور اپنے عہد کے رجحانات بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے کلام میں واقعیت اور حقیقت ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ وہ مغربی تہذیب کی مثبت سوچ کو اپنانے میں گریز نہیں کرتے لیکن مغربی تہذیب کی تمام چیزوں کو وہ قبول نہیں کرتے ہیں۔ وہ جدیدیت کے خواہاں ہیں لیکن روایت اور دقیانوسی خیالات کے سخت مخالف بھی ہیں۔ ان کی نظموں کے عنوانات بھی جدت وندرت کا رنگ مترشح کرتے ہیں۔ اس طرح

شہبازؔ درمیانی راستہ اختیار کرتے ہیں۔وہ تعلیم نسواں کے حامی ہیں۔ انہوں نے سائنس اور سائنسی احسانات کوخلوص دل سے قبول کیا ہےان کی چند نظموں کے نام اس تعلق سے پیش کیئے جاسکتے ہیں۔جیسے مسواک ، زرچلتی ہوئی بائسکل ،جیبی گھڑی ،آموں کا بچپن ، ولایتی گریا جلیبی،مٹھائی کی مناجات ،شکر پنیراور مکری اور مکھی وغیرہ۔

شہبازؔ کی نظمیں جدت وندرت کی عکاس ہیں۔ان میں مناظر فطرت کے حسیں مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔قدرت کے نظارے ہمیں کیا پیغام دیتے ہیں۔ان کی زندگی میں کیا اہمیت ہے۔قدرت سے ہمیں کیا کیا تحفے حاصل ہوئے ہیں اوران کی قدرو قیمت کس قدر بے مول ہے۔ان تمام نکتوں کی طرف موصوف نے اپنی نظم میں وضاحت خاص کے طور پر روشنی ڈالی ہے۔شہبازؔ کی شاعری جدیدیت کی حامل ہے اورمروجہ طرز شاعری سے الگ ایک راہ پر گامزن نظر آتی ہے۔اس سلسلے میں سر شیخ عبدالقادر کے چند جملے ملاحظہ فرمائیں :

''ان نظموں کے بعض عنوانات عجیب ہیں۔مثلاً ''ولایتی گڑیا'' جلیبی ،مٹھائی کی مناجات،شکر پنیر،مکڑی اور مکھی ،جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نظیرؔ کی طرح پیش پا افتادہ چیزوں کواٹھا کران میں دلچسپیاں ڈھونڈنا اوران کے بیان میں مزاح کی چاشنی ملاکر ان کو معمولی سطح سے بلند کرکے دکھانا،شہبازؔ کے کلام کی خصوصیات تھی۔''

(تفریح القلوب مصنفہ سر شیخ عبدالقادر ص ۴)

عبدالغفور شہبازؔ کی شاعری خصوصاً نظم نگاری نہایت قدرواحترام کے بلند درجہ کی متقاضی ہے۔ ان کی چند مشہورومعروف نظموں کے نام ''آموں کا بچپن، سنگترے، بہار کی آمد آمد، آب رواں، صدائے بہار، بہار خمسہ، چقندری، شہد کی مکھی، وغیرہ ہیں۔ان نظموں سے ان کی منظری شاعری اور نیچرل شاعری کے علاوہ طنزوظرافت نگاری کی حسین دنیا کا بھی انکساف ہوتا ہے۔انہوں نے ادب طفلاں سے متعلق بے شمار سبق آموز نظمیں کہی ہیں۔جن میں جانوروں، دیوؤں، پریوں اور طوطا مینا کی کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔

عبدالغفور شہبازؔ اردو ادب میں بحیثیت نظم نگار نہایت قدرواحترام کے مستحق ہیں۔ان کی نظموں میں زندگی کے نامساعد حالات اوراس سے لڑنے کا حوصلہ ملتا ہے۔شہبازؔ کی نظموں کے موضوعات چاہے جمالیاتی، معاشرتی، سماجی اور سائنسی ہوں ہر جگہ انہوں نے واقعیت نگاری اور حقیقت نگاری کا حق ادا کردیا ہے۔ان کے کلام میں کہیں کہیں تمثیلی انداز بھی نظر آتا ہے۔یہ انداز بھی ان کے جدیدیت پسندی کا ترجمان ہے۔ایس۔ایم رضوان اللہ نے تو اپنی ایک کتاب کا نام شہباز: بہار میں نظم جدید کا بانی ہی رکھ کر مقالہ قلم بند کردیا ہے!

المختصر یہ کہ شہبازؔ کی نظموں میں موضوعاتی تنوع ہے۔انداز واسلوب میں سنجیدگی ومتانت، طفلانہ ہنسی، کہیں زیرلب مسکراہٹ، کہیں قہقہے، کہیں طنزوظرافت، کہیں ناصحانہ انداز بھی پایا جاتا ہے۔غرض ان کے کلام میں معنیٰ آفرینی لاجواب ہے۔اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظموں کے چند نمونے پیش کردئے جائیں تاکہ ان کے کلام کی جملہ خصوصیات واضح ہوجائیں اور میری بحث کو ثبوت فراہم ہوجائے۔

ہنر کی راہ میں بڑھو خرد کے بام پر چڑھو
بڑھو ، بڑھو ، بڑھو ، بڑھو
لگاؤ علم و فن سے لَو ہے جس میں مہر مہد کی ضَو
کتابیں یاں ہیں نو بہ نو
بڑھو، پڑھو، پڑھو، پڑھو

ایک نظم آئینہ تہذیب کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

گر کوٹ ہی ڈالا تو کیا پتلون ہی پہنا تو کیا
طر پوشی ہی اوڑھی تو کیا لٹکا ہی گر پھندا تو کیا
عینک لگائی اور نہیں گر دیدۂ بینا تو کیا
سب کچھ ہوا اپنا اور نہیں علم ہی اپنا تو کیا
شوکت اووَر کوٹوں کی کیا گر علم کی شوکت نہیں
ہوتی گدھے کی کھال سے ضخیم کی وہ ہیبت نہیں
جب لطف ہو، پھیلا ہوا چولہے کے پاس اخبار ہو
چھلتی ہو ترکاری جہاں واں علم کی تکرار ہو
سینا پرونا جہاں واں عقل کا اظہار ہو
ہر جا کتابوں لگا خلوت میں اِک انبار ہو
تعلیم نسوان پر اگر ہمت تری مائل رہے
پردہ جہالت کا سدا کیوں اس طرح حائل رہے
لمپوں میں ، ریڈنگ لمپ سے ہر شام یاں تو کام رکھ
پھر روشنیٔ علم سے روشن تو اپنی شام رکھ

اس طرح شہبازؔ کی سینکڑوں نظمیں موضوعاتی اعتبار سے زیر بحث لائی جاسکتی ہیں اوران کے فکرو

فن کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔غزلوں کے بھی چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

مانا یہ کہ دل ہے اس کا پتھر
پتھر میں نہاں شرر بھی ہوگا

مٹی ہی کا گھر نہ ہوگا برباد
مٹی ترے تن کا گھر بھی ہوگا

نہ مضطر جدا یار سے دل رہے گا
جو ہے اپنی تقدیر میں مل رہے گا

طاق دل میں جب چراغ شوق موسخنی جل گیا
کیا ہی انگاروں پہ لوٹا طورِ سینا جل گیا

عبدالغفور شہبازؔ کی شاعری کا کینوس نہایت وسیع ہے۔ان کی شاعری آفاقی میلان ومنہاج رکھتی ہے۔ان کے کلام اپنی جملہ خصوصیات کی وجہ سے عظیم شاعروں کے کلام کا مرتبہ اور مقام پانے کے حامل ہیں۔ان کے کلام میں ایک مکمل زمانہ اور تہذیب سانس لیتی نظر آتی ہے۔ان کی شاعری میں عصری حسّیت کے عمدہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔زمانے میں ہورہے تغیر وتبدل کا انہیں عرفان ہے۔ان کی حس تمام حالات وواقعات سے متاثر بھی ہوتی ہے۔ان کے کلام میں ذاتی معاملات کی جھلک کہیں کہیں دیکھنے کوملتی ہے۔موصوف اپنے تمام تر مشاہدات وتجربات کے اظہار کا وسیلہ شاعری کو ہی بناتے ہیں۔اس لئے ان کے کلام قاری کو متاثر کرتے ہیں اور وہ ہر خاص وعام میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

Dr. Md. Nesar Alam
+2 Teacher
Tilak Maidan Road
Muzaffarpur - 842 001

ISSN :2582 -3612

ڈاکٹر اصغری بیگم

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ بحیثیت سوانح نگار

اُردو زبان میں سوانح نگاری کے نقوش دکن کی مثنویوں میں دیکھے جاسکتے ہیں جو منظوم شکل میں موجود ہیں۔ یہ نقوش بادشاہوں، دینی پیشواؤں اور رسول اکرمؐ سے تعلق رکھتے ہیں۔ان چیدہ چیدہ نمونوں کے بعد سوانح کے نقوش شعرائے اُردو کے تذکروں میں نثری صورت میں خاکہ کی طرح بھی نظر آتے ہیں۔ جو عربی اور فارسی کے زیر اثر نمودار ہوئے ہیں۔اس کے بعد شعرائے کرام کے تعارفی نمونے سامنے آتے ہیں لیکن ان کا مقصد سوانح نگاری نہیں تھا۔اس طرح شاعروں کی حالات زندگی اور ان کے اشعار کی تشریح اس قبیل میں شامل ہوگئی۔یعنی سوانح ابھی تذکروں کے بطن میں نشو ونما پارہی تھی۔اس سلسلے میں پہلا تذکرہ ''نکات الشعراء'' ہے۔جس کی اشاعت کا سال ۱۷۵۲ء ہے۔اس سلسلے کی ایک اہم کڑی محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' بھی ہے۔یہاں تذکرہ نگاری مرقع نگاری کی راہ پر گامزن نظر آتی ہے۔سوانح نگاری کے ابتدائی دور میں سرسیّد احمد کی تخلیقات بھی نہایت اہم ہیں۔'' آثار الصنادید'' ۱۸۴۸ء خطبات احمدیہ ۱۸۷۰ء اور سیرت فریدیہ سوانح نگاری کے نقوش سے بھرے پڑے ہیں۔لیکن سوانح نگاری کا باقاعدہ آغاز حالیؔ کی حیات سعدی۔یادگار غالب اور حیات جاوید سے ہوتا ہے اور حالیؔ اس فن کے موجد قرار پاتے ہیں۔اس کے بعد شبلی نعمانی نے ''المامون'' سیرت النعمان'' اور ''الفاروق'' لکھ کر اس فن کو عام کردیا۔اس کے بعد سوانح نگاری اردو میں ایک اہم صنف ہو گئی جس پر تمام شاعروں اور ادیبوں نے اپنے اپنے اعتبار سے اسے فروغ دیا اور اردو کے سرمایے میں سوانح نگاری کا ایک وافر دفتر جمع کردیا جو فکری وفنی اور دستاویزی اہمیت کا حامل ہے۔

سوانح نگاری ایسا فن ہے جس میں سوانح نگار ایک مصور کی طرح ہوتا ہے جو اپنی یا دوسروں کی تصویر اپنے انداز میں بناتا ہے۔اور اسے اس بات کی پوری آزادی ہوتی ہے کہ وہ اپنے مطمح نظر کی شخصیت کو زیادہ سے زیادہ نمایاں اور پرکشش انداز میں پیش کرسکے تاکہ قاری کو اس کی شخصیت متاثر کرسکے۔اور اس شخص کے افکار ونظریات اور خدمات کی حقیقی تصویر سامنے آجائے۔جس میں زندگی کے داخلی اور خارجی تمام پہلو روشن ہوجائیں۔جو دستاویزی حیثیت کے حامل بھی ہوں۔اور دوسروں کے لئے قندیل راہ ثابت ہوں۔اسی سلسلے کی ایک کڑی کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کی خود نوشت سوانح عمری ''یادوں کا جشن'' ہے۔انہوں نے اپنی خود نوشت لکھنے کا ارادہ جوشؔ ملیح آبادی کی ''یادوں کی برات'' سے تحریک حاصل کرکے کیا ہے اس کا اعتراف

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

انہوں نے خود اپنی کتاب کی تمہید میں کیا ہے ملاحظہ فرمائیں :

''یادوں کا جشن'' لکھنے میں میرے سامنے کوئی اقتصادی یا تجارتی مفاد نہیں
تھا۔ اتنا ضرور چاہتا تھا کہ ''نو واردانِ مکتب'' اگر چاہیں تو ان تجربوں سے
فائدہ اٹھالیں جو میں نے اپنی چوہتر ۷۴ سالہ زندگی میں حاصل کئے ہیں۔
جوشؔ صاحب کی ''یادوں کی برات'' سے مجھے حوصلہ ملا کہ میں بھی کچھ لکھوں۔''

(یادوں کا جشن : کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ ص ۶۵)

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کی شخصیت بڑی رنگا رنگ ہے۔ شاعری کی بیشتر اصناف سخن میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ بحیثیت شاعر یہ اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں اور نظموں کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ جیسے ''طلوسحر'' ۱۹۶۲ء ''کلیاتِ سحرؔ'' ۱۹۹۲ء ''انتخاب کلام بیدیؔ'' ۲۰۱۶ء وغیرہ۔ ان کے نثری مزاحیہ مضامین بھی معیاری رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ خودنوشت سوانح عمری ''یادوں کا جشن'' کو بھی کافی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ اس میں بھی ان کا انداز و اسلوب نہایت دلچسپ اور شگفتہ ہے۔ کہیں کہیں مزاح کا عنصر بھی وہ تلاش لیتے ہیں ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''خدا پر کچھ لکھنے کی طرح بیوی کے بارے میں لکھنا بھی انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا
ہے بلکہ خدا پر لکھنے میں خدشے کے امکانات کچھ کم ہو سکتے ہیں۔ خدا تو غفار ہے، رحیم
ہے، کریم ہے، بخش دینے والا ہے مگر یہ صفات بیوی میں یکسر کم ہوتی ہیں اور پھر اللہ
میاں تو حشر کے دن ہم پر فیصلہ صادر کرے گا اور ہمیں بخشوانے والا ہمارے پیغمبر،
اوتار، ولی اللہ سب موجود ہوں گے۔ لیکن بیوی برہم ہو جائے تو گھر میں آئے دن
حشر بپا ہوتا ہے.................''

(یادوں کا جشن : کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ ص ۲۶۰)

کنور مہندر سنگھ ایک خوش مزاج و بذلہ سنج طبیعت کے مالک تھے۔ ہر خاص و عام سے انہیں حد درجہ ہمدردی تھی۔ ان کے اخلاق اعلیٰ تھے۔ مروت و شرافت اور نفاست کے وہ مجسمہ تھے۔ خودغرضی، مفاد پرستی اور کاروباری ان کا ذہن نہیں تھا۔ انہیں فنون لطیفہ سے گہری دلچسپی تھی۔ ان کے جیسی شخصیت آج کے دور حاضر میں تو نایاب ہی ہے۔ انہیں خوبیوں کی وجہ سے ان کی شہرت و مقبولیت تمام اردو دنیا میں پھیل چکی ہے۔ موصوف جس کی مدد کرتے دل کھول کر کرتے تھے۔

''یادوں کا جشن'' ایک نہایت عمدہ خودنوشت ہے۔ اس میں موصوف نے اپنی پیدائش، تعلیم، لڑکپن، عقیدہ، دوست احباب، بیوی، مزاح، امیر ہونا، غریب ہونا، شاعری، مشاعرہ، شاگرد، برگزیدہ

ISSN :2582 -3612

شخصیتیں چند عجیب و غریب شخصیتیں، دلچسپ واقعات، ادبی لطیفے، ہندوستان اور جمہوریت، ہندوستان اور مغربیت، بھارت اور اردو، بھارت اور پاکستان، فلمی دنیا، پاکستانی فلمی اداکار اور اتفاق محض یا کرم خاص وغیرہ عنوانات قائم کرکے اپنی پوری زندگی کا احاطہ کیا ہے۔ انہوں نے سوانح نگاری کے ساتھ بھرپور انصاف کیا ہے۔ زندگی میں پیش آئی سفید و سیاہ تمام باتوں کو کہیں وضاحت کے ساتھ کہیں سرسری انداز میں صفحہ قرطاس پر رقم کر دیا ہے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کی خودنوشت سوانح عمری کے مطالعے سے ان کی باغ و بہار شخصیت اور ان کے معتبر خاندانی نسل کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ موصوف کا ذہنی میلان ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا پروردہ نظر آتا ہے۔ ان کی یہ خودنوشت سوانح فکری و فنی روایتی اور دستاویزی تمام اعتبار سے اہم اور قابلِ قدر ہے۔ انہوں نے سچائی کا دامن ہمیشہ تھام کر رکھا ہے۔ کسی بھی واقعہ کے بیان میں پردہ پوشی کی کوشش نہیں کی ہے۔ اپنی زبان و افعال سے کسی کی دل آزاری نہیں کی ہے۔ نامساعد حالات میں بھی توازن بنائے رکھا ہے۔ جو ان کی اعلیٰ ظرفی کا بیّن ثبوت ہے۔ اس سلسلے میں کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''ایک شخص کی داستان حیات ہے۔ جس نے بالکل سچ بولا ہے۔ جب
ہندو مسلم فسادات نے سارے براعظم کو پاگل کر دیا تھا، لیکن بیدی صاحب کا
دل تعصب اور نفرت سے پاک تھا۔ بیدی صاحب نے ایسے زمانے میں دہلی
میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے جو کوششیں کیں اس کی تعریف کئے بغیر
نہیں رہ سکتے۔ بیدی صاحب کی انسان دوستی آج بھی خیالوں میں بسی ہوئی
ہے۔ بیدی صاحب ساری عمر بربریت، حیوانیت اور ظلم کے خلاف صف
آرا رہے اور یہ کام وہی کر سکتا ہے جو انسانیت پر مکمل یقین رکھتا ہو۔ ''یادوں کا
جشن'' میں اس زمانے کی سوسائٹی اس کی اہم ہستیوں، لوگوں کے رہن سہن
ان کے مختلف حالات میں عمل اور ردِّ عمل کی تصویر ابھرتی ہے۔''

(یادوں کا جشن : ص ۳۷۔۳۸)

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کی خودنوشت سوانح عمری موصوف کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو آشکار اور نمایاں بنا دیتی ہے۔ اس سے ان کی شخصیت نہایت باوقار اور عظیم نظر آتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس دور کے سماجی، معاشی، سیاسی اور مذہبی تمام صورت حال بروئے کار آ جاتے ہیں۔ انسان انسان سے کس طرح پیش آتا ہے۔ جب حالات بہتر ہوتے ہیں تو انسان کی سوچ الگ ہوتی ہے۔ جیسے ہی حالات نامساعد ہوتے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ہیں لوگوں کی سوچ بدل جاتی ہے لیکن جب اندرا گاندھی کے قتل کا واقعہ پیش آیا تو ان کے اہلِ خاندان کے ساتھ بھی لوگوں نے بُرا سلوک کیا۔ جانی اور مالی نقصانات بھی ہوئے۔ لیکن جب حالات سازگار ہوئے تو پھر ان کے پرانے تعلقاتی لوگوں سے ان کے سروکار ذرا بھی کشیدہ اور تلخ نہ ہوئے بلکہ انہیں اسے اوپر والے کے مرضی پر محمول کر دیا۔ اور اس حادثے کو زندگی کی ایک تلخ، سچائی کی طرح قبول کر لیا۔ اس طرح ان کے سوچنے کا انداز ان کی شخصیت میں چار چاند لگاتا ہے اور ان کی انسان دوستی کی مثال پیش کرتا ہے۔ غرض موصوف نے زندگی کو بہت خوبصورت انداز میں جیا ہے اور اسے من وعن اُسی ڈھنگ سے تحریر کر دیا ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ اور تحریف نہیں کی ہے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کی خود نوشت سوانح عمری سوانح عمری کی روایت وسرمایہ میں ایک اہم درجہ رکھے گی۔ جوشؔ کی سوانح عمری اپنی جملہ خصوصیات کی وجہ کر اعلیٰ درجہ رکھتی ہے۔ لیکن موصوف کی یہ تخلیق اپنے مزاج و اسلوب اور واقعیت نگاری کے اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔ اس کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اعتراف پورے اردو ادب میں کیا جا رہا ہے۔

Dr. Asghari Begum
C/o. Md. Kurshid Alam (Teacher)
Near - Urdu College
Thawe Road
Gopalgaj - 841 428

ڈاکٹر محمد رضوان

عبدالمنان طرزیؔ ایک قادر الکلام شاعر

پروفیسر عبدالمنان طرزی کی شخصیت کثیر الجہات ہے۔ وہ بیک وقت ایک حافظ قرآن، عظیم نعت گو شاعر، منظوم ناقد وتذکرہ نگار وتاریخی قطعہ نویس، ترجمہ نگار، نظم نگار اور غزل گو شاعر بھی ہیں۔ ان کی شہرت ومقبولیت ملک ہی نہیں بیرون ملک تک ہے۔ ان کے منظوم تذکروں کا شہرہ تمام اطراف واکناف اردو میں ہے۔

عبدلمنان طرزی ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ ان کی نظم وغزل نعت ومنظوم تذکرے تمام قاری و سامعین کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کے شعر کہنے کی صلاحیت، زبان وبیان پر قدرت موضوع اور نفس موضوع کا مطالعہ نہایت فقید المثال ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر احسان عالم کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ''طرزی صاحب کو شعر گوئی پر اس قدر دسترس حاصل ہے گویا ان کے دل ودماغ سے اشعار اُبلتے ہیں اور ایک سیل رواں کی طرح صفحہ قرطاس پر پھیل جاتے ہیں۔ ان کی زود گوئی اور کثرت شعری کا اظہار حیران کُن ہے۔ ان کی بعض منظوم کتاب محض چند دنوں کی تخلیقی شاہکار ہے۔ طرزی صاحب سراپا شعری پیکر ہیں۔ ان کا وجود اور ان کا خمیر شعری عناصر سے گوندھا گیا ہے۔ مَیں نے شروع میں کہا ہے کہ طرزی صاحب فردوسی ہند ہیں تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ وہ دو ہزار عیسوی سے اب تک پینسٹھ ہزار سے زیادہ اشعار نظم کر چکے ہیں۔ شاہنامہ فردوسی میں پچاس ہزار اشعار ہیں۔ جبکہ دس ہزار اشعار اس میں دقیقی کے شامل ہیں۔ اسی طرح طرزیؔ صاحب اردو دنیا کے ایک عظیم فنکار، بلند پایہ شاعر نظمیہ اظہار کے پیکر ہیں۔''
>
> (پروفیسر طرزیؔ ذات سے شعری کائنات مصنفہ ڈاکٹر احسان عالم ص ۱۹)

اس میں کوئی شک نہیں کہ عبدالمنان طرزی ایک فقید المثال صلاحیت کے مالک شاعر اور ادیب ہیں۔ انہیں منظوم تذکرہ نگار کا موجد کہا جاتا ہے۔ ان کی نگارشات شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ کیونکہ انہوں نے شاعری میں جو راہ اختیار کی وہ اس کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ اسی لئے انہیں منظوم تذکرہ نگار کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔ موصوف کی شاعرانہ خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے مشہور ومعروف ناقد پروفیسر شارب ردولوی کا خیال ملاحظہ فرمائیں :

> ''عبدالمنان طرزیؔ کی ایک خصوصیت بدیع وبیان پر ان کی گرفت اور قادر

الکلامی ہے۔ پُرانے اساتذہ کے بارے میں لوگ قصے سنایا کرتے تھے کہ وہ
مشاعرہ کے لئے گھر سے نکلتے تو راستے میں غزل کہہ لیتے۔ طرزیؔ کا یہ عالم
ہے کہ وہ سیکڑوں اشعار کی نظمیں اس روانی سے کہے چلے جاتے ہیں جس
روانی سے نثر لکھنی بھی مشکل ہو۔ اس کے علاوہ وہ صرف قافیہ بندی کے شاعر
نہیں ہیں۔ ان کے اشعار اور نظمیں ان کی گہری فکر اور توجہ کی نشاندہی ہی
نہیں کرتیں بلکہ ان کی تنقیدی بصیرت کو بھی ظاہر کرتی ہیں۔''

(طرزی اور طرز بیان ص ۲۹)

اس حقیقت سے کوئی ناقد انکار نہیں کرسکتا کہ پروفیسر عبدالمنان طرزی اپنی شعری صلاحیت کی وجہ کر ہی پوری اُردو دنیا میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ طرزی کی قادرالکلامی اور پُر گوئی واقعی حیرت انگیز ہے۔ قدرت نے ان کو یہ نعمت بہت فراوانی سے عطا کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بڑی آسانی کے ساتھ کسی بھی موضوع کو الفاظ کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں، جس کا اعتراف پوری دنیا کو ہے۔ غزلیں تو وہ بہت پہلے سے کہہ رہے تھے۔ ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ''لکیر'' کے نام سے ۱۹۷۲ء میں شائع ہو چکا تھا۔ لیکن اس سے ان کو ایسی ہندوستان گیر شہرت حاصل نہ ہوئی تھی۔ ان کو ملک اور بیرون ملک جس منظوم کتاب نے شہرت و مقبولیت عطا کی وہ ''رفتگاں وقائماں'' ہے۔ اس کے بعد نارنگ زار، مناظر نامہ، دستار طرحدار، **طلع البدرُ علینا**، تعارف وتبصرہ تاریخ (منظوم)، منظوم جائزے، منظوم سیرت الرسول وغیرہ کئی درجن کتابیں لکھ ڈالی۔ ان کی یہ تمام کتابیں منظوم پیرائے اظہار ہیں۔ جن میں اردو ادب کے بڑے بڑے ناقد و محقق، افسانہ نگار، ناول نگار وغیرہ شخصیات کے احوال وآثار کو منظوم پیرائے میں درج کر دیا۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چند کلام کے نمونے پیش کردئے جائیں جس سے ان کی شعر گوئی کی صلاحیت بروئے کار آجائے۔ اس سلسلے میں پریم چند کے افسانوں پر لکھے گئے اشعار ملاحظہ فرمائیں جو ان کی منظوم تنقیدی بصیرت کی عکاسی بھی ہے۔

بدلا تخلیقوں میں اس نے حُسن کا معیار بھی
خواب سے مظلوموں کو وہ کر گیا بیدار بھی

———

ذکر مظلوموں کا ہے اس کی عبادت بن گئی
اور قلم کو اس کے سیاہی ان کے آنکھوں کی ملی

———

جبر و استبداد ، استحصال کی نوحہ گری
ساہوں کاروں اور زمین داروں کی کوئی ساحری

———

دست محنت کش کا اس نے اس کا بوسہ لیا
''دھنیا'' کوئی بن گئی تو کوئی ''گوبر'' بن گیا

———

اُردو افسانہ کو اِتنا جلد کر ڈالا جواں
موقعہ چلنے کا اسے گھٹنوں کے بل آیا کہاں

———

فن افسانہ کا اس کے وصف ہے یہ ایک بڑا
تارو پود حِسی نے ہے پیرہن فن کا بنا

عبدالمنّان طرزیؔ ایک کامیاب منظوم ناقد ہیں۔ انہیں اپنے فن میں مہارت حاصل ہے۔ وہ اپنے موضوع اور نفس موضوع پر پوری دسترس رکھتے ہیں۔ انہیں چھوٹی بڑی تمام باتوں کا بخوبی احساس ہوتا ہے۔ ان کا مطالعہ بہت گہرا ہوتا ہے۔ وہ سطحی جانکاری رکھ کر اپنا قلم نہیں اٹھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے پریم چند پر قلم اٹھایا تو ان کی تخلیقات کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا۔ ان کے نظریئے کے متعلق بھی وضاحت کی۔ پریم چند کے متعلق دیگر ناقدین نے جو کچھ رائے قائم کی اس کا بھی انہوں نے مطالعہ کیا اور ان باتوں کو بھی منظوم پیرائے میں جگہ دی۔ یہ کام بھی بڑی محنت ومشقت کا ہے۔

پروفیسر عبدالمنان طرزی نے میر انیسؔ کی مرثیہ نگاری اور فن مرثیہ میں ان کے مقام، ان کے کلام کی فنی خوبیاں، واقعات نگاری، منظر طرازی، کردار نگاری، مکالمہ نگاری اور جذبات نگاری پر بہترین روشنی ڈالی ہے۔ موصوف نے ان کے مرثیوں میں تمام جزئیات کا بخوبی مشاہدہ کیا ہے۔ فکری اور فنی تمام خوبیوں کو اپنے منظوم تذکروں میں درج کر دیا ہے۔ جس کے مطالعے سے میر انیسؔ کی مرثیہ نگاری کے تمام پہلو روشن ہوجاتے ہیں۔ اگر کسی نے میر انیسؔ کے مرثیوں کا مطالعہ نہیں بھی کیا ہو اور صرف طرزی صاحب کے منظوم کلام کا مطالعہ کر لے تو بھی وہ میر انیسؔ کے متعلق معیاری معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں میر انیسؔ کے متعلق لکھے گئے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

فضا لفظ و معنیٰ کی ہے کائناتی بساط اس نے پالی ہے آفاقیاتی
ڈھلی آبِ زمزم کی اک داستاں ہے شگفتہ زباں ہے مطہّر بیاں ہے

صداقت کی جو ہر فشانی بھی دی ہے　　اسے صنعتوں کی جوانی بھی دی ہے
بلاغت کا ہے تاج سر اس کے رکھا　　فصاحت کا مسند بھی ہے اس کو بخشا
اسی نے ہے دی اجتہادی قبا بھی　　گل و غنچہ خوشبو و رنگیں فضا بھی

خوف طوالت کی وجہ کر چند اشعار پر ہی اکتفا کرنا پڑ رہا ہے۔اس طرح انہوں نے مناظر عاشق ہرگانوی، گوپی چند نارنگ، شاہد جمیل، پروفیسر وہاب اشرفی، مظہر امام وغیرہ سیکڑوں شخصیات پر منظوم اظہار خیال کئے ہیں۔جن کے صرف اگر نام گناؤں تو کئی صفحات صَرف ہو جائیں گے اور ایک ایک شعر بھی اگر نقل کروں تو یہ مقالہ کم از کم چالیس صفحات پر پھیل جائے گا جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ پروفیسر عبد المنان طرزی کی قادرالکلامی کا ایک بہترین نمونہ ''سیرۃ الرسول'' (منظوم) ہے۔اس منظوم کلام میں موصوف نے حضور اکرم ﷺ کی تعریف و توصیف اور احوال و کردار کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔موصوف کی ایک شاہکار تصنیف ''طلع البدر علینا '' بھی ہے۔انہیں مجموعوں کے کلاموں کی بنیاد پر انہیں عظیم نعت گو شاعر بھی تسلیم کیا جا چکا ہے۔ان کی نعت گوئی کے متعلق ڈاکٹر شاکر خلیق کے چند جملے ملاحظہ فرمائیں :

''عبد المنان طرزی کی نعت گوئی کا بنیادی خمیر جن اَجزاء سے مرتب ہے ان میں ایمان و ایقان، نورانی اور روحانی تجربات، ذوق و شوق، شیفتگی و گرویدگی کے ساتھ قرآن پاک سے ان کی وابستگی کلام کو دو آتشہ بنا دیتے ہیں۔محبت و عقیدت کے اظہار میں طرزی از خود رفتہ نہیں ہوتے بلکہ ہر ہر قدم پر احتیاط اور ضبط و توازن کا دامن تھامے ہوئے اس وادی پُرخوار میں سفر کرتے ہیں۔ طرزی کے نعتیہ اشعار ان کے دل کی سچی و پکّی ترجمانی کرتے ہیں۔جذبات و کیفیات کے خوبصورت امتزاج سے ان کے نعتیہ اشعار بھرے پڑے ہیں۔''

(طرزی ایک قادرالکلام شاعر ص ۱۷۲)

اس موضوع پر کچھ عرض کرنے سے بہتر ہے کہ موصوف کے نعتیہ اشعار نقل کر دئے جائیں۔جس سے ان کی نعت گوئی کے جملہ اوصاف واضح ہو جائیں۔چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

فکر و وجدان ، نعت و نغمہ و شعر　　کیا ہمارا ہے ؟ سب تمہارا ہے
یہی دولت یہی پونجی ، یہی ساری کمائی ہے
دل اپنا ہے شہہِ کونین کی مدحتِ سرائی ہے
کوئی آرزو نہیں ہے کوئی مُدعا نہیں ہے
مَیں غلام مصطفٰے ہوں میرے پاس کیا نہیں ہے

پروفیسر عبد المنان طرزی کی شاعری لاجواب ہے۔ان کی غزلیں، نظمیں یا منظوم تذکرے سب ان کی قادرالکلامی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں اس سلسلے میں سیّد تقی عابدی (کناڈا) کا ایک اقتباس۔ملاحظہ فرمائیں :

''یہ اُردو شعر و ادب کی خوش بختی ہے کہ آج کے اس پُرآشوب اُردو فراموش دور میں ڈاکٹر عبد المنان طرزی جیسی کہنہ مشق ہستی موجود ہے جو الفاظ کے موتی سے خوبصورت ہار بنا کر ممدوح کے گلے میں ڈال دیتی ہے۔جب طرزؔی صفحہ قرطاس پر خامۂ رنگیں سے نقش کھینچتے ہیں تو ان میں رنگ بھرے الفاظ کے لشکر آتے ہیں۔اس لئے قادرالکلامی کی بدولت جس لفظ سے جو کام لینا چاہتے ہیں وہ بصد احترام انجام دیتا ہے۔''

(لمعات طرزی مرتبہ ڈاکٹر منصور خوشتر ص ۱۲)

اخیر میں چند اقتباسات مختلف ناقدوں کے بھی پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں جس سے موصوف کی شاعری کے جملہ اوصاف پر روشنی پڑتی ہے۔پروفیسر قمر رئیس کے جملے :

''طرزؔی کے منظوم اظہار کو جو وصف، وقار اور معنویت عطا کرتا ہے۔وہ ہے ان کی تنقیدی ژرف بینی۔ جب وہ بلند قامت فنکاروں اور ادیبوں کو داد دینے کے لئے قلم اُٹھاتے ہیں تو ان کی ایسی امتیازی اور معتبر خوبیوں کو گرفت میں لیتے ہیں۔جن سے ان کی ایک منفرد اور روشن تصویر بن سکے۔یہاں ان کا وسیع مطالعہ جُزرسی اور نکتہ دانی کام آتی ہے۔اور شعر و ادب کی تاریخ سے ان کی شناسائی ظاہر ہوتی ہے۔''

(طرزی اور اجتہادی شاعری ص ۳۸)

پروفیسر وہاب اشرفی کا خیال ملاحظہ فرمائیں :

''ان (طرزی) کے بیان شاعرانہ کیف دریا کے موجوں کی طرح پیدا ہوا ہے۔ ان کی منظوم تنقید میں ذہنی کسرت کی کیفیت نہیں ہوتی بلکہ شعری اُبال کی ہوتی ہے۔اس طرح نکتہ روشن ہو جاتا ہے۔''

(طرزی اور اجتہادی شاعری ص ۳۹)

مختصر یہ کہ پروفیسر عبد المنان طرزؔی کی قادرالکلامی کا شہرہ پوری اُردو دنیا میں ہے اور تمام ناقدین یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے کلام میں زبان و بیان کے ساتھ ساتھ فکری و فنی پہلو بھی نہایت واضح اور حسین ہوتے ہیں۔اس طرح وہ کوزے میں سمندر کو سمیٹ لینے کا ہنر بھی رکھتے ہیں۔

Dr. Md. Rizwan
PGT (Urdu)
R.K.S.S. School,Kanti,Muzaffarpur

گلشن آرا

بیدؔی کے افسانوں میں عورت کا کردار

راجندرسنگھ بیدؔی اردو فکشن کی تاریخ میں ایک خاص مقام ومرتبہ رکھتے ہیں۔ بیدی کے افسانے انسانی زندگی کے کئی ایسے نشیب وفراز کو ہمارے سامنے لاتے ہیں جو اس سے قبل بہت کم دیکھنے کو ملتے تھے۔ یوں تو بیدی کی ادبی وعلمی زندگی کا آغاز ترقی پسند ادبی تحریک سے قبل ہو چکا تھا مگر 1936 میں جب ترقی پسند ادبی تحریک کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں پریم چند کی صدارت میں منعقد ہوئی اور اپنے صدارتی خطبہ میں جب پریم چند نے اردو ادب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ جملہ کہا کہ ''ہمیں حُسن کا معیار بدلنا ہوگا'' اس ایک جملہ نے اردو کے شعری وادبی تاریخ میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ لکھنے والوں نے اپنے معیار ومزاج کے ساتھ ساتھ میلان ومیدان، مزاج ومنہاج، زبان واسلوب ہر طرف خصوصی توجہ دینے کی کوشش کی۔ بیدی کے ہم عصروں میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، اوپندر ناتھ اشک، سہیل عظیم آبادی، سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عباس وغیرہ یہ سب کے سب مشہور ومعروف فکشن نگار اپنے مخصوص ومنفرد زبان و اسلوب، مواد ومیلان، لب ولہجہ اور طرزِ تحریر سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ بیدی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اردو کی دیرینہ روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور فکشن کے عالمی بدلتے ہوئے مزاج کے پس منظر میں اپنے ادبی سفر کو آخری وقت تک جاری رکھا۔ بیدی نے افسانوں میں تسلسل، توازن، ربط وضبط اور ٹھہراؤ کا احساس ہم ہر منزل ومقام پر آسانی سے تلاش کرسکتے ہیں۔ پوسٹ آفس کی ملازمت سے لے کر ادبی وعلمی دنیا کی شہرت، دولت میں اور آخری دور میں ذلّت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ تقسیمِ ہند کے کربناک واقعات و ہجرت سے بھی بیدی کو ایک نئے سرے سے خود کو دریافت کرنا پڑا۔ بیدی کے افسانے، ڈرامے، ناولٹ تمام جگہوں میں ہم اس عہد کے کرب وکیف کو دیکھ سکتے ہیں۔ بیدی نے جو کچھ اردو فکشن کو دیا وہ نہایت ہی قیمتی سرمایہ ہے۔ جو آنے والے نسل کے لئے بھی ایک مشعلِ راہ ہے۔ بیدی کے افسانے غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے واقعات وحادثات اور انسانی زندگی کے دکھ درد، ڈوبتی ابھرتی زندگی کے ساتھ ساتھ پنجاب کی سوندھی سوندھی خوشبو وخوبصورتی جا بجا ان کے افسانوں کو نئے رنگ روپ میں سلیقے سے پیش کرتے ہیں۔ بیدی کی تحریروں میں عام انسانی زندگی اور خاص طور سے عورتوں وبچوں کی نفسیات کا بھرپور عکس دیکھنے کو ملتا ہے۔ بیدی کے نسوانی کردار ہمارے معاشرے کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتے ہیں۔

ISSN :2582 -3612

اردو فکشن کی تاریخ میں بیدی کا نام نہ صرف قابلِ ذکر ہے بلکہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کی پیدائش یکم ستمبر ۱۹۱۵ء کو لاہور میں ہوئی۔ جہاں ان کے والد ہیرا سنگھ بیدی ڈاکخانے میں ملازم تھے۔ مگر ان کا اصل وطن سیال کوٹ ہے۔

بیدی کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ ابتدا میں محسؔن لاہوری کے فرضی نام سے تخلیقات شائع ہوئے اور پھر بہت جلد انہوں نے اپنے اصل نام راجندر سنگھ بیدی کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ بیدی کا پہلا رومانی افسانہ بعنوان ''مہارانی کا تحفہ'' کے نام سے لاہور کے ادبی دنیا میں شائع ہوا۔ ۱۹۳۳ء کے بعد بیدی کے افسانوں نے ایک نئی کروٹ لی۔ بیدی کے یہاں ایک نیا رنگ وآہنگ اور نئی تازگی و توانائی ان کے یہاں پیدا ہوئی۔ اب بیدی کے افسانوں میں رومانیت کی جگہ متانت وسنجیدہ حقیقت نگاری نے لے لیا۔ سن ۱۹۳۶ء میں بیدی کا پہلا افسانوی مجموعہ ''دانہ ودام'' مکتبہ اردو لاہور سے شائع ہوا۔ بیدی کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''گرہن'' پہلی مرتبہ ۱۹۴۲ء میں نیا ادارہ لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ بیدی کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''کوکھ جلی'' مارچ ۱۹۴۹ء میں کتب پبلشرز ممبئی نے شائع کیا۔ بیدی کا چوتھا افسانوی مجموعہ ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' ۱۹۶۵ء میں مکتبہء جامعہ دہلی سے شائع ہوا۔ بیدی کا پانچواں افسانوی مجموعہ ''ہاتھ ہمارے قلم ہوئے'' مارچ ۱۹۷۴ء میں مکتبہء جامعہ دہلی سے شائع ہوا۔ بیدی کا چھٹا افسانوی مجموعہ ''مکتی بودھ'' ہے جو پہلی مرتبہ دسمبر ۱۹۸۲ء میں مکتبہء جامعہ نئی دہلی سے شائع ہوا۔

راجندر سنگھ بیدی نے ایک ناولٹ ''ایک چادر میلی سی'' لکھا جسے ۱۹۶۲ء میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے شائع کیا۔ اس کے علاوہ بیدی نے کئی یک بابی ڈرامے بھی لکھے ''سات کھیل (۱۹۴۶) اور بے جان چیزیں (۱۹۴۳) کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ بیدی نے کئی فلموں کے مکالمے اور منظر نامے بھی لکھے خود بھی کئی فلمیں بنائیں جن میں دستک اور ''پھاگن'' مشہور ہیں۔ بیدی کی اہلیہ ستونت کور کا ۱۹۷۷ء میں انتقال ہوا۔ اہلیہ کی موت نے بیدی کو توڑ دیا۔

۱۹۷۹ء میں بیدی پر فالج کا حملہ ہوا۔ چلنے پھرنے سے بھی بیدی معذور ہو گئے۔ اور آخر کار ۱۱/ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو اردو فکشن کا درخشندہ ستارہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ بیدی کو پدم شری کے علاوہ ساہتیہ اکادمی، مرزا غالبؔ ایوارڈ اور کئی دوسرے اعزازات وانعامات سے نوازا گیا، بیدی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اردو افسانے کو سنجیدگی اور متانت سے قریب تر کیا۔ زندگی کی زمینی حقیقتوں کو ایک نئے سرے سے دریافت کرنے کی مخلصانہ کاوش کی۔ پریم چند کی عظیم افسانوی روایت اور ترقی پسندانہ افکار و خیالات کو نہایت خوش اسلوبی اور خوبصورتی کے ساتھ اپنے افسانوں کے ذریعے ایک نئی سمت اور دِشا سے روشناس کرایا۔ بقول پروفیسر قمر رئیس :

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

''جب پریم چند جیسی عمر اور مرتبہ کے ادیب اس تحریک کو فروغ دینے میں
ایسے والہانہ شغف سے کام کر رہے تھے تو دوسرے نوجوان ادیب کیسی لگن اور
دلچسپی سے اسے کامیاب بنانے کی کوشش کر رہے ہونگے۔ ایک سال بھی
مشکل سے گذرا تھا کہ کرشن چندر، علی سردار جعفری، راجندر سنگھ بیدی، مجاز،
جذبی، سید احتشام حسین، مخدوم محی الدین، اختر انصاری، احمد ندیم قاسمی،
میرزا ادیب، کیفی اعظمی، اور سبط حسن جیسے باصلاحیت ادیب اس تحریک
میں شامل رہے اور اس کے جلسوں میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔''

بیدی اردو فکشن کا ایک ایسا محبوب اور معتبر نام ہے جن کی علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف ان کی زندگی ہی میں کیا گیا۔ کئی رسالوں میں گوشے اور نمبر شائع ہوئے کئی تحقیقی وتنقیدی مقالے بھی قلمبند کئے گئے۔ انہوں نے جو کچھ بھی اردو فکشن کو دیا اپنے اصولوں اور اپنی شرطوں پر دیا۔ عجلت پسندی کے نام و نشان ان کے افسانوں میں کہیں نہیں نظر آتے۔ جس موضوع پر بیدی نے قلم اُٹھایا اس کے تمام پہلوؤں پر نہایت سنجیدگی سے غور وفکر بھی کیا۔ جیسا کہ نامور فکشن نگار جوگندر پال نے کہا :

''بیدی سوچ سوچ کر لکھنے کا عادی ہے اور اس کا قاری بھی سوچوں کے
گھیرے میں آکر اُسے رُک رُک کر پڑھتا ہے۔ گویا کہانی کو اپنے طور
پر تخلیق ہوئے آگے بڑھ رہا ہو، قاری کے لئے کھوج کی یہ گنجائش روا رکھ کر
بیدی نے ایک طرح سے مطالعہ کو تخلیق کی سرحدوں سے جوڑ دیا ہے۔''

بیدی اپنے تمام پڑھنے والوں کو دعوت غور وفکر پر مجبور کرتے ہیں۔ انسانی نفسیات اور ان کے جذبات اور احساسات پر ان کی بھرپور گرفت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے افسانوں کے کرداروں کے ارد گرد خود کو قریب تر کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ عورتوں کی نفسیات کے حوالے سے بیدی کا مقام و مرتبہ اور بھی بلند ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں عورتوں کے کرداروں کے ساتھ بھرپور انصاف کرتے ہیں۔ عورتوں کی نفسیات کی تہوں میں جا کر ایک نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں۔ بقول نامور فکشن نگار، ناقد پروفیسر وقار عظیم کے لفظوں میں :

''بیدی کے افسانوں میں بھی بہت سی جگہ عورت نظر آتی ہے لیکن ان کے یہاں
دو ایک موقعوں کو چھوڑ کر 'عورت صرف رومان کا دوسرا نام نہیں عورت کے
تصور کے ساتھ رومان کا جو قدرتی جذبہ موجود ہے اس کا احساس بیدی کو بھی
شدّت سے ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جو چیز برابر اس تصور کو بیاں کرتی

ISSN :2582 -3612

ہے وہ دنیاوی حقائق ہیں۔ وہ عورت اور اس کے رومان ان تعلقات کی فضا
میں رہ کر دیکھتے دکھاتے ہیں جن کے بغیر عورت کی فطرت کی تکمیل نہیں ہوتی
عورت ماں ہے بیوی ہے، بہن ہے اور اس کے علاوہ اس کے دم سے دنیا کے
بہت سے رشتے ناتے ہیں۔''

(نیا افسانہ ۹۹)

حقیقت یہ ہے کہ بیدی نے عورت کو عورت کی نفسیات، صفات، کردار، حرکات وسکنات بلکہ ان تمام پہلوؤں کو بہت گہرائی و گیرائی سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ جس سے ایک مکمل عورت کی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے عورت کی تخلیق کائنات کا ایک حسین، عظیم کارنامہ ہے بقول علامہ اقبالؒ ع

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

لاجونتی، جوگیا، لمبی لڑکی، اپنے دکھ مجھے دے دو، گرم کوٹ، دیوالہ وغیرہ افسانوں میں جس طرح بیدی نے عورت کی نفسیاتی کشمکش اور اس سے پیدا ہونے والے حالات کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ دراصل بیدی کے تمام افسانے انسانی قدروں کے ارد گرد گھومتے اور رقص کرتے نظر آتے ہیں۔ انسانی نفسیات اور عورتوں کے جذبات واحساسات کو بیدی کچھ اس انداز سے ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں کہ وہ کردار ہماری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ اور ہم اس سے ہمدردی کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ تقسیم ہند کے پسِ منظر میں رونما ہونے والے حالات پر مبنی لاجونتی ہو یا پھر گرم کوٹ کی چاہت اور جستجو کے کرب واضطراب، ان تمام مرحلوں سے خود گذرنے اور قاری کو گذارنے پر کامیاب ہو جاتے ہیں۔ انسانی قدروں، زمینی حقیقتوں اور ان کے مسائل ومعاملات کو نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ بیدی اپنے افسانوں میں برتنے اور ہنرمندی کے ساتھ پیش کر کے ایک نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں۔ ٹوٹتے بکھرتے رشتوں اور دم توڑتی ہوئی انسانیت، زوال آمادہ ذہنیت میں انسانیت کا دامن ہاتھ سے ہرگز نہیں چھوڑتے، آخری دم تک بیدی کا قلم انسانیت کی حفاظت اور قدروں کی پاسداری ان کا مشن اور مقصد رہا جیسا کہ نامور ناقد پروفیسر آلِ احمد سرور لکھتے ہیں :

''راجندر سنگھ بیدی ایک ایسے فنکار ہیں جو آدمی کے تمام معاملات کے
بارے میں نہایت باخبر، ذی عقل، دانشمند اور طباع ہیں وہ انسانی امور کو
سمجھنے کا ہنر جانتے ہیں اور اس راہ سے بھی واقف ہیں جس پر چل کر آدمی کے
ساتھ بہتر استوار کیا جاتا ہے۔ آدمی شناس اور خلوص کے باعث انہیں
ایک فقیرانہ تقدّس حاصل ہے۔''

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

اردو کی افسانوی روایت میں بیدی ایک ایسے تخلیق کار ہیں جنہوں نے اردو افسانہ میں فن اسلوب اور کردار کو نہایت ہی خوش اسلوبی اور خوبصورتی سے پیش کر کے ایک نئی تاریخ رقم کی ہے۔ وہ اردو کے ان معدودے چند فکشن نگاروں میں ہیں جنہوں نے اردو افسانہ کو ایک نیا وقار، معیار اور اعتبار بخشنے کا کام کیا ان پر بہت کچھ ان کی زندگی میں لکھا گیا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے اور بیدی اردو افسانے کا ایک ایسا نام ہے جسے ہم کسی طور فراموش نہیں کر سکتے۔

Gulshan Ara
C/o Dr M.M Ansari
Madarsa Road,Maripur
Muzaffarpur-842001,Bihar

کیا آپ اپنی کتاب یا رسالہ عالمی اردو قارئین تک پہنچانا چاہتے ہیں؟
سہ ماہی ''**ساغرِ ادب**'' میں رعایتی نرخ پر اپنی کتاب یا رسالے کا اشتہار دیجئے۔
''**ساغرِ اَدب**'' کی گلوبل ریڈرشپ، کتب و رسائل کی نکاسی کا ایک مؤثر ترین ذریعہ۔

شرح اشتہار

General Full page Space	10,000
General Half page Space	5,000

پتہ :
حُسینا ہاؤس، زکریا کالونی محلّہ۔ سعد پورہ، پوسٹ۔ رَمنہ، مظفر پور (بہار) پن کوڈ 842002
موبائل نمبر : 90062 53903 / 94300 84261

ایڈیٹر

ISSN :2582 -3612

روشن پروین

جذبیؔ کی شاعری کے چند نکات

''میں ۲۱/ اگست ۱۹۱۲ء کو اس دنیا میں آیا۔ جھانسی، آگرہ، لکھنو، دہلی اور علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ وطن دو پشتوں سے لکھنو ہے۔ پردادا مولوی حمزہ علی عالم تھے اور میرٹھ میں رہتے تھے۔ غدر میں میرٹھ چھوڑنا پڑا۔ سارا خاندان تتر بتر ہو گیا۔ پردادا دانا پور (بہار) چلے گئے لیکن میرے دادا ڈاکٹر عبدالغفور مظہرؔ نے نہ معلوم کیوں دانا پور چھوڑ دیا اور یوپی میں ملازمت کر لی، لیکن غدر میں جو خاندان منتشر ہوا تھا اس کا ایک حصہ لکھنو میں آ کر بس گیا تھا۔ دادا کو پتہ چلا تو آپس میں شادی بیاہ کا سلسلہ شروع ہوا اور اس طرح لکھنو وطن بن گیا۔ میرے والد احسن الغفور صاحب نے علی گڑھ سے بی۔ اے کیا تھا اور ڈپٹی انسپکٹر آف محمڈنز اسکول سے ریٹائر ہوئے...... بچپن میں مجھے شعر و ادب سے جو دلچسپی ہوئی وہ دراصل گھر کے ادبی ماحول کا نتیجہ تھی۔ ابا کو شعر کہتے ہوئے دیکھتے تھے۔ میری مرحومہ پھوپھی خاتون اکرم، جن کی شادی رازق الخیری ایڈیٹر عصمت، سے ہوئی تھی اور جنہوں نے میری ماں کے انتقال کے بعد میری پرورش بھی کی تھی، یا تو پڑھتی رہتی تھیں یا پھر ''تہذیب النسواں'' اور ''عصمت'' کے لئے مضامین لکھتی نظر آتی تھیں۔ قصہ مختصر یہ ماحول تھا جس میں آنکھ کھولی اور شاعری بلائے بے درماں کی طرح پیچھے لگ گئی۔''

خودنوشت سوانح کا یہ اقتباس جس فن کار کے مکتوب سے لیا گیا ہے اسے ادبی دنیا معین احسن جذبیؔ کے نام سے جانتی ہے، جن کی ولادت اعظم گڑھ میں ہوئی اور جو طویل عمر پا کر ۱۳/ فروری ۲۰۰۵ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کے شعری مجموعے ''فروزاں'' اور ''سخن مختصر'' طبع ہو چکے ہیں، حالی پر ان کا تحقیقی مقالہ بھی ''حالی کا سیاسی پہلو'' کے نام سے اشاعت پا چکا ہے۔ معین احسن جذبی کے سوانح کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ابتدا میں اپنا تخلص ''ملال'' رکھا تھا، لیکن لکھنو میں تعلیم کے دوران اپنے کالج کے ایک دوست شیام نرائین کے سمجھانے پر تخلص بدلنے کا فیصلہ کیا اور حامد شاہجہاں پوری سے مشورے کے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

بعد جذبیؔ تخلص اختیار کیا اور اسی سے دوامی شہرت پائی۔

ادبی دنیا میں جذبیؔ کی باقاعدہ شہرت ۱۹۳۳ء سے ہوئی ہے جب کہ لاہور کے رسالہ ''ہمایوں'' نے ان کی غزل پورے صفحہ پر خاص اہتمام سے شائع کیا، پھر دہلی کے مشاعرہ ۱۹۳۵ء میں شرکت سے ان کی شاعری نے مزید شہرت پائی۔ انہیں دنوں کی بات ہے کہ حسرتؔ نے علی گڑھ کے مشاعرے میں جذبیؔ کی غزل پر بے انتہا پسندیدگی کا اظہار کیا۔

جذبیؔ کو سوانح نگاروں کے ایک حلقے نے ''اقبالؔ کے بعد اردو کے دوسرے قابلِ ذکر پی ایچ۔ ڈی شاعر'' کی حیثیت سے یاد کیا جو شاید غلط نہیں اور اسی طرح جذبیؔ کی اُس غزل کا ذکر بھی بار بار ہوتا رہا ہے جسے فلم ''ضدی'' میں پیش کیا گیا ہے اور جس کا مطلع ہے ؎

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا، اب خواہش دنیا کون کرے

حقیقت یہی ہے کہ معین احسن جذبیؔ کی شاعری رنگارنگ خوبیوں کی حامل ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے غلط نہیں لکھا ہے کہ :

''جذبیؔ کی شاعری میں سب سے پہلے جو چیز اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ الفاظ و بحر کا انتخاب ہے کہ ان کے حسین امتزاج سے شعریت میں خاطر خواہ اضافہ ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے کلام میں رچاؤ پیدا کرنے کے لئے بڑی کاوش کرتے ہیں اور جب تک خیال اور فن میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہوتی، وہ شعر ان کے احاطہ انتخاب سے باہر ہی رہتا ہے۔ جذبیؔ کی ساری شاعری دکھ درد کا مجموعہ ہے، مگر اس میں خاص بات یہی ہے کہ اپنا درد بہت کم ہے اور دوسروں کے مصائب کا زیادہ بیان ہے۔ غریبوں کے جذبات و حالات کی ترجمانی ان کی شاعری کا خاص مقصد معلوم ہوتی ہے۔ وہ اپنے کلام میں غریبی کے درد اور افلاس کی کسک کی تشریح بھی بڑی خوبصورتی سے کرتے ہیں۔ شکایت و فریاد کے وقت وہ شور بے ہنگام نہیں کرتے بلکہ کبھی طنزیہ آمیز لہجے میں اور کبھی سنجیدگی و سادگی کے ساتھ اس انداز سے اپنے محسوسات پیش کرتے ہیں کہ کلام میں دیرپا اثر پیدا ہوجاتا ہے۔ جذبیؔ کی نظموں میں تغزل کی کارفرمائی سے بڑی دلکشی پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ اپنی بات نہایت فنکارانہ انداز میں کہتے ہیں۔ نہ طول کلام سے بے کیفی محسوس ہوتی ہے، نہ اتنا اختصار ہوتا ہے کہ

ISSN :2582 -3612

پوری بات واضح نہ ہو اور آدمی کو بجائے لطف لینے کے الجھن محسوس ہونے لگے۔ معین احسن جذبیؔ کے کلام کو دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ جو بات جتنی کہی گئی اتنا ہی ضرورت بھی تھی اگر اس میں کمی یا زیادتی ہوتی تو بات بگڑ جاتی۔''

(مختصر تاریخ ادب اردو ص ۱۹۵)

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ معین احسن جذبیؔ کا تعلق ترقی پسند تحریک سے ہے اور اس تحریک کے مشاہیر نظم نگار شعرا مثلاً مخدوم محی الدین، خلیل الرحمٰن اعظمی، جان نثار اختر، ساحرؔ لدھیانوی اور مجازؔ لکھنوی کے ساتھ ساتھ ان کا نام بھی نہایت احترام سے لیا جاتا ہے۔ ان میں سے ظاہر ہے کہ نظریاتی اتحاد کے باوجود شخصی تفاوتوں کی وجہ سے ہر فن کار کی آواز اور اس کا لہجہ الگ الگ ہے اور یہی بات جذبیؔ پر بھی صادق آتی ہے۔ وہ اگرچہ اپنے معاصرین کے مقابلے میں نسبتاً کم گو شاعر ہیں، لیکن لہجے کی انفرادیت اور اپنے بعض دوسرے مخصوص وطیرۂ فن کی بدولت بہرصورت اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ اگر ایک طرف معین احسن جذبیؔ کی سوانح بتاتی ہے کہ انہیں فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے بھی شہرت ملی، خاص خاص واقعات و معاملات کے تناظر میں انہوں نے جو شاعری کی وہ بھی یادگار رہی اور انہوں نے رسالہ ''آج کل'' کی مجلس ادارت کو اپنی شمولیت سے جو علمی فائدے دئے، رسالہ ''آواز'' کے مدیر کی حیثیت سے جو خدمتیں انجام دیں اور حالیؔ کی سیاسی شعور پر جو تحقیقی کام کئے وہ بھی ناقابلِ اعتنا نہیں قرار پائے، وہیں دوسری طرف ان کے حالات زندگی اور ان کی شعری باقیات پر سر برآوردہ ناقدین کے تنقیدی و تجزیاتی تاثرات کے مطالعہ سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ بحیثیت مجموعی ان کی شاعری میں ''نیا موڑ'' دراصل ترقی پسند تحریک کی ابتدا سے ذرا پہلے ہی رونما ہوچکا تھا جو فی الواقعہ دو مرحلوں میں ارتقا پذیر ہوا۔ ایک طرف ان کی شاعری اور خصوصاً ان کی غزلوں نے حسن کے نئے پرتو سے اثر قبول کیا تو دوسری طرف ترقی پسند کے اثر و نفوذ سے بھی وہ بے بہرہ نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ایک طرف جذبیؔ کی غزلوں کو شہرت و مقبولیت ملی تو دوسری طرف ان کی نظموں میں فنکارانہ حسن، نغمگی و سلیقہ مندی، محاکاتی دروبست اور نمایاں احساس تعمیر کا برملا اعتراف کیا گیا۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن :

جذبیؔ ابلتے ہوئے فواروں اور رنگین خواب دیکھنے والی آنکھوں کے شاعر نہیں بلکہ بجھتی سلگتی آتش رفتہ کے شاعر ہیں۔ ان کے پہلے دور کی شاعری میں فانیؔ بدایونی اور جگرؔ مرادابادی کا ایک لطیف امتزاج ہے جو عشق اور فن دونوں کو لذت نہیں ریاض بنا دیتا ہے۔ وہ ستاروں پر کمندیں ڈالنے والے شاعر نہیں، زندگی کو بھوگنے اور بھگتنے والے درد مند دل کے شاعر ہیں جو لفظوں سے کھیلنے کے بجائے ان کے احترام اور ان کے باہمی رشتوں کے تقدس اور ان

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

کے پیچھے نغمہ و رنگ کے درو بست سے تعلق رکھتے ہیں ۔معین احسن
جذبؔی تقاضے یا رواج کے مطابق شاعری نہیں کرتے بلکہ احساس کو اپنے لئے
راہ نما بناتے ہیں۔''

(جذبؔی کی شاعری مشمولہ ''عصری ادب'' اکتوبر ۱۹۸۲ء ص ۲۱ تا ۲۲)

یہ کہنا تو ہمارے لئے آسان نہیں کہ جذبی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں یا نظم کے شاعر، البتہ اس خیال سے اتفاق کرنے میں ہمیں کوئی دشواری نہیں لگتی کہ نظم ہو یا غزل، جذبؔی نے شعری اظہار کے وسیلے کی حیثیت سے ، ان میں کبھی امتیازی سلوک روا نہیں رکھا ہے۔ انہوں نے اگر ایک طرف نہایت پسندیدہ اور یادگار غزلیں کہی ہیں تو دوسری طرف ''نیا سورج''، ''موت''، ''طوائف'' اور ''میری شاعری اور نقاد'' جیسی متعدد نظمیں بھی لکھی ہیں جو تسلسل اور ارتقائے فکر کے ساتھ ساتھ جذبے کے رچاؤ کے لحاظ سے بھی اردو کی اعلیٰ نظموں میں محسوب ہونے کا حق رکھتی ہیں ۔غلط نہیں کہا گیا ہے کہ جذبؔی ان گنے چنے چند شاعروں میں سے ہیں جو ایڈگر ایلن پو کی طرح طویل نظم کو قولِ محال سمجھتے ہیں۔

جذبؔی اور مجاز کی دوستی کا حال زمانہ جانتا ہے۔ انہوں نے اپنے دوست کی موت پر جو رثائی نظم لکھی وہ اپنی کیفیت اور دربست کے لحاظ سے اردو میں ایک مثالی نظم کہلانے کا حق رکھتی ہے۔ یہ معین احسن جذبؔی ہی ہیں جنہوں نے آزادی وطن کے معاً بعد، جب کہ اردو میں علامت نگاری کا رواج عام نہیں ہوا تھا اور دنیائے سیاست میں آزادی کی معنویت پر فلسفہ طرزی بھی عام نہ تھی، رمزیت و بلاغت سے بھرپور ''نیا سورج'' جیسی نظم لکھی۔

جذبؔی کی نظمیہ شاعری سے قطع نظر جہاں تک ان کی غزلیہ شاعری کا تعلق ہے۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے اپنی غزلوں میں حسن کا جو تصور دیا ہے وہ اردو شاعری میں بہر صورت ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے :

''انہوں نے غزل کے رمز و ایما میں وسیع تر کائناتی آہنگ سمونے کی کوشش کی ہے، ان کے شعر خلوتوں میں گنگنائے جاتے ہیں اور نغمہ بن کر مدتوں گونجتے رہتے ہیں بلکہ دلوں میں بسیرا جما لیتے ہیں۔ جذبؔی کا آرٹ ضبط و توازن کا آرٹ ہے، وہ ارتکاز کے قائل ہیں اور اسی ارتکاز کو انہوں نے فن کی تہذیب سے جلا بخشی ہے۔ معین احسن جذبؔی کے اشعار کی وجد آفریں غنائیت ان کا سرمایۂ امتیاز ہے۔ محض نغمے اور الفاظ تازہ کی تلاش کا شعور نہیں رکھتے، بلکہ انہیں نئی تصویریں سجانے اور نئے رنگوں سے قوس و قزح سنوارنے کا ہنر بھی بخوبی تمام آتا ہے۔''

(جذبی کی شاعری، محمد حسن مشمولہ ''عصری ادب'' اکتوبر ۱۹۸۲ء ص ۲۶، ۲۷)

ISSN :2582 -3612

محولہ اقتباس میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان کے تعلق سے جذبؔی کے چند اشعار بلا تکلف پیش کئے جاسکتے ہیں ۔

ہر داغ دل میں عکس رخ گلبدن لئے
بیٹھے ہیں اہل عشق چمن در چمن لئے

اے موج بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں

داستان شب غم ، قصہ طولانی ہے
مختصر یہ ہے کہ تونے مجھے برباد کیا

نہ آئے موت خدایا تباہ حالی میں
یہ نام ہوگا غم روزگار سہہ نہ سکا

زندگی اور بھی کچھ خار ہوئی جاتی ہے
اب تو جو سانس ہے آزار ہوئی جاتی ہے

ملے غم سے اپنے فرصت تو سناؤں وہ فسانہ
کہ ٹپک پڑے نظر سے مئے عشرت شبانہ

یہی زندگی مصیبت ، یہی زندگی مسرت
یہی زندگی حقیقت ، یہی زندگی فسانہ

مرے قہقہوں کی زد پر کبھی گردشیں جہاں کی
مرے آنسوؤں کی رو میں کبھی تلخی زمانہ

Raushan Parween
C/o. Sami Akhtar
Purana Qila, Siwan (Bihar)

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

محمد اصغر علی

منور رانا کی غزلیہ شاعری

ان کا پورا نام سید منور علی اور قلمی نام منور رانا ہے۔ ان کی پیدائش ۲۶ نومبر ۱۹۵۲ء کو اتر پردیش کے ضلع رائے بریلی میں ہوئی۔ نئے طرز احساس، طرز فکر، انداز بیان اور انفرادی لہجے کے ساتھ شاعری کا آغاز کرنے والے منور رانا بہت جلد اردو شاعری کے منظر نامے پر اپنی شناخت بنانے میں کامیاب رہے۔ ان کے شعری مجموعے اس طرح ہیں۔

غزل گاؤں (۱۹۸۰ء) پیپل چھاؤں (۱۹۸۵ء) مور پاؤں (۱۹۸۹ء) نیم کے پھول (۱۹۹۳ء) سب اس کے لئے (۱۹۹۵ء) بدن سرائے (۱۹۹۸ء) کہو ظل الٰہی سے (۲۰۰۱ء) گھر اکیلا ہو گیا (۲۰۰۴ء) جنگلی پھول (۲۰۰۶ء) وغیرہ۔ منور رانا کی شاعری کے سلسلے سے نوشاد مومن رقمطراز ہی :

''۲۰ ویں صدی کی ساتویں دہائی میں شاعری کا آغاز کرنے والوں میں منور رانا نے اپنے پر جلال اظہار، ریڈیائی آواز اور منفرد لب ولہجہ کے احترام والتزام کے ساتھ ساتھ زندگی کی سفاک حقیقتوں کا مظاہرہ کر کے نہ صرف پورے برصغیر میں مغربی بنگال کی نمائندگی کی بلکہ اردو شاعری کی عالمی بستیوں میں نمایاں مقام بھی حاصل کیا۔''

(منور رانا کی ۱۰۰ غزلیں، نوشاد مومن، ص-۴)

منور رانا نے ایسی شعری کائنات کی تخلیق کی جہاں انسانی زندگی کے تمام تر معاملات ومسائل سے قارئین آگاہ ہوتے ہیں۔ تہذیبی فکری، سماجی پسماندگی، معاشرے کے نامساعد حالات، انسانیت کی پامالی کو منور رانا نے اپنی غزلیہ شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں ماضی کی یادوں کی بازگشت اور عہد حاضر کے سلگتے مسائل کی کیفیات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ فکر وآگہی کے ساتھ محبت ویگانگت کا پیغام بھی دیتی ہیں۔ ان کی غزل گوئی کے تعلق سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے :

''انہوں نے نہایت سنجیدگی سے اپنی مشق سخن جاری رکھی اور اپنی فکری پرواز کو روح کمال تک پہنچایا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ افق غزل پر انہوں نے منور رانا بن کر اپنی بیداری کا چراغ روشن کیا تو اردو شاعری کی دنیا ہی منور کر دیا اور

ISSN :2582 -3612

لوگ اس دیے کی ضوفشانی سے حیرت زدہ رہ گئے۔ منور رانا کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ وہ جس موضوع کو اپنے شعر کے سانچے میں ڈھالتے ہیں اسے بڑی بے باکی اور برجستگی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اظہار خیال کے لئے اپنی غزلوں کے الفاظ و بیان میں ملمع سازی سے کام نہیں لیتے ہیں بلکہ اپنی زندگی کے تجربات حادثات اور عصر حاضر کے مشاہدات کو نہایت سلیقے اور جرأت مندی سے قارئین وسامعین تک اپنے اشعار کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔ شاید یہی خصوصیت ان کی کامیاب شاعری کی ضامن ہے۔''

(منور رانا کی ۱۰۰ غزلیں، نوشاد مومن، ص-۸-۷)

یہ حقیقت ہے کہ منور رانا کی غزلوں میں ایک خاص تیور اور لب ولہجہ کا ایک منفرد آہنگ ملتا ہے۔ ان کا مشاہدہ اور تجربہ وسیع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی دنیا کے مطالبات، سماج کے بدلتے رجحانات، رومانی ارتعاش، عصری کرب، تہذیبی قدروں کی پامالی کا احساس، یقین کی بے حرمتی، ماں کی عظمت، تاریخی جبریت ان کی غزلیہ شاعری کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔ مختصر یہ کہ منور رانا کی غزلوں میں حسیاتی، عنصر، مشاہداتی بصیرت اور جذباتی وارفتگی کے ساتھ خود شکستگی کا شدید احساس بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ اس سلسلے سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے

مری گلی سے گزرتی ہے جب بھی رسوائی
بغیر مجھ کو پکارے نہیں گزرتی ہے

حالات نے چہرے کی چمک چھین لی ورنہ
دو چار برس میں تو بڑھاپا نہیں آتا

تو کبھی دیکھ تو روتے ہوئے آکر مجھ کو
روکنا پڑتا ہے پلکوں سے سمندر مجھ کو

آج تک دور نہ کر پایا اندھیرا گھر کا
اور دنیا ہے کہ کہتی ہے منور مجھ کو

منور رانا کی غزلیں قارئین کو بے حد متاثر کرنے کی طاقت رکھتی ہیں۔ شاعری کی خوبی اس بات

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

میں نہاں ہوتی ہے کہ وہ قاری کے ذہن پر تادیر اثر رکھے۔اس ضمن میں منوررانا کی غزلیں اپنی مثال آپ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی غزلوں میں تفکر، تخیل، سنجیدگی اور سادگی اس طرح موجود ہے کہ ہر پڑھنے والا سبحان اللہ کہے بغیر نہیں رہتا ہے۔اس سلسلے سے چند اشعار دیکھئے۔

دہلیز پہ رکھ دی ہیں کسی شخص نے آنکھیں
روشن کبھی اتنا تو دیا ہو نہیں سکتا

یہاں تو جو بھی ہے آب رواں کا عاشق ہے
کسی نے خشک ندی کی طرف نہیں دیکھا

ان اشعار کو پڑھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ منوررانا کو زندگی کا بھرپور احساس ہے ان کا نظریۂ حیات اور مشاہداتی قوت ان کی غزلوں کو جلا بخشتے ہیں۔مختصر یہ کہ جس طرح انہیں فن پر گرفت حاصل ہے اسی طرح زندگی کا گہرا شعور بھی ہے۔ان کی غزلیہ شاعری کے حوالے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''منوررانا ایک سچے اور باشعور فن کار ہیں۔حقیقت بیانی ان کا طرہ امتیاز ہے۔شہر کی ظاہری چمک دمک، رنگارنگی مصروف اور بھاگ دوڑ بھری زندگی کی صحیح عکاسی ان کے اشعار میں موجود ہے۔صدیوں کی بنی ہوئی مشترکہ تہذیب وتمدن کا پاش پاش ہونا، انسانی قدروں کی پامالی، معاشی زوال، اخلاقی پستی، معاشی جرائم، فرقہ وارانہ فسادات وغیرہ کو انہوں نے شہر کی مصروف زندگی اور مذکورہ نظام کے زوال کے تناظر میں ہی پیش کیا ہے...............ٹوٹتی بکھرتی قدروں کی المناکی، دکھ درد اور کرب کی جھلک ان کے اشعار میں صاف طور پر نمایاں ہے۔تعصب تنگ نظری ناانصافی اور شہری مسائل کا اظہار بھی منفرد پیرائے میں کیا ہے۔''

(رانا آرٹ ایک مطالعہ، ڈاکٹر سروشہ نسرین قاضی، ص-۶۸)

منوررانا نے عشقیہ غزلیں بھی کہی ہیں جن میں پاکیزہ خیالات کی پیش کش کے ساتھ ساتھ شیرینی اور کیف وسرور موجود ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ منوررانا کی عشقیہ غزلیں محبت کے جذبے کو جلا بخشتی ہیں اس ضمن میں چند اشعار دیکھئے۔

تمہارے عشق میں ہستی کو اپنی خاک کر ڈالا
تمہارے ساتھ ہم نے مثل پروانہ گزاری ہے

محبت کو عبادت کا دیا ہے اس طرح درجہ
کہ جس کو ٹوٹ کر چاہا اسے نامہ نہیں لکھا

وہ دشمن ہی سہی آواز دے اس کو محبت سے
سلیقے سے بٹھا کر دیکھ ہڈی بیٹھ جاتی ہے

میں زندگی تو کہیں بھی گزار سکتا ہوں
مگر بغیر تمہارے نہیں گزرتی ہے

یہ سوچ کرکے ترا انتظار لازم ہے
تمام عمر گھڑی کی طرف نہیں دیکھا

کبھی خوشی سے خوشی کی طرف نہیں دیکھا
تمہارے بعد کسی کی طرف نہیں دیکھا

اردو غزلیہ شاعری بغیر محبوب کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔محبوب کی ادا ہو یا اس کا حسن یا پھر اس سے جڑی یادیں ان سب سے متعلق منوررانا کے یہاں بہترین غزلیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔منوررانا کا خیال ہے کہ محبوب کی ادائیں اور اس کی یادیں دل میں عشق کے چراغ کو روشن کرتی رہتی ہیں۔مختصر یہ کہ محبوب سے ہی ایک عاشق کیف وسرور کی کیفیت سے آشنا ہوتا ہے۔اس سلسلے سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

پھر تری یادوں کی شبنم نے جگایا ہے مجھے
پھر غزل کہنے کا موسم شاعری کو مل گیا
تمہارے خوابوں سے آنکھیں مہکتی رہتی ہیں
تمہاری یاد سے دل زعفران رہتا ہے
میں انساں ہوں بہک جانا مری فطرت میں شامل ہے
ہوا بھی اس کو چھو کر دیر تک نشے میں رہتی ہے
عید میں یوں تو کئی روز ہیں باقی لیکن
تم اگر چھت پہ چلے آؤ غضب ہو جائے

محبوب کی محبت سے الگ ہٹ کر دیکھا جائے تو منور رانا نے ماں کے پاکیزہ رشتے کے تعلق سے بھی اپنی انسیت کا اظہار اپنی غزلوں میں کیا ہے۔ ماں کے مقدس رشتوں کی پاسداری ان کی غزلوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس معاملے میں ان کی منفرد شناخت قائم ہے۔ مختصر یہ کہ دیگر شاعروں کی بہ نسبت منور رانا نے ماں کی محبت کے جذبے کا بہت خوب اظہار کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

تیرے دامن میں ستارے ہیں تو ہوں گے اے فلک
مجھ کو اپنی ماں کی میلی اوڑھنی اچھی لگی

یہ ایسا قرض ہے جو میں ادا کر ہی نہیں سکتا
میں جب تک گھر نہ لوٹوں میری ماں سجدے میں رہتی ہے

اے اندھیرے دیکھ لے منھ تیرا کالا ہوگیا
ماں نے آنکھیں کھول دیں گھر میں اجالا ہوگیا

منور رانا کی غزل گوئی میں مادر وطن کی محبت کا اظہار بھی خوب ملتا ہے۔ ان کی غزلوں میں یہ بات صاف طور سے عیاں ہے کہ منور رانا اخلاقی پسپائی اور تہذیب وثقافت کے زوال سے دل برداشتہ ہیں۔ وہ پرانی تہذیب وتمدن کی بقا چاہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اپنی افسردگی کے اظہار کے لئے انہوں نے غزل کو وسیلہ بنایا ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اپنی وطن دوستی کے جذبات کو شعری پیکر عطا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے ۔

ضرورت روز ہجرت کے لئے آواز دیتی ہے
محبت چھوڑ کر ہندوستان جانے نہیں دیتی
ہم ہیں گزرے وقت کی تہذیب کے روشن چراغ
فخر کر ارضِ وطن ہم آج تک دنیا میں ہیں

وطن دوستی کے علاوہ سیاست نے جس طرح فرقہ پرستی اور شدت پسندی کے وسیلے سے منافرت اور تعصب پسندی کو ہوا دی ہے اس پہلو کو بھی منور رانا نے اپنی غزلیہ شاعری میں جگہ دی ہے ۔

شاید جلی ہیں پھر کہیں نزدیک بستیاں
گزرے ہیں کچھ پرندے ادھر سے ڈرے ہوئے

بڑا گہرا تعلق ہے سیاست سے تباہی کا
کوئی بھی شہر جلتا ہے تو دلی مسکراتی ہے
سیاسی وار بھی تلوار سے کچھ کم نہیں ہوتا
کبھی کشمیر جلتا ہے ، کبھی بنگال کٹتا ہے

ان کی غزل گوئی کے تعلق سے یہ کہنا بجا ہوگا کہ منور رانا نے زندگی کے تمام تر مسائل کا اس طرح گہرائی سے مشاہدہ کیا ہے کہ یہ تمام مسائل ومعاملات ان کے قلم کا حصہ بن گئے ہیں۔ وہ آپ بیتی کو جگ بیتی اور جگ بیتی کو آپ بیتی بنانے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ منور رانا کہتے ہیں ۔

نہ میں کنگھی بناتا ہوں نہ میں چوٹی بناتا ہوں
غزل میں آپ بیتی کو میں جگ بیتی بناتا ہوں

تمام باتوں کی روشنی میں ہم یہ کہیں گے کہ منور رانا نے مختلف موضوعات کو اس طرح غزل کا حصہ بنایا ہے کہ قارئین دنیا کے نشیب وفراز اور زمانے کی افراط وتفریط سے بآسانی آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ ان کی شاعری ہر عہد میں اپنی تازگی وطمانیت کا احساس کرانے میں کامیاب رہے گی۔ ان کی غزلیہ شاعری اردو شعر وادب میں نئے باب کا اضافہ کرتی ہیں۔

Md. Asghar Ali
Research Scholar
L. N. Mithila University
Darbhanga (Bihar)

محمد فیروز

ظفرعدیم : ایک شاعرونثرنگار

ظفرعدیم بلا شبہ ایک عظیم نام ہے۔ اُردو ادب میں ان کی شخصیت مختلف جہات رکھتی ہے۔ وہ بیک وقت ایک شاعر، غزل گو، نظم نگار، ناول نگار، ڈرامہ نگار، افسانہ نگار، انشائیہ نگار، خاکہ نگار، صحافی و ناقد اور مترجم بھی ہیں۔ ان کے ناول ''رات کے آنچل میں''، ''انجو''، ''شوفر''، ''سڑک سیدھی جاتی ہے'' وغیرہ شہرت ومقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک غیر مطبوعہ ناول ''انجان ڈگر'' بھی ہے۔ اس کے علاوہ ''یاسمین''، ''پہاڑیاں بول اٹھیں'' اور ''اُڑان'' جاسوسی ناول بھی لکھے ہیں۔ شاعری کے تعلق سے ان کا ایک دیوان ''دیوانِ عدیم'' بھی ۲۰۰۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔ انہوں نے ''لالہ رُخ'' نام کا ایک منظوم ڈرامہ بھی لکھا ہے۔ ''پھول اور خوشبو'' ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جس کے کئی افسانے قاری کے دلوں کو متاثر بھی کرتے ہیں اور افسانہ نگاری کے فن میں اپنی موجودگی کا احساس بھی دلاتے ہیں۔ ان کے افسانے اپنے عہد کی آئینہ داری بھی پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ملن سیتو، جسم جسم لباس، پھولوں کا ہار، فدائی خاتون اور پھول اور خوشبو قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کے تعلق سے تفضیل احمد کا خیال ملاحظہ فرمائیں :

> ''عدیم کے افسانوں میں انسان دوستی کا بنیادی عنصر ریڑھ کی ہڈّی کی طرح ایستادہ ہے۔ ان کی ساری تحریریں کسی نہ کسی مثبت پیغام کی تفسیریں ہیں۔ زبان و بیان اور اسلوب میں کہیں بھی گرانی یا ترسیلی کمی کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ سبک، سجل اور پرکیف رواں دواں نثر، واقعاتی تواتر، دلچسپ بنت اور نفسیاتی سطحوں کی زیریں لہروں کی عکاسی میں ان کا رنگ اپنے ہم عصروں سے الگ نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنی زبان دانی کی صلاحیت سے بھی افسانہ نگاری میں خوب کام لیا ہے اور کامیابی پائی ہے۔''
>
> (زبان وادب، دسمبر ۲۰۱۴ء ص ۶۷)

ظفرعدیم کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں میں ایک پہلو ان کی ڈرامہ نگاری بھی ہے جو ان کی شاعری کی جولان گاہ ہے۔ انہوں نے ''لالہ رُخ'' میں اپنی قادرالکلامی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو منظوم ڈرامہ پیش کیا ہے وہ بہر اعتبار قابلِ قدر اور اعلیٰ فنی نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس ڈرامہ میں دورِ فرنگ کی ایک

ISSN :2582 -3612

کہانی نظم کی گئی ہے، جس میں انگریزوں کے ظلم وستم، استحصال واستبداد کی دردناک کہانی درج ہے۔ اس ڈرامہ کا شہرہ ڈرامائی ادب میں خوب رہا ہے۔ انہوں نے اپنے دور کے تمام ڈرامہ نگاروں میں اپنی الگ شناخت قائم کی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر احمد حسن دانش کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ''لالہ رُخ'' ایک کامیاب شعری کارنامہ ہے۔ جس میں ظفر عدیم کی شعری صلاحیتوں اور انقلابی جذبوں کا عکس صاف صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ ظفر عدیم کے اندر جو ہیجان واضطراب کی دنیا پوشیدہ تھی اس کا بَرملا اور عملی اظہار اس منظوم ڈرامہ میں تخلیق کار کی کامیابی کی دلیل ہے۔ ادبی دنیا میں ''لالہ رُخ'' کی بڑی پذیرائی بھی ہوئی اس پر اُردو اکادمی، اتّر پردیش سے ان کو اعزاز بھی ملا۔ ظاہر ہے کہ عدیم کی تخلیقات میں انفرادیت ہے اور ان کی پُرکشش شخصیت کی چھاپ ہے۔ ان کی تخلیق میں بقول ڈاکٹر منظر اعجاز ایک نئی کائنات سانس لیتی ہے۔''
>
> (زبان وادب، دسمبر ۲۰۱۴ء ص ۳۵)

اس امر سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ظفر عدیؔم کی شخصیت کئی کئی جہات رکھتی ہے۔ انہوں نے اردو ادب کے بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ انہوں نے لکھنے پڑھنے کو اپنا ذریعہ معاش بنایا تھا۔ جس کی وجہ کر بے شمار تحریریں مختلف ناموں سے منسوب ہیں۔ اس لئے یہ واقعی تحقیق کا مقام ہے کہ ان کی دیگر تخلیقات کی بھی تلاش کی جائے اور اُردو ادب میں وہ جس مقام ومرتبہ کے حامل ہیں انہیں وہ مقام ومرتبہ حاصل ہو جائے۔ اس سلسلے میں ان کے اپنے بیان سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کس قدر اُردو ادب میں اپنا تعاون پیش کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :

> ''جتنی میں نے شاعری کی ہے، اتنی نثر لکھی ہے۔ افسانے پہلے شوق کے تحت لکھا کرتا تھا۔ صحافت میں آنے کے بعد بدقسمتی سے پروفیشنل ہو جانے کی وجہ سے افسانہ نگاری کی جگہ مضمون لکھنے پڑے، فلمی، سیاسی، افسانوں اور ناولوں کے علاوہ مَیں نے متعدد خاکے بھی لکھے ہیں جو مختلف جگہوں پر شائع ہوئے ہیں۔ ٹریجڈی یہ رہی ہے کہ مَیں نے اپنی مطبوعات تخلیق کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا۔ کچھ مضامین ایم۔ جے۔ حسن اور جیکب بھائی زعفران والا کے نام سے بھی لکھے ہیں۔ اخبار ''قومی آواز'' نئی دہلی میں صفحہ چار پر ہر ہفتہ ''پاکستان نامہ'' ڈیڑھ دو سال شائع ہوا۔ پاکستان کے حالات اور سیاسیات پر میرا بالکل

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

مختلف نوعیت کا مضمون ہوتا تھا۔جس پر مجھے داد بھی ملتی تھی اور گالیاں بھی۔''

(زبان وادب دسمبر ۲۰۱۴ء ص ۷۷)

ظفرعدیم کو اللہ نے جو ذہانت و فطانت دی تھی وہ بے مثال اور حیرت انگیز ہے۔انہوں نے پوری زندگی اردو ادب کی جو خدمت کی اس کو وہ خود سمیٹ کر نہیں رکھ سکے۔جس کی وجہ کر ان کی بے شمار تخلیقات سے لوگ نا آشنا رہ گئے۔بہر کیف جو نگارشات ابھی تک موجود ہیں ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں عظیم انسان ہونے کی تمام تر خوبیاں موجود ہیں۔ان کی تمام تحریروں کا احاطہ کرنا اس مضمون میں ممکن نہیں ہے۔اگر ان کے تمام خدمات کا احاطہ کیا جائے تو بیک وقت درجنوں کتابیں وجود میں آسکتی ہیں۔کیونکہ ان کی شخصیت کے جہات کئی ہیں۔تمام جہات کو الگ الگ زُمرے میں نہیں رکھا جا سکتا۔کیونکہ اس سے ان کی شخصیت مجروح ہوتی ہے۔اس سلسلے میں ظفرعدیؔم کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

میرے ادبی سفر کی مختصر سرگذشت یہ ہے کہ اب تک کی زائد از نصف زندگی شاعری اور نثر نگاری کی راہ پر مشقت، استحصال اور حوادث کے مرحلوں سے گزری ہے۔اس دشوار گزار مسافت کی دستیابیوں کی صورت میرے پاس صرف زندگی کے تجربات و مشاہدات ہیں۔مجھ میں خوبیاں کم ، خامیاں زیادہ ہیں۔سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ میں کسی بھی موضوع پر لکھ سکتا ہوں یا لکھنا پڑتا ہے۔پروفیشنلزم میرا سب سے بڑا عیب ہے۔

میں جب ادبی آئینہ میں خود کو دیکھتا ہوں تو بیک وقت تین عکس ابھرتے نظر آتے ہیں شاعر، نثر نگار اور صحافی ، ان میں سے ایک بھی عکس کو کھسکا دیا جائے تو میں Divide ہو کر رہ جاؤں گا۔میرا ہر عکس دیگر عکس کا Supliment بھی ہے اور Multiple بھی۔

مَیں وہی لکھتا ہوں جو محسوس کرتا ہوں اور وہی محسوس کرتا رہا، جس کا تجربہ اور، مشاہدہ ہوتا ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ بیرونی عناصر سے Conerrent ہے۔بیرونی عناصر سے ہی زمان و مکان ہیں۔الغرض میری سوچ میرا موضوع، میری تخلیق سماج سے لاتعلق نہیں ہے۔''

(زبان وادب، دسمبر ۲۰۱۴ء ص ۷۸)

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہے کہ ظفرعدیؔم نے ایک پروفیشنل کی طرح اردو ادب کی خدمت کی اور اس مرحلے میں انہیں جس طرح کے مضامین لکھنے کا حکم ہوا انہوں نے لکھا اور ان کی یہ مشقت استحصال اور

حوادث کا شکار بھی رہی ہے۔ظفرعدیؔم نے کبھی اپنی تعریف کے پل تعمیر کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ Bold ہو کر کبھی اپنی خوبیوں کا اظہار کرنا بھی وہ معیوب سمجھتے رہے۔اس لئے ان کی شخصیت کے بیشتر پہلوؤں سے لوگ نا آشنا رہے ہیں۔ظفرعدیؔم نے سید احمد کے لغات ابجد شماری کے تعلق سے جو خدمات انجام دئے اس کا اعتراف سیّد احمد صاحب نے نہایت کشادہ قلبی سے کیا ہے اور ان کی علمی صلاحیت کا اعتراف بھی کیا ہے۔

ظفرعدیؔم نے دوسری زبانوں کی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔اس سے ان کی علمی و ادبی صلاحیت کی ایک الگ جہت روشن ہوتی ہے۔ترجمہ نگاری کا فن آسان نہیں ہے۔اس عمل کے لئے انسان کے اندر بیک وقت کئی کئی صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔کیونکہ ہر زبان کی اپنی ادبی و ثقافتی خوبیاں ہوتی ہیں۔اور مترجم جب تک ان زبانوں کی ادبی و ثقافتی خوبیوں سے واقف نہ ہوگا وہ اس ذمہ داری سے عہدہ بر آ نہیں ہوسکتا ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر حامد علی خان کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ ظفرعدیؔم میں ترجمہ نگاری کے تعلق سے وہ ہنر بدرجہ اتم موجود تھا جس کی طرف اشارے کئے گئے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی مترجمہ کتابیں بھی ان کے تخلیقی عمل اور رویہ کا حصہ بن گئی ہیں۔''

(زبان وادب، دسمبر ۲۰۱۴ء ص ۷۳)

ظفرعدیؔم کی شاعرانہ عظمت بھی اظہر من الشّمس ہے۔وہ بحیثیتِ غزل گو بھی اپنی شناخت رکھتے ہیں اور بحیثیتِ نظم نگار اُردو میں بہترین نظموں کا سرمایہ انہوں نے ادب کو دیا ہے۔جسے کوئی بھی نظر انداز نہیں کرسکتا ہے۔نظم نگاری میں بھی موصوف نے اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے۔فکری اور فنی دونوں اعتبار سے ظفرعدیؔم کی نظمیں لاجواب ہیں اس سلسلے میں مشہور و معروف ناقد منظر اعجاز کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''ظفرعدیؔم کی نظمیں حمد و نعت یا منقبت سے تعلق رکھتی ہوں یا شخصیات سے متعلق ان کے منظوم تأثرات ہوں یا تاریخی آیات و آثار سے متعلق ان کی نظمیں ہوں یا سیاسی اخلاقی اور عشقیہ احساس و افکار اور جذبات سے متعلق شاعری، ہر جگہ ان کا منفرد رنگ و آہنگ، ان کا مخصوص طرزِ اسلوب اور ان کا مختلف لب ولہجہ انہیں اپنے ہم عمر معاصرین سے ممتاز مقام کا حامل بنا دیتا ہے۔''

(ظفرعدیم ایک سخن ساز اور معاصر غزل کا منظرنامہ مصنفہ ڈاکٹر منظر اعجاز ص ۷۸)

واضح ہے کہ ظفرعدیؔم کی شخصیت پہلودار ہے اور ہر پہلو میں ان کی اپنی راہ انہیں دوسروں سے انفراد و امتیاز عطا کرتی ہے۔اس طرح ان کا یہ انفراد انہیں فیضؔ، مجازؔ، اور ساحرؔ کے صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔نظم ''مطربہ'' کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

پس منظر احساس میں آواز ہے تیری
وہ گونج غزل کی ہے سر گوش ابھی تک
جذبات کا ماحول ہے منظوم ابھی بھی
ہے چشم تصور بھی غزل پوش ابھی تک
ہے عالم دل نشہ اشعار سے مخمور
بے خود ہے نفس، نبض ہے مدہوش ابھی تک
وہ رات غزل کی ، وہ ملاقات غزل کی
میں کر نہ سکا تجھ کو فراموش ابھی تک

المختصر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ظفر عدیمؔ کے یہاں نہ جہات کی کمی ہے اور نہ موضوعات کی۔ ان کی شخصیت شاعری، نثر نگاری اور صحافت تینوں عکسوں سے مکمل ہوتی ہے۔ ان کی زندگی کا نصب العین صرف اُردو کی خدمت ہے۔ چاہے شاعری ہو یا نثر نگاری یا صحافت۔ اس لئے مَیں اپنی بات ان کی صحافت کے تعلق سے ایک اقتباس پر ختم کرتا ہوں ملاحظہ فرمائیں :

''عدیمؔ صاحب نے سر زمین دہلی میں تقریباً تینتیس برسوں تک صحافتی خدمات انجام دیں۔ اور ہزاروں علمی، قلمی، ادبی اور سیاسی مضامین مختلف اخبارات و رسائل میں شائع کئے لیکن ان کا کوئی تراشا یا ریکارڈ نہیں رکھا۔''

(زبان و ادب، دسمبر ۲۰۱۴ء ص ۱۱ مضمون نگار منظر اعجاز)

ظفر عدیمؔ نے انجو، روبی، وغیرہ رسالوں کی اِدارت کی اور کئی اخبارات ''پنچ'' قومی آواز وغیرہ میں صحافت بھی کی۔ خصوصاً ''قومی آواز'' میں تقریباً دو سالوں تک کالم بھی لکھتے رہے۔ اس طرح ۲۶؍ مئی ۱۹۴۸ء میں نمودار ہونے والا اُردو ادب کا درخشاں ستارہ ۱۶؍ نومبر ۲۰۱۳ء کو گُم ہوگیا۔

Md. Firoz
S/o . Md. Zamiruddin
At/po. Majhaulia
Distt. Muzaffarpur
Pin - 843 104
(Bihar)

محمد شہزادہ سلیم شمس

اقبالؔ قومی یک جہتی کا عظیم علمبردار

علامہ اقبالؔ پر اُردو ادب میں جس قدر تحقیق و تنقید ہوئی ہے اور آج بھی جاری و ساری ہے، یہ امر فقید المثال ہے۔ کلیم الدین احمد کو چھوڑ کر کسی بھی ناقد و محقق نے ان کی عظمت و برتری پر حرف نہیں اُٹھایا ہے۔ تقریباً بارہ دہائیوں سے جو کچھ تحقیق و تنقید ہو رہی ہے وہ حیرت انگیز بھی ہے اور خوش آئند بھی۔

علامہ اقبالؔ کے فکری اور فنی دونوں پہلوؤں پر تحقیق و تنقید کا ایک وافر دفتر موجود ہے۔ جو ہمیں ان کی عظمت و وقار سے آشنا کراتا ہے۔ اقبالؔ کا فکری پہلو فنی پہلو سے زیادہ بلند ہے۔ ان کی فکر انسان کو اس کے احسن مقام پر لانے کی ہے۔ ان کے یہاں انسان دوستی، قومی یکجہتی, وطن دوستی, مذہب پرستی اور سیاسی نظریات سب ایک ہی کڑی میں جڑے نظر آتے ہیں۔ ان کا اپنا ایک نظام فکر ہے۔ جس کے ذریعہ وہ اپنے معاشرے اور اپنے ملک کی ترقی کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں اردو ادب کے مشہور و معروف ناقد و محقق عبدالمغنی کا خیال ملاحظہ فرمائیں :

''بانگِ درا کی ''تصویر درد، سے ضرب کلیم کی ''شعاع امید'' تک اقبالؔ نے اپنی گہری اور وسیع وطن دوستی کا جو اظہار کیا ہے وہ قومی یک جہتی کی ایک ولولہ انگیز اور بصیرت افروز دستاویز ہے۔ لیکن یہ وطن دوستی ایک آفاقی انسان دوستی پر مبنی ہے۔ جس سے قومی یکجہتی کے ساتھ ساتھ انسانی یک جہتی کی راہ ہموار ہوتی ہے اور اس انسانی یک جہتی سے قومی یک جہتی کی بنیاد بھی استوار ہوتی ہے۔ ورنہ محض وطن پرستی اپنی معقول حدود سے آگے بڑھ کر ایک وحشیانہ سامراجی جذبے میں تبدیل ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں اِٹلی کی فسطائیت اور جرمنی کی نازیت کی صورتوں میں دنیا کے سامنے آچکا ہے۔''

علامہ اقبال فطرتاً ہمدرد اور انسان دوست واقع ہوئے ہیں۔ انہیں اپنے معاشرے کے تمام لوگوں سے محبت ہے۔ وہ جس قدر مسلمانوں کے ہمدرد ہیں اسی طرح ہندو یا دیگر مذاہب و ملل کے لوگوں سے قربت رکھتے ہیں۔ اس لئے مہاتما گاندھی، ڈاکٹر راجندر پرشاد، پنڈٹ جواہر لعل نہرو، سر تیج بہادر سپرو وغیرہ لوگوں نے اقبالؔ کو وطن دوست اور انسان دوست قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر تاراچند اور رام لعل وغیرہ نے بھی

اس موضوع پر اپنا موقف واضح کیا ہے حالانکہ اقبال کو اپنے افکار و نظریات کی اشاعت و تبلیغ میں سیاسی، سماجی اور مذہبی دشواریاں حائل رہی ہیں۔ ان کے فکری رجحانات ظاہری اور باطنی دونوں طور پر باہمی اختلاط رکھتے ہیں۔ اقبال کا نظریہ قومی یک جہتی عام نظریات اور مغربی نظریہ سے بالکل مختلف ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر منظر اعجاز کا خیال ملاحظہ فرمائیں :

''اقبال کا قومی یک جہتی کا تصور قومیت کے محدود تصور سے الگ ہے۔ گوشت پوشت کا زندہ انسان زمین کے کسی خطے میں کسی مذہب میں ہو، کسی سیاسی اقتصادی نظام میں ہو، گوشت پوشت کا زندہ انسان ہے۔ اس کی محبت اس کی نفرت، اس کی تمنا، اس کے ذہنی جسمانی تقاضے، اس کے فکری نظری میلانات، اس کے جبلی عملی محرکات یکسانیت رکھتے ہیں۔ وہ بنیادی وحدت ہے جس کو پالینا ہی انسان کی گمشدہ جنت کی بازیافت کی ضمانت ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے۔ جب انسان انسان کی حیثیت و اہمیت کو سمجھے اور تہہ دل سے اس کا احترام کرے۔ اقبال کی قومی یکجہتی اسی انسانی اور فکری یک جہتی کے تصور پر مبنی ہے۔''

(اقبال عصری تناظر مصنفہ ڈاکٹر منظر اعجاز ص ۲۵۳)

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہے کہ اقبال جس خطّے میں رہتے ہیں بظاہر چند اختلاف کے اس خطے کے لوگوں سے یکسر مختلف نہیں ہیں۔ ان کی محبت، نفرت، تمنا، ضرورت ان کی فکر، ان کی سوچ اور حرکت و عمل میں یکسانیت فطری تقاضہ ہے۔ یہی یکسانیت جب فکری وحدت میں ڈھل جاتی ہے تو قومی یکجہتی کی مثال بنتی ہے۔ اس لئے اقبال کو اپنے معاشرے کے لوگوں سے ہمدردی بھی ہے محبت بھی۔ وہ ان کی خوشحالی کی تمنا کرتے ہیں اور ان کی بدحالی پر آنسو بھی بہاتے ہیں۔ اسی یکجہتی میں اشتراکیت کا رنگ بھی جھلکنے لگتا ہے۔ اس لئے وہ نظم ''سرمایہ ومحنت'' میں اپنا پیغام مزدوروں تک پہنچاتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

بندۂ مزدور کو جاکر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے، یہ پیام کائنات

اے کہ تجھکو کھا گیا سرمایہ دار ِ حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

اقبال انسان کے سچے دوست ہیں اور آپس میں اتحاد و اتفاق کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد سے ایک جنت نشان معاشرہ کی تعمیر کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ وہ تمام مذاہب وملل کے باہمی تعلقات کو اہم مانتے ہیں۔ اس لئے آپسی اختلاف اور نفاق کی صورت پیدا نہ ہو اس کے لئے اقوام وملل کو ڈراتے بھی ہیں ۔

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائیگا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر

اقبال جانتے ہیں کہ متحد قومیں ہی دنیا میں سرخرو ہوئی ہیں۔ مذہبی، تہذیبی وثقافتی، سیاسی وسماجی، نسلی ولسانی اعتبار پر امتیاز ہونا فطری ہے لیکن ان تمام امتیازات میں یکسانیت کا پہلو بھی موجود ہوتا ہے۔ ان پہلوؤں پر ہمارے اندر وحدت کا جذبہ ہونا لازمی ہے۔ عہد حاضر کے تناظر میں بھی اقبال کے تصور قومی یک جہتی کی اہمیت مسلّم ہے۔ اسی یک جہتی سے اقبال کی حب الوطنی بھی مستعار ہے۔ وطن کا مادی تصور جو جغرافیائی حد بندی کا عکاس ہے۔ اس نظریہ سے اقبال کو اعتراض ہے۔ وہ جغرافیائی حدود کو پار کر کے اس نظریہ کی جارحیت ختم کر دیا چاہتے ہیں۔ ان کا یہ نظریہ تعمیری ہے تخریبی نہیں۔ علامہ اقبال کے افکار ونظریات کی عکاس نظم ''وطنیت'' کے ابتدائی اور اختتامی ایک ایک بند ملاحظہ فرمائیں ۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

ظاہر ہے جغرافیائی حدود والا وطن کا تصور قتل و غارت گری کا باعث ہوتا ہے۔ ایسے وطن سے مختلف اقبالؔ کا وطن آفاقی نقطۂ نظر کا حامل نظر آتا ہے۔ اقبالؔ کے اس افکار و نظریات کی مترشح نظمیں ہمالہ، تصویر درد، ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت اور نیا شوالہ وغیرہ ہیں۔ یہ دلیل بالکل غلط ہے کہ اقبالؔ کی یہ نظمیں جوانہوں نے سفر یورپ کے پہلے لکھی تھی۔ اس سے خود انحراف کیا۔ جبکہ اقبالؔ کے نظریہ میں سفر یورپ کے بعد بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ان کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

یوں تو اے بزم جہاں دلکش ہے ہنگامے تیرے
اک ذرا افسردگی تیرے تماشاؤں میں تھی
میں نے اے اقبالؔ یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستاں کے ماہ سیماؤں میں تھی

اقبالؔ کا تصور وطنیت جغرافیائی حدود سے تجاوز کرتا ہوا پوری دنیا کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ جب اقبالؔ کا یہ تصور حدود کائنات میں پھیلتا ہے تو اس کی اساس انسان دوستی پر ہوتی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ اقبالؔ کا نظام فکر انسان دوستی سے تعلق رکھتا ہے۔ انہیں انسان کی اہمیت، وقار بہت عزیز ہے۔ دراصل وہ انسان کی تربیت کرنے کا سب سے مؤثر طریقہ انسان کا احترام ہی تصور کرتے ہیں اس سلسلے میں منظر اعجاز کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں ۔

''اقبالؔ کے فکری پہلوؤں میں جو تضاد و تفاوت بظاہر پایا جاتا ہے۔ اگر اسے وحدت کے ایک سلسلے میں پرو دیا جائے اور بحیثیت مجموعی جائزہ لیا جائے تو ان کا پیغام احترام انسانیت اور انسانیت دوستی پر ہی مبنی ہے۔۔''

(اقبالؔ اور قومی یک جہتی مصنفہ ڈاکٹر منظر اعجاز ص ۱۱۷)

اس اقتباس کی روشنی میں ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اقبالؔ کے فکر میں جو بھی تنوع ہے وہ سب انسان دوستی پر ہی قائم ہے۔ یعنی ان کی فکر کی لائف لائن انسان دوستی ہے۔ خدا اور انسان کا دوامی رشتہ ایک حقیقت ہے اور اخیر میں انسان کے احترام کے تعلق سے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

برتر از گردوں مقام آدم است
اصل تہذیب احترامِ آدم است

المختصر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اقبالؔ انسان دوست ہیں ان کا وطن جغرافیائی حدود سے بالاتر ہے۔

ISSN :2582 -3612

انہیں تمام مذاہب و ملل سے محبت ہے اسی وجہ کر انہوں نے ہندوؤں کے پیشوا رام چندر جی پر ایک خوبصورت نظم لکھی ہے۔ جو ان کی قومی یک جہتی کی دلیل پیش کرتا ہے۔ خوفِ طوالت کی وجہ کر اس نظم کے اشعار سے گریز کر رہا ہوں۔

Md. Shahzada Salim Shams
Research Scholar
University Deptt. of Urdu
B. R. A. Bihar University
Muzaffarpur (Bihar)

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

عبدالقادر

ادب اطفال کی اہمیت وافادیت

اس بات سے شاید ہی کسی کو انکار ہوسکتا ہے کہ ملک وقوم کی حقیقی دولت اوراس کے سرمایہ بچے ہی ہوتے ہیں کیونکہ آج کے بچے ہی کل کے معمار ہیں۔شاید اسی مناسبت سے انگریزی کا یہ مقولہ زبان زد خواص وعام ہے :

Morning shows the day

لہٰذا کل کو محفوظ،خوشگوار اور تابناک بنانے کے لیے بچے کی جسمانی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی تربیت کا بھی مناسب انتظام کرنا ہوگا۔ بچے کی تربیت میں جہاں دوسرے عناصر معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں وہیں ان کی مادری زبان میں اچھے ادب پارے بھی اثر انگیز اور مددگار ثابت ہوتے ہیں۔چنانچہ بچوں کی ذہنی تربیت اور کردار سازی کی خاطر بچوں کے مخصوص ادب کی اہمیت وضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

زمانۂ طفلی میں ہی بچوں کی تربیت وصحت پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔اس مدت میں ان کی تعلیم وتربیت پر اگر مناسب توجہ دی جائے تو ان کی صلاحیتیں ابھرتی اور سنورتی ہیں۔دین اور دنیا دونوں میں فلاح وکامرانی کے لیے راستے نکلتے ہیں۔وہ اپنی انفرادی خاندانی اور اجتماعی ذمے داریوں کو سمجھنے اور نبھانے کے اہل ہوجاتے ہیں۔وہ معاشرے کے صالح انسان،سماج کے بے لوث خادم اور ملک کے وفادار شہری بن کر ابھرتے ہیں اور آگے چل کر تہذیب وتمدن کے ارتقا میں معاون ہوتے ہیں۔ملک وقوم کی ترقی میں وہ اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

کہنے کی غرض وغایت اس قدر ہے کہ انسان کا عہد طفلی ایک گراں بہا سرمایہ ہے اور یہ سرمایہ جس قدر قیمتی ہوگا ملک وقوم کے ارتقا کو اسی قدر تقویت وطاقت میسر آئے گی۔اس زمانے میں بچوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دینی چاہیے کیونکہ اس زمانے میں بچوں کا ذہن صاف اور سادہ ہوتا ہے بالکل ایک صاف شفاف کورے کاغذ کی طرح یا ایک کینوس کی طرح جس پر بڑی آسانی سے کچھ بھی نقش کیا جاسکتا ہے یا کوئی بھی رنگ بھرا جاسکتا ہے۔

ISSN :2582 -3612

اردو زبان میں بچوں کا ادب کئی روپ اور رنگوں میں ہمارے سامنے موجود ہے اس میں نصاب کی وہ کتابیں بھی ہیں جو بچوں کو سبقاً پڑھائی جاتی ہیں۔ان کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے بچوں کے رسالے ہیں۔ان کے خالی وقت کی دلچسپ مصروفیت کے لیے مختصر حجم کی کہانیاں،قصے،افسانے،ڈرامے اوراسی نوع کے دوسرے مضامین ہیں جن سے ان کی ذہنی اور جمالیاتی تربیت وتزئین اورنشوونما میں مدد ملتی ہیں۔بچوں کے معروف شاعر و ادیب محمد شفیع الدین نیر کا خیال ہے کہ :

> ''بچوں کے لیے ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جن کا مطالعہ شروع ہی سے ان میں اچھے اور برے ادب کی تمیز پیدا کرسکے اور وہ بتدریج ان کو اس قابل بنا سکیں کہ وہ اپنی ہی نہیں،دوسری زبانوں کے ادبی سرمائے سے بھی محظوظ اور مستفید ہوسکیں۔''

(ہماری زبان ہفتہ وار،۲۲مئی،۱۹۷۶ء)

اس کی ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ شروع سے اپنی زبان کے کلاسیکی کو اختصار کے ساتھ آسان زبان میں ڈھال کر ان کے سامنے پیش کیا جائے۔آگے چل کر ترجموں کے ذریعے انھیں دوسری زبانوں کے بچوں کے ادب اور کلاسیکی ادب سے بھی روشناس ہونے کا موقع دیا جائے۔

ایسے ادب سے بچوں میں ابتدا ہی سے وہ شعور پیدا ہوسکے گا جس کی بنا پر وہ ملک کے اچھے شہریوں کی شاہراہ پر گامزن ہوسکیں گے۔آرٹ اور سائنس کی ترقی کے ساتھ ملک میں اتحاد و یکجہتی کی ایک روح پھونک سکیں گے۔ان کے کارنامے حق اور صداقت پر مبنی ہوں گے اور وہ اپنی سیرت کی خوبی سے فخر روزگار اور عالم انسانیت کی بھلائی کی رو سے باعث افتخار ہوں گے۔

بچوں کا ادب درسی ہو یا غیر درسی،اسی تیاری میں بعض امور کا خاص خیال رکھنا بے حد مفید ہے۔مثلاً کس عمر کے بچوں کے لیے کس مقصد سے کیا لکھنا مقصود ہے؟ وہ بچے عام طور پر کیسے ماحول اور کیسی فضا میں پرورش پا رہے ہیں اور انھیں کن اعلا اقدار و مسائل اور موضوعات سے روشناس کرانا ہے؟ طبعی اور نفسیاتی اعتبار سے ان کی عام ذہنی سطح کا معیار کیا ہے اور اعلا کامیاب اور مل جل کر زندگی بسر کرنے کے لیے ان کے خیالات کی تربیت کس نہج پر ہونی چاہیے۔موضوع اور مقصد کا تعین زبان کا معیار،اسلوب کی موزونیت،ذوق ادب کا تدریجی ارتقا،زندگی اور ضرورتوں کا احساس۔غرض مجموعی طور پر بچوں کی تعمیر سیرت کا

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

لحاظ رکھنا ضروری ہوگا۔ بچوں کے لیے ایسی کتابوں اور تعمیری ادب کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے جن کے مطالعے سے بچوں کے اندر کم عمری سے ہی مطالعے کا شوق، غور و فکر کی عادت، مشاہدہ قدرت اور عملی زندگی کے تجربے ان کے لیے محبوب مشغلے بن جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی فرد واحد کے بس کا نہیں۔ البتہ ادب اور سائنس و نفسیات کے ماہرین کے باہمی اور پرخلوص اشتراک سے بچوں کا ایسا ادب مہیا ہو سکتا ہے۔

بچوں کو اچھی زبان سکھانی ہو یا زندگی کے رازہائے سربستہ سے متعارف کرانا ہو بچوں کا ادب ان کی ان مشکلوں کے حل کے لئے از حد ضروری ہے جب تک بچوں کی شخصیت کی صحیح تعمیر نہیں ہوگی زندگی کی کسی راہ میں ان کا ایک قدم نہیں بڑھے گا۔ ایسے میں بچوں کا صحت مند ادب ان کا خضر راہ بنتا ہے۔ مگر جب ہم بچوں کے ایسے ادب کی تلاش کرتے ہیں تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ اردو ادب میں بچوں کے ادب کو کسی زمانے میں بھی قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ بلکہ کلیۃً یہ مان لیا گیا کہ جو کچھ موجود ہے بچوں کے لیے کافی ہے۔ ہمارے بزرگ اور نامور ادیبوں اور شاعروں نے بھی اپنے آپ کو اس صنف ادب سے دور ہی رکھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اردو ادب میں بچوں کا حصہ بالکل نہ رہا۔ متقدمین کی تحریروں سے بھی اس بات کی گرہ کشائی ہوتی ہے کہ بچوں کی خاطر قلم اٹھانا کسرِ شان تھا۔ یا ایسا کرنے میں ان کی علمی صلاحیت و عظمت کے چہرے مسخ ہو جاتے۔ اردو ادب میں پچھلے پچاس برسوں میں صرف دو ہی نام ایسے ملتے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی صرف بچوں کے ادب کے لیے وقف کر دی۔ اسمٰعیل میرٹھی اور شفیع الدین نیّر جنھوں نے ہر عمر کے بچوں کے لیے متعدد کتابیں لکھیں اور وقت کی اس اہم ضرورت کو پورا کیا۔

بچوں کا ادب تحریر کرتے وقت یہ بات ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ بچے خلا میں معلق نہیں ہوتے وہ بھی اسی سرزمین کے باسی ہیں۔ وہ بھی گرد و پیش کی چیزوں کو دیکھتے ہیں اور ان کا جائزہ لیتے ہیں۔ پیڑ پودے، ندی و نالے، سمندر، پہاڑ، آسمان، ستارے، سورج، چاند، پھول، مکانات، سواریاں وغیرہ بچے کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتے ہیں۔ بچہ جب دنیا کی ان چیزوں کو دیکھتا ہے تو اسے ان چیزوں کے بارے میں جاننے کی خواہش ہوتی ہے۔ مثلاً وہ ایک درخت کو دیکھتا ہے تو جاننا چاہتا ہے کہ درخت کیا ہے؟ یہ زمین سے کیسے اگتا ہے۔ اس میں جڑ، پتے اور شاخیں کیسے نکل آتی ہیں۔ پھول اور پھل کیسے نکل آتے ہیں، کیا وہ بھی ہماری طرح جاندار ہیں؟ کیا وہ بھی غم کے شکار ہوتے ہیں کیا وہ بھی خوشیاں مناتے ہیں؟ کیا وہ بھی کھاتے اور سانس لیتے ہیں؟ وہ چلتے کیوں نہیں لوگ انھیں کاٹ کیوں لیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ISSN :2582 -3612

غرض کہ اس طرح کے سینکڑوں سوالات بچوں کے ذہن میں کلبلاتے اور اٹھتے ہیں۔ وہ ان سوالوں کا جواب کتابوں سے حاصل کر سکتے ہیں۔ لہٰذا بچوں کے ادب کی ضرورت یہاں بھی محسوس ہوتی ہے۔ ہم ان کے لیے ادب فراہم کر کے ان کے گرد و پیش کی چیزوں کے متعلق معلومات بہم پہنچا سکتے ہیں۔

بچے جس ماحول میں رہتے ہیں۔ وہاں خیر و شر، نیکی و بدی، اچھائی اور برائی کی طاقتیں موجود رہتی ہیں۔ اس ماحول میں سبھی چیزیں سودمند نہیں ہوتیں ان میں کچھ نقصان دہ مواد اور مضرت رساں بھی ہوتی ہیں مثلاً بھینس، گائے، بکری، بیل، گدھا، گھوڑا، ہاتھی وغیرہ ایسے جاندار چوپائے ہیں جن سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے ان سے مختلف طرح کے کام لیتا ہے لیکن جانوروں کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے جو اپنی درندگی کے لیے مشہور و معروف ہے۔ ایسے جانوروں میں شیر، بھیڑیا، چیتا، لکڑ بگھا اور دوسرے جانوروں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان کا کام جانداروں کو چیر کر کھا جانا، فصلوں کو نقصان پہنچانا، کھیتوں کو تباہ کرنا ہے۔ ایک بچہ سن کر اپنے مشاہدات کی بنیاد پر سودمند جانوروں سے جہاں ہمدردی، محبت اور شفقت جتاتا ہے وہاں نقصان پہنچانے والے جانوروں سے نفرت، خفگی اور دشمنی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ ان سے ڈرتا بھی ہے۔ مطلب یہ کہ خوف بھی کھاتا ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ یہ شر پسند جانور اس کے تابع ہوں اور وہ جس طرح چاہے ان پر حکمرانی کرے۔ عملی طور پر وہ ایسا نہیں کر پاتا۔ لہٰذا وہ تخیل کی دنیا آباد کرتا ہے اور اپنے خیال کی دنیا میں ہی شر پر خیر کو فاتح ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ یہاں اس کے تخیل کی پرواز کام آتی ہے۔ یہ خیالی آزادی بچوں کے لیے نہایت کارآمد ہوتی ہے۔ وہ اس کے سہارے آسمان، چاند اور ستاروں کی سیر کرتے ہیں۔ جنگلوں اور پہاڑوں میں دندناتے پھرتے ہیں۔ سمندروں کے سینوں پر تیرتے ہیں۔ صحرا کا دشوار اور کٹھن سفر کرتے ہیں۔ پریوں کے ٹھکانے تک رسائی حاصل کرتے ہیں، دیوؤں سے لڑتے جھگڑتے ہیں اور کامیاب و کامران واپس آتے ہیں۔

Abdul Quadir
Research Scholar
Deptt. of Urdu
J. P. University, Chapra

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

کوثر ناز

رشید احمد صدیقی ایک صاحب طرز نثر نگار

رشید احمد صدیقی ۱۸۹۲ء میں جونپور کے ایک قصبے ''مریاہو'' میں پیدا ہوئے۔ ادبی دنیا میں بحیثیت مزاح نگار، طنز نگار اور انشاپرداز ان کی شناخت قائم ہے۔ ''مضامین رشید''، ''خنداں''، ''گنجہائے گراں مایہ ''اور'' ذاکر صاحب'' ان کی بہترین تخلیقات ہیں۔ ''مضامین رشید'' اور ''خنداں'' ان کے مزاحیہ مضامین پر مشتمل ہیں اور ''گنجہائے گراں مایہ '' اور ذاکر صاحب شخصیتوں کے مرقعے ہیں۔ آپ کی طرز نگارش کے حوالے سے پروفیسر آل احمد سرور فرماتے ہیں :

''رشید صاحب ہنسی ہنسی میں نہ صرف بہت کچھ کہہ جاتے ہیں بلکہ سوچنے کے لئے بھی بہت کچھ چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ رعایت لفظی سے بڑا کام لیتے ہیں۔ ان کے فقروں میں صوتی حسن بھی ہے اور موسیقی بھی۔ وہ قصے بھی سناتے ہیں قول محال سے بھی کام لیتے ہیں جاندار اور خیال انگیز تشبیہات کے چمن بھی آراستہ کرتے ہیں اور اپنے تخیل کی مدد سے زندگی گزارتے ہوئے لمحات کو ایک ابدی روشنی اور ایک سدا بہار رنگینی بخش دیتے ہیں۔''

(رشید احمد صدیقی شخصیت اور ادبی قدر و قیمت، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، ص-۵۶)

ادبی منظرنامے پر رشید احمد صدیقی کو انفرادیت اس ضمن میں بھی حاصل ہے کہ انہوں نے اردو نثر کی ثقاہت اور طہارت کو ہر آلودگی سے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اس پر اضافہ یہ کہ ان کی جودتِ طبع اور ذکاوت جس نے نثر کے رگ و ریشے میں ایک ایسا سحر پیدا کر دیا ہے جس کی تقلید آسان نہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رشید صاحب کی تحریروں میں جو کرشمہ یا ادا ہے اسے ہم ان کی خوش طبعی مزاق سلیم اور بزلہ سنجی بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''رشید احمد صدیقی کا مقام اردو نثر میں ایک نمائندہ ادیب کا ہے۔ وہ اپنے طرز کے آپ موجد اور اپنے انداز کے آپ ہی خالق ہیں۔ اردو نثر میں ان کی حیثیت ایک مستقل مکتبہ کی ہے۔ اس چراغ سے کئی اہم چراغ روشن ہوئے ہیں۔ اردو کے بعض مشہور ادیب اور نقاد انہیں کے مکتبہ

ISSN :2582 -3612

فکر کے پروردہ ہیں...... رشید صاحب ایک ادیب کے اعتبار سے اسلوبی امکانات کی بلندیوں تک جا پہنچے ہیں۔ انہوں نے اردو ادب کو سرور اور خورشید الاسلام جیسا نقاد دیا ہے۔ ان کے اثرات اس دور کے بڑے بڑے فنکاروں پر مرتب ہوئے ہیں۔''

(رشید احمد صدیقی شخصیت اور فن، ڈاکٹر اقبال اختر، ص-۷۸)

تمام باتوں کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رشید احمد صدیقی کی نثر نے اپنے ہم عصر ادیبوں کو کافی متاثر کیا اور آنے والی نسل کو بھی۔ مختصر یہ کہ ان کی ہر تحریر ان کی شگفتگی طبع کا اظہار کرتی ہے۔

رشید احمد صدیقی کی تخلیقی ہنرمندی کے تعلق سے اس بات کا بھی انکشاف ضروری ہے کہ ان کی ظرافت فن کے جن اصولوں کی تابع ہے اس کی ابتدا اگرچہ ہنسی کے شرارے سے ہوئی ہے، لیکن یہ ہنسی بعد میں مسرت اور بصیرت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ رشید صاحب نے ظرافتی فن کی ان منازل و مقامات کو سلامت روی کے ساتھ عبور کیا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ رشید صاحب نے نثر کی لطافت کو کسی کثافت سے آمیز کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے کیوں کہ رشید صاحب اس بات سے آشنا تھے کہ ادبی اور علمی ظرافت کا سب سے بڑا وصف یہ ہوتا ہے کہ وہ اتنی سرعت کے ساتھ اپنا کام کر جاتی ہے کہ ہمیں احساس نہیں ہوتا۔ اس کی حیثیت بنفشی شعاعوں کی ہے جو مشام جسم میں نہایت فرحت بخش طریقہ پر داخل ہوتی ہیں۔ ظرافت کی عطا جمالیات سرخوشی ہے جو ہر بڑے فن پارے کی جان ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رشید احمد صدیقی نے بیشتر مزاح سے کام لیا ہے، لیکن طنز کی آمیزش بھی نظر آتی ہے۔ جس سے لطافت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس سلسلے سے مضامین رشید کا یہ اقتباس دیکھئے :

''...... میں نے آج تک کسی دھوبی کو میلے کپڑے پہنے نہیں دیکھا اور نہ خود اس کو اپنے کپڑے پہنے دیکھا، البتہ اپنا کپڑا پہنے ہوئے ضرور دیکھا۔''

(مضامین رشید، رشید احمد صدیقی، ص-۴۵)

اس اقتباس کے حوالے سے یہ کہا جائے گا کہ رشید صاحب نے اپنا اور اپنے کی مغالطہ آمیز ترکیب کے ذریعہ تمام دھوبیوں پر طنز کیا ہے۔ مطلب یہ کہ رشید صاحب کا طنز بھی ایک طنز ملیح ہے جس میں خوش دلی ہے انتقامی جذبہ نہیں۔

خالص مزاح میں رشید صاحب کی طبیعت کی جولانیاں انتہا پر ہوتی ہیں۔ کیوں کہ مزاح ان کا خاصا ہے۔ ان کا مزاح ہزار شیوہ ہے اس پر اضافہ یہ کہ قوت اختراع بھی غیر معمولی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رشید صاحب مزاح کی تمام صورتوں موازنہ تکرار، رعایت لفظی، قول محال، صنعت، تجنیس، تحریف،

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

کفایت، الفاظ اور مزاحیہ صورت واقعہ سے وہ کام لیتے ہیں۔اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''ہم دیکھتے ہیں کہ مختصر جملوں میں بھی رشید صاحب کے تخلیقی وجدان کے بعض نایاب جلوے موجود ہیں۔ان کی نفسیاتی ژرف نگاہی وسیع المشربی اور گہری آفاقی نظر وہ ہے جو زندگی کے متلاطم دریا کی تہہ میں اتر سکتی ہے جو سنگ ریزے پر بھی پڑتی ہے تو اس میں سے حرارت اور روشنی کی ہزار ہا کرنیں پھوٹ پڑتی ہیں۔''

(رشید احمد صدیقی شخصیت اور ادبی قدر و قیمت، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، ص ۱۸۹)

مختصر یہ کہ ان کے مضامین کے مطالعہ کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کے یہاں زیر لب تبسم اور نشاط کے متعدد نگار خانے آباد ہیں۔ یہ ایک آبشار ہے جس سے مسرت اور بصیرت کا پانی بہتا رہتا ہے، لیکن کبھی کم نہیں ہوتا۔

رشید احمد صدیقی کا نثری امتیاز یہ بھی ہے کہ انہوں نے مزاحیہ اسلوب کئی طرح سے وضع کئے ہیں۔اس کے علاوہ کردار نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے، لیکن احتیاط سے کام لیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر سے رسوائی نہیں ہوتی کیوں کہ وہ نثر نگار پہلے ہیں ظرافت نگار بعد میں۔ ان کی تحریریں ان کے صاحب طرز نثر نگار ہونے کا پتہ دیتی ہیں۔ ان کی تحریریں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ وہ اپنے خیالات کی شیرازہ بندی کے لئے جو لفظ جس جگہ اور جس طور پر استعمال کرتے ہیں ان کی ترتیب میں ایک فطری موزونیت تناسب اور آہنگ ہوتا ہے۔ اس کا سر مدھم اور پر وقار ہوتا ہے۔ ان کا طرز کلام خطابت بلند آہنگی اور آرائش سے گریزاں ہے۔ وہ جزئیات کی مصوری اس طرح کرتے ہیں کہ محاکات کا حسن نظروں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ مطلب یہ کہ ان کی نظر میں اجمال بھی ہے اور قطعیت بھی۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جو دوسروں سے انہیں ممتاز و ممیّز کرتی ہیں۔اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''میرا خیال ہے کہ اردو نثر کے ساتھ جتنی بے تکلفی رشید صاحب نے برتی ہے ان سے پہلے اور خود ان کے دور میں کسی اور نے ہرگز نہیں برتی۔ اکبر کی طرح رشید صاحب نے بھی جو موضوع چاہا اختیار کر لیا یا آل انڈیا ریڈیو دہلی کی خاطر اختیار کرنے پر آمادہ ہو گئے، لیکن موضوع کو ہمیشہ اپنی گرفت میں رکھا۔ خود کبھی موضوع کی گرفت میں نہ آئے۔ جہاں سے جی چاہا مضمون شروع کر دیا اور بھٹکنے کے باوجود عنوان اور موضوع کو ایک دوسرے سے بے تعلق نہ ہونے دیا۔ پھر جس موضوع کے متعلق جو بات

ISSN :2582 -3612

بھی کہنا چاہا اسے کم سے کم لفظوں میں جلد سے جلد کہہ دیا۔''

(رشید احمد صدیقی شخصیت اور ادبی قدر و قیمت، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، ص-۱۹۹)

اردو نثر نگاری میں رشید احمد صدیقی کی اپنی شناخت قائم ہے۔انہوں نے کئی طرح کی نثر لکھی ہے۔جس میں ایک مخصوص طرح کا آہنگ ہے اور وہی ان کی پہچان بھی ہے۔مختصر یہ کہ رشید احمد صدیقی کی نثر میں سودا کا تخیل اکبر کی صنعت لفظی اور غالب کی نکتہ سنجی اور شوخی ہے۔اس سلسلے سے قطب الدین اشرف فرماتے ہیں :

''غالب اور رشید احمد صدیقی کی نثر میں اشتراک کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ دونوں کے یہاں گفتگو کا فن کارفرما ہے۔ غالب کے یہاں تسلسل ہے جب کہ رشید احمد صدیقی ربط و ترتیب کا لحاظ نہیں رکھتے۔ وہ آزادی خیالات کے حامی ہیں۔اس لئے ان کے اسلوب اور موضوع دونوں میں تنوع ہے...... رشید احمد صدیقی کی نثر نہ غالب کی طرح سادہ اور بے غبار ہے اور نہ آزاد کا ساز و تخیل انہیں میسر ہے بلکہ لطیف اور پر فکر ہے اس لئے وہ دونوں کے درمیان کے انشا پرداز نظر آتے ہیں۔''

(رشید احمد صدیقی کی ظرافت تجزیاتی مطالعہ، قطب الدین اشرف، ص-۲۳۶)

مختصر یہ کہ ادبی دنیا میں صاحب طرز نثر نگار کی حیثیت رشید احمد صدیقی کی منفرد شناخت قائم ہے۔ان کی تحریریں اس بات کا بھرپور انکشاف کرتی ہیں۔لہٰذا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ رشید احمد صدیقی کی تحریریں آج بھی قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی اہمیت رکھتی ہیں۔

Kausar Naz
Research Scholar
University Depttl of Urdu
B. R. A. Bihar University
Muzaffarpur

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ریحان احمد قادری

اجتبیٰ رضوی کی شاعری

اجتبیٰ رضوی مابعد الطبیعاتی فکر کے آخری بڑے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں ماورائیت زیادہ اور ارضیت کم بہت ہی کم ہے۔ پھر بھی ان کی شاعری کا مطالعہ قاری کو انبساطی کیفیت ولذت سے سرشار کئے بغیر نہیں رہتا۔

اعلیٰ معیار کی پرسوز اور تیز حسیت فکر کی حامل شاعری کی بنیادی صفت بھی یہی ہے۔

اجتبیٰ رضوی کا تعلق خاک بہار سے ہے۔ان کا ایک ہی مجموعۂ کلام ''شعلہ ندا'' ۱۹۵۴ء میں شائع ہوسکا۔''شعلۂ ندا'' کی اشاعت کے بعد سب سے پہلا مضمون پروفیسر ارشد کاکوی کا ''نگار'' لکھنو میں آیا۔ صاحب مضمون نے اس میں علامہ جمیل مظہری کو مخاطب کیا تھا۔شاید یہ مضمون مکتوب کی شکل میں تھا اور اس کی حیثیت تاثراتی تھی۔لیکن تاثراتی ہوتے ہوئے بھی یہ خاصے کی چیز تھی۔اس کے بعد ڈاکٹر اختر اورینوی نے اجتبیٰ رضوی کی شاعری پر مضمون لکھا جو اول الذکر کی تنقیدی کتاب ''سراں ومنہاج'' میں شامل ہے۔ ''صبح نو'' پٹنہ میں ظفر حمیدی نے اجتبیٰ رضوی کا خاکہ لکھا تھا جس میں ظفر حمیدی نے اجتبیٰ رضوی کے نظریات وعقائد پر روشنی ڈالی۔لیکن جیسا کہ مجھے یاد آرہا ہے خاکہ نگار نے اس خاکہ میں اجتبیٰ رضوی کی شاعری پر کوئی تنقیدی بحث نہیں کی۔ پھر بھی حتمی طور پر کچھ کیا نہیں جاسکتا۔اس لیے کہ خاکہ کو پڑھتے ہوئے ایک زمانہ گذر گیا۔اب ساری باتیں یاد نہیں ہیں۔ حافظہ کے سہارے ہی میں ارشد کاکوی اور ظفر حمیدی کے مکتوب نما مضمون اور خاکہ کا ذکر کررہا ہوں۔

ظہیر ناشاد نے بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ انہوں نے بھی مضمون لکھا ہے۔ اجتبیٰ رضوی کے صاحبزادہ مرتضیٰ اظہر رضوی نے اپنے باپ کی ایک عمدہ نظم ''پہنائی'' کا بھرپور تجزیہ کیا۔ یہ تجزیہ ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی میں شائع ہوا۔''پہنائی'' معریٰ نظم ہے اور بلیغ فلسفیات فکر کی حامل ۱۹۶۱ء یا ۱۹۶۲ء میں دو یا تین معریٰ نظمیں کہنے کے بعد اجتبیٰ رضوی نے شاید کچھ نہیں کیا۔غزل کے دو چار شعر اگر کہے ہوں تو کہے ہوں جن کا مجھے علم نہیں ہے۔ اس طرح برسوں سے ان کے یہاں فکر اور تخلیق کا سناٹا چھایا ہوا ہے۔اس سناٹے کے اسباب کیا ہیں؟ نہیں معلوم! جمیل مظہری نے زندگی کی آخری گھڑی تک شعر کہا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پھول پتوں میں نہاں ہوکر بہت دیر تک نہیں چھپ سکتا، انسان کا ذاتی

ISSN :2582 -3612

جوہر چمک کر رہتا ہے۔لیکن اجتبیٰ رضوی کی طرح اگر کوئی شاعر اپنی شہرت کا خود دشمن ہوجائے تو پھر اس کی شہرت کس طرح پھیلے گی؟ شہرت کی بھوک سب کو ہوتی ہے۔ کسی کو کم اور کسی کو زیادہ۔لیکن جمیل مظہری اور پرویز شاہدی یہ دو شخصیتیں ایسی گذری ہیں جو شہرت کے پیچھے بھاگنا جانتی ہی نہیں تھیں۔مگر یہ دونوں اپنی شہرتوں کے ویسے کٹر دشمن بھی نہیں تھے جیسا کہ اجتبیٰ رضوی ہیں۔نہیں معلوم کس نفسیاتی گرہ کے تحت انہوں نے اپنے لیے گمنامی کا اندھیرا پسند کیا۔''شعلۂ ندا'' میں ایک رباعی ہے جس سے اس معاملہ میں ہمیں کچھ روشنی ملتی ہے ؎

میں اور بغل میں لیکے بستہ جاؤں
بن کر محفل میں اک تماشا جاؤں
کفارۂ جرم خود شناسی رضوی
یہ ہے کہ مشاعروں میں کھینچا جاؤں

اجتبیٰ رضوی مابعد الطبیعات کے بہت بڑے آخری شاعر ہیں۔ان کی زندگی کی جھولی میں نہ صرف مختلف علوم بلکہ روزمرہ کے تجربات ومشاہدات اور واردات بھرے ہوئے ہیں۔انہوں نے مذاہب عالم کا ڈوب کر مطالعہ کیا ہے۔سائنسی انکشافات اور مادی ارتقا کی رفتار سے بھی وہ اتنے باخبر ہیں جتنا ایک پڑھا لکھا چاق وچوبند قسم کا دنیادار انسان مذاہب اور عقیدوں کو وہ آنکھ موند کر سب کچھ نہیں سمجھتے۔سائنسی علوم کے ارتقاء اور ان کے مستقبل کے امکانات پر ان کی گہری نظر ہے۔انہوں نے ترک وفرار کی زندگی کا بھی مزہ لوٹا ہے۔اور گیا کی پہاڑیوں کی کھوہ سے لے کر بنارس تک الٰہیات کے مطالعہ ومشاہد اور حقیقت کی تلاش میں جو زندگی گذاری ہے اس نے ان کی روحانی پیاس بجھائی ہو یا نہیں بجھائی ہو لیکن تلاش وجستجو کے اس سفر نے ان کو جن تجربوں سے روشناس کرایا وہ مادی بھی ہیں اور روحانی بھی ان میں ماورائیت بھی ہے اور ارضیت بھی اور یہی تجربے ان کی رباعیوں، نظموں اور غزلوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔

نظم ''شعلۂ ندا'' میں اجتبیٰ رضوی نہ صرف اپنی قوم کی ذلت وخواری پر افسردہ ہیں بلکہ ساری نوع بشر کے کرب کو محسوس کرکے اس کرب کے پیدا کرنے والے چند بالادست افراد، سماج اور حالات سے اپنی شدید نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ جبر وتسلط جو چند بالادست افراد کا مطمح نظر ہوتا ہے اس کے خلاف ''شعلہ ندا'' کا یہ بند قابل غور ہے ؎

جس جگہ سینۂ انسان میں گھٹی ہے آواز
ٹوٹ جائے گا وہاں جبر و تسلط کا ساز
ہضم کرنے کی تمنا میں ہے جو معدۂ آز
اس سے کہدو کہ کوئی دم میں در فتنہ ہے باز

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

جل کے وہ خاک نہ ہوجائے یہ ممکن ہی نہیں
قہرِ حق جاگ کے سو جائے یہ ممکن ہی نہیں

اجتبیٰ رضوی کی وہ رباعیاں، نظمیں اور غزلیں جن میں حکیمانہ فکرونظر کی آمیزش ہے یا یوں کہئے کہ جن میں فلسفیت ہے ان کا شعری آہنگ بڑی حد تک مجروح ہوگیا ہے۔ زبان میں ثقالت آ گئی ہے۔ ادق الفاظ اور اضافتوں کے بے جا استعمال نے ایسی رباعیوں، نظموں اور غزلوں کو ثقیل بنا کر ان کے اندر کے حسن کو کم کردیا ہے۔ لیکن یہ بات فکری و پیامی شاعری کے لئے ناگزیر بھی ہے۔

آخر میں ایک بار پھر یہ کہتا چلوں کہ اجتبیٰ رضوی نے ماورائی تصورات کے تحت شاعری ضرور کی ہے لیکن ان کا ذہن توہم پرست نہیں ہے۔ وہ زندگی اور دنیا کو سائنسی اور عقلی و مادی نقطۂ نظر سے دیکھتے اور برتتے ہیں۔ ''سچوں کے تصورات جھوٹے نکلے'' ان کے اس سائنسی اور حقیت پسند ذہن کی طرف لطیف مگر بلیغ اشارہ کرتا ہے۔ ان کے افکار و تصورات میں پہلے روح تب مادہ اور پہلے مادہ تب روح دونوں کا امتزاج ہے۔

انہوں نے مطالعہ الٰہیات پیش کرنے کے باوجود کہیں بھی سائنس کے عظیم و بیکراں امکانات سے روگردانی نہیں کی ہے۔ زمین اور زمین سے ماورا اگر کچھ ہے تو انہوں نے دونوں کو سمجھنے اور سمجھ کر اپنی شاعری میں برتنے کی ایماندارانہ کوشش کی ہے۔

Rehan Ahmad Quadri
Research Scholar
University Deptt. of Urdu
L. N. Mithila Unviersity
Darbhanga

ISSN :2582 -3612

حیدرعلی

غالب کی شاعری میں المیاتی عناصر

المیہ شاعری کے اظہار میں ہم سب سے پہلے میرؔ کا نام لیتے ہیں لیکن غالبؔ کے یہاں بھی شدید المیہ عناصر موجود ہیں۔ کہیں کہیں پر یہ عناصر اتنی شدت کے ساتھ ملتے ہیں کہ میرؔ کی المیہ شاعری بھی پھیکی معلوم ہونے لگتی ہے۔ غالبؔ نے دوسرے شاعروں کے مقابلے میں غم کے لیے نئے تجربے کیے تھے اور ان تجربوں کو انھوں نے اپنی شاعری میں بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کہیں انھوں نے غم کے تجربے براہ راست بیان کیے ہیں کہیں زبردست المیاتی انداز میں۔

ذیل میں ہم غالبؔ کے مختلف شعروں کے جائزے اور تجزیہ کے ذریعہ غالبؔ کے یہاں غم کی مختلف کیفیتوں کو پیش کریں گے۔ ملاحظہ ہوں۔

رنج کا خوگر ہو انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

غالبؔ کی زندگی کے بے شمار غموں کا اظہار اس شعر سے ہوتا ہے۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

اس شعر میں غموں کی زیادتی کی شکایت نہیں بلکہ شکایت اس بات کی ہے کہ اگر اتنے زیادہ غم دینے تھے تو مجھے کئی دل دیئے ہوتے کیونکہ ایک دل ان غموں کو برداشت نہیں کرسکتا۔

بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائے گی
وہ جو ایک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

اے ناامیدی بس کر کہیں ایسا نہ ہو کہ میری کوشش میں کوئی لذت ہی نہ رہے کیونکہ میں کوشش اس امید پر کررہا ہوں کہ مجھے کامیابی حاصل ہوگی لیکن ایسا نہیں ہے۔ میری تمام کوششوں کے باوجود مجھے ناکامی ہی حاصل ہورہی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہجوم ناامیدی میں گھر کر میرا حوصلہ ٹوٹ جائے اور کوشش میں کوئی زور باقی نہ رہے۔

جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لیے ہوئے
ہوں شمع کشتہ در خور محفل نہیں رہا

میں زندگی کی حسرت کا داغ لیے ہوئے اس دنیا سے جا رہا ہوں میری حالت اس بجھی ہوئی شمع کی طرح ہے جو بجھ جانے کے بعد محفل کے قابل نہیں رہتی۔

اس شعر میں زندگی کی تمناؤں کے پورا ہونے سے پہلے ہی زندگی کا خاتمہ یعنی موت کا آجانا ایک المیہ ہے۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

پاؤں میں پڑے ہوئے آبلوں سے چلنے میں تکلیف ہوتی ہے لیکن راہ میں پڑے خار کو دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے کہ اب یہ آبلے نوک خار سے پھوٹ جائیں گے اور میری تکلیف دور ہو جائے گی۔ان اشعار میں المیہ پہلو شدت کے ساتھ موجود ہے۔ذیل کے اشعار میں محرومی اور ناامیدی کے احساس کو دیکھا جا سکتا ہے۔

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

ان اشعار میں موجود غم زندگی میں آنے والی ناکامی اور محرومی سے پیدا ہونے والا غم ہے۔

غالبؔ نے اپنے متعدد اشعار میں اپنے گھر کی ویرانی کا ذکر کیا ہے جس سے ان کی پریشانیوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ہر سبزہ زار، ہر در و دیوار غم کدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ
اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا

ہمیں غالبؔ کے یہاں بعض اشعار میں گریہ کا موضوع بھی نظر آتا ہے۔ایک شعر ملاحظہ ہوں۔

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا

ان اشعار میں گریہ کی شدت شاعر کی زندگی کے مصائب کو ظاہر کرتی ہے۔اس گریہ کی وجہ سے شاعر کا غم شدید ہو گیا ہے۔

غالبؔ نے ہجر کی کیفیت کو زیادہ موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

نہ دے نامے کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرض ستم ہائے جدائی کا

ذیل میں غالبؔ نہ ہجر محبوب میں اپنی پریشانی کا ذکر کیا ہے۔

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ، ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

اس شعر میں شاعر نے اپنے آنسوؤں کو شمع فروزاں سے تشبیہ دی ہے۔ عاشق اپنے محبوب کی جدائی میں خون کے آنسو بہا رہا ہے اور یہ کہہ کر خود کو تسلی دے رہا ہے کہ میں یہ سمجھوں گا یہ خون کے آنسو نہیں بلکہ دو شمعیں روشن ہیں۔

انسان کی زندگی کے مصائب کی زیادتی اور اس حالت میں کسی غم خوار کا نہ ہونا انسان کو تنہائی پسند بنا دیتا ہے۔یہ رجحان ہو کو غالبؔ کے یہاں بھی نظر آتا ہے۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اِک گھر بنانا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

ان اشعار میں دنیا سے بیزاری اور بے گانگی کا احساس پوشیدہ ہے۔شاعر کو ایسے مقام کی تلاش ہے جہاں کوئی اس کا دوست ہو نہ ہمدرد۔

غالبؔ نے فنا اور بے ثباتی دنیا کا مضمون بھی اس انداز سے پیش کیا ہے کہ اس میں المیاتی عناصر کی دھوپ چھاؤں پورے طور پر نظر آتی ہے۔یہ اشعار ملاحظہ کریں۔

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جُز مرگِ، علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سَحر ہونے تک

موت آنے پر ہی غموں سے نجاب حاصل ہو سکتی ہے جس طرح ایک شمع پوری رات جلتی رہتی ہے

اور صبح ہونے پر بجھ جاتی ہے یعنی اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔اسی طرح انسان کو بھی غم کی آگ میں جلنا پڑتا ہے۔جب تک موت نہ آجائے۔یہ شعر بھی ملاحظہ کریں۔

قید حیات و بند غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یعنی جب تک موت نہ آجائے زندگی کے ساتھ غموں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو، اسد
عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

انسان کی ہستی ایک فریب ہے اس کو ایک دن فنا ہوجانا ہے۔یہ دنیا آرزو کا ایک خوبصورت حال ہے۔انسان کو فریب میں نہ آنا چاہیے۔

اس شعر میں زندگی کے فانی ہونے کا احساس موجود ہے۔

کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ قصہ تمام
بطرز اہل فنا ہے فسانہ خوانی شمع

شمع کا فسانہ خوانی یعنی اس کا جلتے رہنا ہی اس کی زندگی ہے۔جلتے جلتے اس کو ختم ہوجانا ہے۔اسی طرح انسان کی زندگی کو بھی ایک دن فنا ہوجانا ہے۔

اس شعر میں شمع کے بجھ جانے سے مراد انسانی زندگی کا ختم ہوجانا ہے۔

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے ذلیل سحر سو خموش ہے

اس شعر کی بہترین تشریح خود غالب نے ان الفاظ میں کی ہے۔پہلا مصرعہ ''ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے'' یہ مبتدا ہے۔شب غم کا جوش یعنی اندھیرا ہی اندھیرا۔ظلمت غلیظ سمرنا پیدا گویا خلق ہی نہیں ہوتی۔ہاں ایک دلیل صبح کے وجود پر ہے یعنی بجھی ہوئی شمع اس رہ سے کہ شمع اور چراغ صبح کو بجھ جایا کرتے ہیں۔لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شی کو دلیل صبح ٹھہرایا ہے وہ خود ایک سبب ہے منجملہ اسباب تاریکی ہے۔

''پس دیکھا چاہیے جس گھر میں علامت صبح مؤید ظلمت ہوگی وہ گھر کتنا تاریک ہوگا''

شب غم کا جوش شاعر کی زندگی کا ایک المیہ ہے۔

Haider Ali
Research Scholar
Deptt. of Urdu
J. P. University, Chapra

ISSN :2582 -3612

تبسم خاتون

حنیف ترین کی غزلوں کا ناقدانہ جائزہ

حنیف ترین بیسویں صدی کی آخری دہائی میں اردو ادب کے منظرنامے پر ابھرنے والے ایک شاعر ہیں۔انھوں نے روایت کی پاسداری کے ساتھ جدید افکار و نظریات اپنی شاعری میں پیش کئے ہیں۔ان کی شاعری اپنے دور کا آئینہ ہے۔انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز غزل گوئی سے کیا تھا۔ان کی پہلی غزل ۱۹۸۶ء میں ''اخبار نو'' اور ''توازن'' مالیگاؤں میں چھپی تھی۔ان کا پہلا شعری مجموعہ ''رباب صحرا'' ۱۹۹۲ء میں منظر عام پر آیا۔اور قارئین و ناقدین کے تمام طبقوں میں اس کو سراہا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ پیش گوئی بھی کی گئی کہ اگر حنیف ترین اپنے اسی انداز و اسلوب پر قائم رہے اور اس میں وسعت بھی لاتے رہے تو ایک روز وہ خود کو عظیم شعراء کی صف میں کھڑے پائیں گے۔بہر کیف! دوسرا مجموعہ کلام ''کتاب صحرا'' ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔پھر تیسرا مجموعہ کلام ''کشت غزل نما'' ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔پھر ۱۹۹۷ء میں ''زمین لاپتہ رہی'' ۲۰۰۱ء میں ''ابابیلیں نہیں آئیں''، پھر ۲۰۰۳ء میں ''میں نے زلزال کو لفظوں میں اُتر کر دیکھا'' ۲۰۱۱ء میں ''روئے شمیم'' اور ۲۰۱۴ء میں ''لالۂ صحرائی'' وغیرہ سے اردو ادب متعارف ہو چکا ہے، اور ان کی شاعری بروئے کار آچکی ہے۔ان کی شاعری کی تمام خوبیاں اور خرابیاں طشت اَز بام ہیں۔اور واقعی حنیف ترین ایک بلند پایہ شاعر شمار کئے جاچکے ہیں۔

جہاں تک ان کی غزل گوئی کا تعلق ہے۔تو حنیف ترین نے غزلوں اور نظموں دونوں صنفوں میں اپنا امتیاز و اِنفراد قائم کیا ہے۔انہیں زیادہ مقبولیت نظموں کے حوالے سے حاصل ہوئی ہے۔لیکن میں بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ حنیف ترین بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ان کا طبعی میلان غزل گوئی کی طرف زیادہ ہے۔اس سلسلے میں مشہور و معروف ناقد پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا خیال ملاحظہ فرمائیں :

> ''حنیف ترین بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔انھوں نے اپنے مشاہدات کو حسّیات کا روپ دیگر ایک نئی کیفیت اور تجربے سے دوچار کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں سے نئی آگہی اور بصیرت حاصل ہوئی ہے۔گویا ایک طرح سے انھوں نے نیا وژن دیا ہے۔اور ذہن اور مزاج کو نئے رُخ کی طرف موڑنا چاہا ہے۔جس کے ذریعہ اہم تہذیبی تقاضوں کی تکمیل ہوئی ہے۔یہ عمل ان کے

یہاں تجربے کی انفرادی اظہار کے ذریعہ جاری وساری ہے اور ایسا لگتا ہے کہ وہ اظہار بیان کی جس کارفرمائی سے گزر رہے ہیں ان کی غزلیں اپنے دور اپنے عہد کے شعری مزاج اور ادبی رجحان کی نمائندگی کی طرف رواں دواں ہیں۔ اس طرح انسانی زندگی اور اقدار کی توجیہہ ہی ان کی غزلوں میں عصری حسیّت کی جستجو اور دریافت کی پرکھ کی تعبیر بروئے کار لاتی ہے۔''

(''کتاب صحرا'' مصنفہ حنیف ترین ص ۱۷)

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہے کہ حنیف ترین بحیثیت غزل گو نہایت محترم گردانے جاتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں روایت کی خوشبو اپنے تجدیدی رنگ میں نہایت خوش نما اسلوب وانداز کے ساتھ مترشح ہوتی ہے۔ ان کے کلام میں وجدان کا بڑا عمل دخل نظر آتا ہے۔ حنیف ترین خارجی مشاہدات کو اپنے واجدان سے گزار کر حسیّات سے غلاف آویزاں کرتے ہیں اور ایک الگ کیفیات کی مصوّری کرتے ہیں۔ جس سے ان کی غزلوں میں انفراد وامتیاز کا رنگ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ان کی غزل گوئی کے سلسلے میں ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کا خیال ملاحظہ فرمائیں :

''ان (حنیف ترین) کے یہاں موضوعات تکنیک اور اسالیب کا حیرت انگیز تنوع ملتا ہے۔ بلکہ میرے خیال میں ان کی شاعری بشمول غزل گوئی کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ اسے کسی روایتی دائرے میں قید کرنا مشکل ہے۔ یہ احساسات وتجربات کے آزادانہ اظہار کا ایسا نمونہ ہے جسے پوری طرح کسی بھی نظریاتی دائرے میں نہیں رکھا جاسکتا۔ فنی اعتبار سے بھی انہوں نے خود کو محدود نہیں کیا ہے۔ چھوٹی بحروں میں بھی غزلیں کہیں ہیں اور طویل بحروں میں بھی، اساتذہ کی زمینوں میں بھی اشعار کہے ہیں۔ خود بھی مشکل زمینیں نکالی ہیں اور آزاد غزل سے آگے بڑھ کر ''غزل نما'' کا تجربہ کیا ہے۔ مگر ان کی انفرادیت ہر جگہ بہ آسانی محسوس کی جاسکتی ہے۔''

(حنیف ترین فن اور شخصیت ص ۶۱)

سطور بالا کی بحثوں سے ثابت ہے کہ حنیف ترین ایک اچھے غزل گو شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں موضوعات، تکنیک اور اسالیب کا تنوع پایا جاتا ہے۔ ان کی غزلوں میں شعور کا اظہار، رمزیت اور تخلیقی تہہ داری بھی پائی جاتی ہے۔ ان کی غزلوں میں نئے ہیت کا تجربہ بھی ہے۔ انہوں نے غزل کی نئی ہیئت ،غزل نما میں بھی کامیاب تجربے کئے ہیں۔ اپنی فتوحات کے جھنڈے صرف ملک کے اندر ہی نہیں بیرون

ملک میں بھی گاڑے ہیں۔

حنیف ترین کی تخلیقات کو ملکی اور بیرون ملکی رسائل وجرائد میں خوب خوب جگہ ملی ہے۔ انہوں نے ہندوستان، پاکستان، شارجہ، قطر، وغیرہ کے مشاعروں میں شرکت کی ہے اور داد وتحسین بھی حاصل کی ہے۔ اس سلسلے میں سینکڑوں ناقدین کی آراء ان کی غزل گوئی کے تعلق سے نقل کئے جاسکتے ہیں لیکن اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان سے صرفِ نظر بہتر ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حنیف ترین کی غزلوں کے چند اشعار نقل کردئے جائیں جن سے موصوف کے فکری اور فنی دونوں پہلو آشکار ہوجائیں۔

چاند الفت کا استعارہ ہے
جس کی جانب سبھی چکور چلیں

جن کا یقین راہِ سکوں کی اساس ہے
وہ بھی گمان دشت میں مجھلو پھنسنے لگے

احساسِ نارسائی کی بنجر زمین کو
کس کے خیالِ سبز نے بالیدہ کر دیا

سچ لکھوں گا چاہے مٹ جاؤں حنیفؔ
جھوٹ اب میرا نشانہ ہو گیا

آنکھوں پر پلکوں کا بوجھ نہیں ہوتا
درد کا رشتہ اپنی آن نہیں کھوتا

مصیبتوں کو مرے گھر کا جب پتہ دینا
مرے خدا مجھے لڑنے کا حوصلہ دینا

ڈبو کر مجھ کو اپنے ذائقوں میں
وہ مجھکو خود میں ہر دم گھولتا ہے

حنیف ترین کی غزل گوئی میں انسانی قدروں کی تلاش اور احترام ہے اور زندگی کے اعلیٰ اور

معیاری خیالات کی پیروی ملتی ہے۔ان کی غزلوں میں دشت وصحرا اور ویرانہ کا ذکر ہرجگہ ہوا ہے۔ان کی غزلوں میں ہندوستان سے محبت یہاں کی چیزوں سے وابستگی کے ساتھ یہاں کی تہذیب وتمدّن کا احترام بخوبی ملتا ہے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ سعودی عرب میں عرصہ دراز تک قیام کی وجہ کر وہاں کے موسم اور ماحول کا ذکر بھی جگہ جگہ پر دیکھنے کو ملتا ہے۔اس تعلق سے یہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

سرخیاں ہوں فرات و دجلہ کی
چیخ جہلم کی چپ چناب کی ہوں

اس قبیل کے درجنوں اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں لیکن اختصار کے پیش نظر صرف ایک شعر پر ہی اکتفا کررہی ہوں۔

اخیر میں یہ عرض کرتی چلوں کہ حنیف ترین کی غزلیں اپنی جملہ خصوصیات کی وجہ کر اردو ادب میں اپنا مقام ومرتبہ رکھتی ہیں۔ان کی غزلوں میں عصری حسیت وآگہی ، دردوغم اور بےقراری کی لذت،تغزلیت و نغمگی اور اسلوب بیان کی جادو بیانی تمام خوبیاں بدرجۂ اتم ہیں۔جس کی وجہ کر یہ قارئین وناقدین کو متاثر بھی کرتی ہیں اور انہیں اپنا گرویدہ بھی بنالیتی ہیں۔

Tabassum Khatoon
Research Scholar
Deptt. of Urdu
Ranchi University
Ranchi (Jharkhand)

محمد حنظلہ

مومن خان مومنؔ :غزل کا واقعیت پسند شاعر

مومن خان مومنؔ اردو ادب میں ایک بلند ومنفرد مقام ومرتبہ رکھتے ہیں۔مومنؔ نے جب اپنی شاعری کا آغاز کیا وہ دور کئی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔مومنؔ کا دور عہد زریں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ان کے معاصرین شعراء کا ذکر فرحت اللہ بیگ نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔جو کم وبیش غالبؔ، ذوقؔ ،آزردہؔ،شیفتہؔ،صہبائیؔ،عیشؔ ،عارفؔ ، درخشاںؔ ،علائیؔ،سالکؔ ، بیتابؔ ، برقؔ ،میرؔ،شورؔ، آزادؔ،تسکینؔ،تشنہؔ، حزیںؔ،شہرتؔ،عزیزؔ،تمکینؔ ، جوشؔ،بسملؔ،جعفریؔ ، بیدلؔ،شوقؔ ، داغؔ اور حشمتؔ وغیرہ ہیں۔مومنؔ کا موازنہ، غالبؔ ، ذوقؔ ، میر اور سعدی وحافظ وغیرہ سے کیا جاتا رہا ہے۔مومنؔ کو غالبؔ اور شیفتہؔ جیسے شاعروں سے بھی داد وتحسین حاصل ہوئی ہے۔اردو ادب میں ایک بڑی جماعت مومنؔ کی شاعرانہ برتری کا اعتراف کرتی رہی ہے۔ یہ سچ ہے کہ مومنؔ سے پہلے کی شاعری ایک الگ راہ پر گامزن تھی۔لیکن مومنؔ نے اپنی شاعری میں خالص عشق ومحبت کے تجربات ومشاہدات کو بروئے کار لاکر ایک نئی راہ نکالی ہے۔اس نئی راہ کے وہ تنہا مسافر نظر آتے ہیں۔مومنؔ کی شاعری میں جو خوبیاں ہیں ان کا اعتراف غالبؔ،شیفتہؔ، حالیؔ اور آزاد کے علاوہ ناقد ومحقق مولوی عبدالحئ نے بھی تسلیم کیا ہے۔مولوی عبدالسلام، نیاز فتح پوری، وقار احمد رضوی، نظیر صدیقی، سید امتیاز احمد اور عبدالباری آسی وغیرہ لوگوں نے بھی مومنؔ کو انیسویں صدی کا کامیاب شاعر کہا ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر یوسف حسین خان یوں رقمطراز ہیں :

> ''مومن خان مومنؔ نے عشقیہ مضامین کے اسالیب بیان میں جو نزاکت اور لطافت پیدا کی وہ انہیں کا حصہ تھا۔انھوں نے اپنی غزل کو مجازی عشق کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اس کے حدود سے آگے بڑھنے کی کبھی کوشش نہیں کی ....مومنؔ نے اپنی غزلوں میں عشق کی کیفیتوں ، حسن کی اداؤں اور اس میدان کے تمام تجربوں کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ذوق وجد میں آجاتا ہے۔وہ کنائے اور استعارے کے بادشاہ ہیں۔اردو زبان کے اعلیٰ اور دل نشیں تغزل کے نمونے ان کے کلام میں ملتے ہیں۔''
>
> (اردو غزل مصنفہ : ڈاکٹر یوسف حسین خان،ص۔۹۹)

مومنؔ اپنی غزل گوئی کی وجہ سے آج تک اردو ادب میں زندہ وتابندہ ہیں۔ان کی شاعری پر بے تحاشا اعتراضات بھی ہوئے ہیں حتیٰ کہ انہیں چُمّا چاٹی والا شاعر کہہ کر بھی نظر انداز کیا گیا ہے۔لیکن رفتہ رفتہ لوگوں نے ان کی شاعری کا سنجیدگی سے مطالعہ شروع کیا اور دھیرے دھیرے ان کے مداحوں کی بھی ایک بڑی جماعت سامنے آگئی جنہوں نے ان کے کلام کی قدر و قیمت تعین کرنے میں عقیدت مندانہ رویّہ اختیار کیا اور طرفداری بھی کی اور اس میں مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا۔اس سلسلے میں پروفیسر ضیاء احمد بدایونی نے کہہ دیا کہ انہوں نے ''غزل کو اس کے حقیقی مفہوم میں منحصر کر دیا'' جو درست معلوم ہوتا ہے۔ یا پھر معجز سہسوانی کا یہ کہنا کہ مومن نے جو کچھ کہا تغزل کے اندر ہی کہا، کچھ حد تک درست ہے۔یا پھر نیاز فتح پوری کا یہ دعویٰ کرنا کہ مومن کو اپنے دیگر ہم عصروں میں جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ ان کا رنگ تغزل ہے جو غیر متغزلانہ چیز سے پاک ہے جس کو تصوف یا عشق حقیقی سے موسوم کیا جاتا ہے۔مندرجہ بالا تمام بیانات کسی حد تک تمام ناقدین نے قبول کئے ہیں۔لیکن کچھ لوگوں نے جو اس سلسلے میں مبالغہ آرائی کی ہے وہ بے دلیل اور لغوی باتیں ہیں۔مومنؔ کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد ظہیر احمد نے جو خیالات رقم کئے ہیں وہ نہایت سنجیدہ اور مدلل ہیں۔ملاحظہ فرمائیں :

> ''مومنؔ کی غزل کے اجزائے ترکیبی میں تغزل ، داخلیت، نازک خیالی ، ندرت اسلوب ،مکر شاعرانہ، سادگی اور پیچیدہ انداز بیان ہیں۔ باقی تمام خصوصیات ان میں سے کسی نہ کسی ذیل میں آجاتی ہیں۔مومنؔ نے غزل کو محض تغزل تک محدود رکھا ہے،تصوف اخلاق ،فلسفہ اور زندگی کے دوسرے مسائل کو غزل کے قریب نہیں آنے دیا۔دائرہ کا محدود رکھنا مومنؔ کی کمزوری بھی ہے اور قوت بھی۔کمزوری اس لئے کہ زندگی کا کینوس بہت وسیع ہے اور عشق اس کا صرف ایک شعبہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کی وسیع دنیا کے سامنے مومن کی دنیا بہت محدود نظر آتی ہے۔قوت اس لئے کہ روح تغزل کے جو نمونے اور تجربے مومن کے کلام میں نظر آتے ہیں وہ دوسرے شعراء کے یہاں اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔''
>
> (مومن خان مومنؔ مصنفہ : ظہیر احمد صدیقی ،ص۔۴۱۔۴۲)

مومن خان مومنؔ اپنے عہد کے ان چند شاعروں میں ہیں جنہیں اردو ادب میں اپنے انفرادو امتیاز سے اعلیٰ مقام عطا ہوا ہے۔مومنؔ کی غزل گوئی میں صداقت ہے۔آپ بیتی ہے۔انہوں نے اردو غزل کو پہلی مرتبہ واقعیت پسندی کا سبق پڑھایا ہے۔انہوں نے روایتی ڈگر سے ہٹ کر زندگی کی سچائیوں،

عشق کے نادر تجربات ومشاہدات کو برجستہ انداز میں پیش کیا ہے۔انہوں نے غزل کے محبوب کو نسوانی پیکر عطا کیا ہے۔ان کی غزلوں میں موصوف کا محبوب کوئی خیالی پیکر نہیں ہے بلکہ ہماری طرح گوشت پوست والا انسان ہے بلکہ عورت ہے۔اس نئی روش کے وہ بانی کہے جاتے ہیں اور اس نئے رویے نے اردو غزل کو اپنے محدود دائرہ سے نکلنے کی راہ ہموار کی ہے۔یہی خوبی مومن کو اپنے تمام معاصرین شاعروں میں انفرادی و امتیازی شناخت دیتا ہے۔اس سلسلے میں مومنؔ کے چند غزلیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں ؂

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
عدم میں رہتے تو شاد رہتے اسے بھی فکر ستم نہ ہوتا
جو ہم نہ ہوتے تو دل نہ ہوتا جو دل نہ ہوتا تو غم نہ ہوتا

عیش میں بھی کبھی جاگے نہیں تم کیا جانو
کہ شب غم کوئی کس طور بسر کرتا ہے

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا نہیں جی
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

کسی کا ہوا آج کل تھا کسی کا
نہ ہے تو کسی کا نہ ہو گا کسی کا
تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیران ہوں گے

چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

اور مومنؔ کا یہ شہرۂ آفاق شعر ؂

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی اے غمزۂ غمّاز دیکھنا

مومؔن خان مومؔن نے چھوٹی بڑی تمام بحروں میں غزلیں کہیں ہیں چھوٹی بحروں میں وہ نسبتاً زیادہ دلسوز اشعار کہتے ہیں۔ نیاز فتح پوری نے ان کے کلام میں مکر شاعرانہ کی نشاندہی کی ہے۔ مومن کے کلام میں اس عنصر کی ہر جگہ نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں بے شمار اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں لیکن طوالت کا خوف پیش نظر ہے۔ نیاز فتح پوری کا یہ جملہ بھی بہت مشہور ہے کہ ''اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعراء متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر (بہ استثنا میرؔ) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ ''مجھے کلیات مومن دو اور باقی سب اٹھالو'' اس جملے سے نیاز فتح پوری تمام شاعروں میں مومؔن کی شاعرانہ قدر و قیمت کا اعتراف و اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ مومؔن کی غزل گوئی میں انفرادیت و امتیاز کا اعتراف مشہور و معروف ناقد کلیم الدین احمد نے بھی کیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کلیم الدین احمد کا ایک اقتباس بھی پیش کر دیا جائے تاکہ مومؔن کی غزل گوئی میں امتیازات کا یقین ہو جائے اور بحیثیت غزل گوان کے مقام و مرتبہ پر مہر توثیق ثبت ہو جائے۔ کلیم الدین احمد کے اقتباس پر میں اپنی بات ختم ہرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں :

> ''مومن کے عشق کی نوعیت ان کے اشعار میں کھلی ہوئی ہے۔ مومؔن کسی پردہ نشیں کے عشق میں مبتلا تھے۔ وصل و ہجر کی کشمکش، امید و بیم کی تصویر کشی ہر جگہ ہے۔ ان کے جذبات صادق ہیں۔ وہ واردات قلبی کا بیان کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے بیان میں پاکیزگی اور شیرینی ہے۔ کہیں ابتذال کا پتہ نہیں............ان شعروں میں تاثیر ہے۔ یہ سنتے ہی دماغ پر اثر اور دل میں گھر کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان میں اصلیت ہے پھر طرز ادا دلکش ہے۔ حسین خیالات و جذبات کو حسین لفظوں اور ترکیبوں میں ادا کیا گیا ہے۔ جذبات تو وہی ہیں جو سارے اردو شعراء میں ملتے ہیں۔ لیکن ان کا بیان یہاں مومؔن کے مخصوص انداز میں ہے۔ جس کی وجہ سے ان کا حسن بڑھ جاتا ہے اور دلکش اسلوب کے ساتھ ہر شعر ترنم سے بھی معمور ہے۔''
>
> اردو شاعری پر ایک نظر، مرتبہ : کلیم الدین احمد، ص۔۱۴۳۔۱۴۴)

Md. Hanzala
Research Scholar
Urdu Dept Lalit Narayan Mithila University
Darbhanga

کوثر ناز

انشااللہ خاں انشاءؔ بحیثیت داستان نگار

سید انشااللہ خان انشاء کی پیدائش ۱۷۵۶ء میں مرشد آباد میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام حکیم سید ماشااللہ خاں تھا۔ دادا کا نام سید نوراللہ تھا۔ جو پیشہ ور طبیب تھے۔ انہیں بادشاہ فرخ سیر کے کامیاب علاج کے بعد ''خان بہادر'' کے خطاب سے بادشاہ نے نوازہ تھا۔ انشا کے والد سید ماشاءاللہ خان شاعر بھی تھے اور مصدرؔ تخلص کرتے تھے وہ ایک مشہور و معروف طبیب بھی تھے۔ انشاءاللہ خان نے سب سے پہلے قرآن شریف کی تعلیم حاصل کی اس کے بعد عربی و فارسی زبان پر عبور حاصل کیا۔ اس کے علاوہ موصوف کئی اور زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔

انشاءاللہ خان کی تعلیم اسلامی ماحول میں ہوئی تھی۔ والد سے طب اور شاعری ورثے میں ملی تھی۔ اس کے علاوہ وہ سپہ گری کا بھی شوق رکھتے تھے۔ وہ بلا کے ذہین تھے۔ سولہ سال کی عمر میں اپنا دیوان مکمل کر لیا تھا۔ شعر گوئی میں والد سے اصلاح لیا کرتے تھے وہ خوش طبیعت، حاضر جواب اور بذلہ سنج بھی تھے۔ وہ آزاد خیال کے آدمی تھے انہوں نے نواب شجاع الدولہ کے دربار میں اپنی صلاحیتوں کی بدولت ہی جگہ بنائی تھی پھر مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی آفتاب کے دربار دہلی میں بھی جگہ پائی۔ ان کا انتقال ۱۸۱۸ء میں لکھنو میں ہوا۔

انشاء نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کیا اور بحیثیت غزل گو مشہور ہوئے۔ دبستان لکھنو کی بنیاد رکھنے والے شعراء میں ان کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ ان کی تصنیفات شعری میں دیوان غزلیات اردو اور فارسی، دیوانِ ریختی، دیوان بے نقطہ مثنویاں، قصائد، رباعیات، قطعات، فردیات، ہجویات وغیرہ ہیں۔ نثری تصنیفات میں دریائے لطافت، لطائف السعادت، رانی کیتکی کی کہانی، سلک گہر، وغیرہ شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔

بحیثیت داستان نگار انشااللہ خان انشاء کا تعلق ایسے دَور سے ہے جس میں ایک طرف فورٹ ولیم کالج کے شعراء اور ادباء اپنی اردو خدمات میں منہمک تھے۔ اس دور میں نثری داستانیں لکھی یا ترجمہ کی جا رہی تھیں لیکن اس سے الگ بھی ادباء اور شعراء داستانیں لکھنے میں لگے ہوئے تھے۔ انشاءاللہ خان انشاء کا تعلق ان ہی ادیبوں اور داستان نویسوں میں ہے جو فورٹ ولیم کالج سے الگ اپنے علم و ہنر اور اردو ادب نوازی کا ثبوت فراہم کر رہے تھے۔

انشاءاللہ خان کی سب سے مشہور داستان ''رانی کیتکی کی کہانی'' ہے جو کئی اعتبار سے منفرد داستان

کا درجہ رکھتی ہے۔ اس داستان کی خوبی یہ ہے کہ موصوف نے اسے لکھنے سے پہلے دعویٰ کیا تھا کہ میں ایسی داستان لکھنے جا رہا ہوں جس میں عربی اور فارسی کا ایک بھی لفظ استعمال نہیں ہوگا۔ اور انہوں نے یہ ثابت کر دکھایا۔ رانی کیتکی کی کہانی میں داستان کی تمام خوبیاں ہیں اور اس میں ایک بھی عربی یا فارسی کا لفظ نہیں ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ یہ داستان دیگر داستانوں کے مقابلے میں مختصر ترین داستان ہے۔ تیسری خوبی یہ ہے کہ یہ داستان موصوف کی طبع زاد داستان ہے اِسے انہوں نے ۱۸۰۳ء میں لکھا۔ مولوی عبدالحق نے اِسے ۱۹۳۳ء میں کتابی شکل دیکر شائع کیا۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق کا بیان ملاحظہ فرمائیں :

’’یہ کہانی (رانی کیتکی کی کہانی) ان کی جدّت طبع کا نتیجہ ہے۔ اس میں یہ التزام کیا کہ فارسی عربی کا لفظ بھی نہ آنے پائے۔ جو دعویٰ انہوں نے کیا وہ پورا کر دکھایا۔ عربی فارسی کا ایک لفظ تک نہ آیا اور پھر لطف یہ کہ آج کل سی ایسی ہندی نہیں کہ نہ لکھنے والا سمجھے نہ پڑھنے والا۔ اُردو والا بھی سمجھتا ہے اور ہندی والا بھی۔ زبان اور بیان دونوں صاف ہیں۔ اس کا نام ہندوستانی ہے۔‘‘

(داستان رانی کیتکی اور اُودے بھان کی۔ ص ۴)

انشاء اللہ خان نہایت ہی ذہین انسان تھے۔ جدت ان کی فطرت میں شامل تھا۔ اس لئے انہوں نے اس دور میں لکھی جا رہی داستانوں سے الگ راہ اختیار کی اور کھڑی بولی (ہندی) میں یہ داستان لکھ ڈالی جو داستانی روایت میں ایک الگ مرتبہ کی حامل داستان ہے۔ جو لائق ستائش اور قابلِ داد بھی ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کہانی سے کم سے کم ایک اقتباس بطور نمونہ پیش کر دوں تاکہ میری بات مدلل ہو جائے :

’’ایک رات رانی کیتکی نے اپنی ماں کام لتا سے بھلاوے میں ڈال کے یہ پوچھا گروجی گسائیں مہندر گر نے جو بھبھوت باپ کو دیا تھا وہ کہاں رکھا ہوا ہے اور اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس کی ماں نے کہا میں تیری واری تو کیوں پوچھتی ہے۔ رانی کیتکی کہنے لگی آنکھ مچول کھیلنے کے لئے چاہتی ہوں جب اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلوں اور چور بنوں تو کوئی مجھ کو پکڑ نہ سکے۔ رانی کام لتا نے کہا وہ کھیلنے کے لئے نہیں ہے۔‘‘

(داستان رانی کیتکی کی اور کنور اودے بھان کی ص ۳۱-۳۲)

’’سلک گہر‘‘ انشاء اللہ خان کی ایک اور مختصر ترین داستان ہے جو محض چھتّیس (۳۶) صفحات میں سمٹی ہوئی ہے۔ اس داستان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس داستان میں تمام ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن میں کہیں بھی کسی بھی لفظ میں نقطہ نہیں ہے۔ یعنی یہ مکمل داستان غیر منقوطہ ہے۔ جو ایک مشکل

ISSN :2582 -3612

کام ہے۔ جسے موصوف نے کر دکھایا ہے۔ سلک گہر کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

ملکہ گہر آراء کا دل اس حال کا مطلع ہوا۔ اس دم محرم اسرار، مہر کردار، ہم عمر، ماہ رو کو کہا کہ ’’ادھر آؤ‘‘ اور اس کو لاؤ‘‘ ہر گہہ مار مہرہ عطارد الماس آسا کالا گا، اور محل لسع مار مدسما کالا ہوا، اور مداد مردمک حور ملا، اعلا کا مسودہ کھلا اور وسواس کا کلسر ا۔ اس کام اگلا ہوا سم کھا کر سو رہا۔ اور گہوارہ کو دک ماہ مراد کا ہلا۔ ملک روس کلاہ مکمل گوہر و الماس و لعل رکھ کر، اس صدر وامر کا مامور ہو، سہا ہوا مع ماہ رو وارد معطر محل ہو کر کراہا۔‘‘

(انشا کی دو کہانی ص ۹۶)

انشاء اللہ خان انشا کی یہ داستان بھی اپنے اعتبار کی ایک منفرد داستان ہے۔ یہ کام نہایت مشکل تھا جسے موصوف نے انجام دیا۔ اسلوب بیان کے اعتبار سے یہ داستان سب سے کم تر درجہ رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں ایم۔ حبیب خان کا خیال ملاحظہ فرمائیں :

’’سلک گہر میں انشا نے جو تجربہ کیا ہے وہ رانی کیتکی کے تجربے سے کسی قدر مختلف ہے۔ اس میں انشاء کی شخصیت دورنگی دکھائی پڑتی ہے۔ جن میں ایک رنگ میلے ٹھیلوں کا دوسرا دربار جوان کو باندھے ہوئے تھا یہ نقطہ زبان لکھنے کی یہ نثری کوشش اس بات کی ترجمانی کرتی ہے۔ انشاء کو درباری زندگی کا جو چسکا لگا وہ غیر منقوطہ زبان لکھنے کا تھا۔ انہوں نے ایک بے نقطہ دیوان فارسی میں لکھا اور ایک بے نقطہ مثنوی فارسی میں رقم کی۔ یہ تمام غیر منقوطہ شاعری ہمیں ان کے کلیات میں ملتی ہیں۔ سید انشاء کے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ وہ اپنے حریفوں کو نیچا دکھانے کے لئے نظم و نثر لکھتے تھے۔‘‘

(انشاء اللہ خاں انشاء مصنفہ ایم۔ حبیب خان ص ۸۷)

انشاء اللہ خاں انشاء آزاد طبیعت انسان تھے۔ کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اس وجہ کر کئی لوگوں سے ادبی معرکے وجود میں آتے رہے ہیں۔ جیسے مرزا عظیم بیگ سے معرکے اور مصحفی سے معرکے ، وغیرہ۔ انہیں میلے ٹھیلوں میں گھومنے کا بھی شوق تھا۔ ان داستانوں کے علاوہ موصوف کی ’’دریائے لطافت‘‘ اور لطائف السعادت وغیرہ بھی تصنیفات ہیں جو موضوع کے اعتبار سے کافی اہم ہیں۔ دریائے لطافت ان کی قواعد شناسی کی یادگار ہے۔ جس میں انہوں نے اردو صرف ونحو، منطق عروض وقافیہ اور معانی و بیان وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔ موصوف پہلے شخص ہیں جنہوں نے عربی و فارسی زبان سے اپنا دھیان ہٹا کر اردو زبان کی ہیئت و اصلیت پر غور کیا اور اس کے قواعد کو بھی حسن وخوبی سے سامنے رکھا۔ اس تصنیف کے مکمل کرنے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

میں ان کے ساتھ مرزا محمد قتیل بھی برابر کے شریک رہے ہیں۔

لطائف السعادت میں انشاء اللہ خان انشاء نے نواب سعادت علی خان کی صحبتوں میں کہے اور سنائے گئے لطائف کو رقم کیا ہے۔ انشاء کی طبیعت میں انشاء پردازی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کا کوئی جواب نہیں ملتا ہے۔ اس طرح ان کی شخصیت میں شاعری کے علاوہ نثری کئی جہات واضح رہی ہیں اور ہر جہت میں ان کی داستان نگاری کی جہت اولیت کا درجہ رکھتی ہے۔

Kausar Naz
Research Scholar
University Deptt. of Urdu
B. R. A. Bihar University
Muzaffarpur

Pandit Ugam Pandey College

Motihari, East. Champaran - 845 401
Affiliated to B. R. A. Bihar University
Muzaffarpur (Bihar)

Salient Features :

1. Permanent Affiliation in all subjects (Science, Arts & Commerce)
2. A team of experienced teachers for imparting education.
3. Free education for poor students.
4. Facilities of electicity, fan, and furniture along with girl's common room
5. Well equipped laboratory and a good library.
6. Splendid playground.
7. Drinking water points and toilets.
8. Centre for practical and various competitive examinations.

Prof. (Sr.)Kishore Pandey — Secretary
Dr. Karmatma Pandey — Principal

ISSN :2582 -3612

نعمت شمع

الیاس احمد گدّی کے ناول ''فائر ایریا'' اور حاشیائی کردار

الیاس احمد گدی نے اپنا ادبی سفر ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے شروع کیا۔ ان کا پہلا افسانہ ''سرخ نوٹ'' ماہنامہ ''افکار'' میں بھوپال میں 1948 میں شائع ہوا۔ ان کے متعدد افسانے ''شمع'' اور ''شب خون'' میں بھی شائع ہوتے رہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''آدمی'' 1983ء میں اور ''تھکا ہوا دن'' 1987 میں منظر عام پر آیا۔ لیکن ان کی شہرت ومقبولیت ناول ''فائر ایریا'' کی وجہ سے زیادہ ہوئی۔ اس ناول پر انہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا۔ کوئلہ کے کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں پر آج تک کسی نے اپنے ادب کو موضع بحث نہیں رکھا لیکن الیاس احمد گدی جو گدی محلّہ جھریا ضلع دھنباد (جھارکھنڈ) میں پیدا ہوئے اس المیہ کی جانب اپنی توجہ مرکوز کی اور جہاں وہ چھوٹا ناگپور کی ٹوپوگرامی اور کوئلہ مزدوروں کے مسائل پر تفصیل سے گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک ضخیم ناول ہے جو ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ناول کی اشاعت 1994ء میں ہوئی پھر الیاس احمد گدی فکشن نگار کی حیثیت سے پورے اردو ادب میں چھا گئے اس طرح ناول ''فائر ایریا'' کی اہمیت از خود واضح ہوگئی۔ یہاں جملے دیکھئے جسے الیاس احمد گدی نے اپنے ابتدائیہ میں پیش کیا ہے :

> ''زمین کے ہزاروں فٹ نیچے اندھیری سرنگوں میں شدید گرمی ہوتی ہے۔ حبس ہوتا ہے، پسنیہ ہر مسام سے بوند بوند نکلتا جسم پر کینچوے کی طرح رینگتا ہے اور کوئلے کی سیاہ دھول اس پسینے پر جمتی جاتی ہے۔ سارے لوگ سیاہ پتھر کے مجسموں کی طرح دکھلائی دینے لگتے ہیں۔ یہ الگ دنیا ہوتی ہے اور اندھیرے میں موت گشت کرتی ہے۔ کبھی کہیں چال گر پڑتی ہے، کبھی کول ٹب کا رسہ ٹوٹ جاتا ہے، کبھی زہریلی گیس موت کی نقیب بن جاتی ہے۔ موت کے بعد بھی کوشش کی جاتی ہے کہ لاش ہزاروں ٹن ریت میں یا کسی بند گپھا میں دفن کر دی جائے تاکہ معاوضے سے بچا جاسکے۔'' [1]

ناول نگار مزدور کے کرب کو اپنے ناول میں اس طرح خیالات کا اظہار کرتا ہے جو درج ذیل ہے۔

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

''مگر جب ایسا نہیں ہوتا تو بڑا ہنگامہ ہو جاتا ہے۔ مائنس ڈپارٹمنٹ انکوائری
کمیشن بیٹھا تا ہے۔ مقامی پولس بھی دخل در معقولات کرتی ہے۔ یونین کے
سارے چھوٹے بڑے لیڈر مزدوروں میں آگ بھڑکانے لگتے ہیں۔ وہ
حادثے کا ذمہ دار مینجمنٹ کو ٹھہراتے ہیں۔ دس بیس روز خوب گرما گرمی رہتی
ہے پھر اچانک سب ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ انکوائری کمیشن رپورٹ بناتی ہے کہ
مزدور اپنی غلطی سے موت کے منہ میں چلا گیا۔ لیڈر چپ سادھ لیتے ہیں۔
مزدور گالیاں بک کر اپنا جی ٹنڈا کر لیتے ہیں پھر سب کچھ ٹھیک ٹھاک
ہو جاتا ہے۔'' ۲

ناول نگار کے ان جملوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک طبقہ کی نہیں بلکہ ہر طبقے سے تعلق رکھنے والوں کی زبوں حالی بیان کر رہا ہے۔ یہاں ناول نگار کا خیال بالکل درست ہے کہ وہ لوگ جو ظلم کے شکار ہیں ان میں خود مزدور بھی قصوروار ہیں جو لیڈروں اور ٹھیکیداروں کے رویہ سے دبے رہتے ہیں اور ان کا استحصال ہوتا رہتا ہے۔ ان کے اندر صلاحیت نہیں ہے کہ وہ احتجاج کر سکے۔ وہ اپنی قسمت کو بدل سکیں۔ یہ وہ لوگ ہیں۔

جو بھوکے اور ننگے ہیں اور جانوروں کی طرح زندگی گذارتے ہیں۔ یہ مقامی باشندے بھی اور دور دراز سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی۔ یہ وہ لوگ جو اپنا کھیت، اپنا گھر، بیوی، بچے، ماں باپ اور اپنا علاقہ چھوڑ کر آتے ہیں۔ کچھ بے زمین لوگ بھی ہیں اور کچھ معصوم بے ریا اور سیدھے سادے بھی۔ ان تمام لوگوں میں اگر کوئی چیز مشترک ہے تو وہ بھوک ہے جو انہیں اس کالی کوٹھری میں کھینچ لائی ہے۔ پیٹ میں لگی وہ آگ ہے جسے بجھانے کے لئے وہ دلدل میں پھنستے چلے جاتے ہیں۔

یہاں صرف جذباتیت نہیں بلکہ گہری معنویت ہے۔ درد بھی لذت آگہی ہوتا ہے۔ زندگی زمان کے جبر سے منفعل لاکھ سہی لیکن زندگی ہر حال میں تحریک زماں سے زیادہ حسین اور تجدید شباب کرنے والی تحریک ہے۔ ناول کے اسلوب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ الیاس احمد گدی نے اداسیوں، مایوسیوں، محرومیوں اور زندگی کے بے رحم سفاکیوں کو بھی نئی معنویت کے پیکر میں ڈھالنے کی خوبصورت کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''فائر ایریا'' کافی مقبول ومعروف ہوا۔ اس کی کئی جلدیں انگریزی زبان میں بھی ترجمہ کر دی گئیں۔ کوئلے کی کان میں کام کرنے والے مزدور جس طرح کے استحصال کا شکار ہو جاتے ہیں اس کا پورا پورا نظارہ اس ناول میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ٹریڈ یونین مزدوروں کی دیکھ بھال ضرور کرتے ہیں لیکن اس میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بکے ہوئے ہیں اور انتظامیہ کے لئے جاسوسی کرتے ہیں اور یونین کے تمام جائزہ

مطالبات کے لئے رخنہ بھی بنتے ہیں۔ مزدور لیڈر کو انتظامیہ خرید لیتا ہے لیکن جو ضمیر کی آواز کا ساتھ دیتا اور لازماً مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے اسے بھی کسی نہ کسی طرح کچل دیا جاتا ہے۔ کول فیلڈ کا شمسان گھاٹ میں تبدیل ہو جانا اور مزدوروں کا اجتماعی چتا بن جانا عام حادثات نہیں۔ بلکہ یہ مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ ہر مرحلے میں نقصان صرف اور صرف مزدوروں کا ہی ہوتا ہے۔ اس ناول کے مختلف کردار ہیں۔ سہدیو، رحمت، کپل سنگھ، کالا چند، ننکو، مجمدار، سندر لال، جلیا، سنت لال وغیرہ وغیرہ۔ اس میں ختونیہ کا کردار ایک جاذب کردار ہے جس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت موجود ہے اور جس سے تبدیلی کے امکانات واضح ہوتے ہیں۔ ناول نگار نے ہر کردار کو بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ ناول ''فائر ایریا'' میں ناولنگار کے تخلیقی جوہر کا پتہ لگایا جاسکتا ہے جس میں سرمایہ دارانہ استحصال کے خلاف احتجاج کی لے صاف سنائی دیتی ہے۔

الیاس احمد گدی جس دور میں ناول لکھ رہے ہیں اس دور میں اور بھی قلم کار ہیں جنہوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعہ پسماندہ طبقات کی نمائندگی کی ہے۔ ان میں قاضی عبدالستار، شوکت صدیقی، غضنفر، عبدالصمد، پیغام آفاقی، حسین الحق، شموئل احمد، مشرف عالم ذوقی، اقبال مجید وغیرہ کے نام ہیں۔ جنہوں نے پسماندہ طبقات اور دبے کچلے لوگوں کو اپنے ناول وافسانہ کا موضوع بنایا ہے۔ اردو ادب کی فہرست میں طارق چھتاری اور شوکت حیات نے بھی اپنے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ جنہوں نے پسماندہ اور دلت ادب کو موضوع بحث رکھا ہے۔ لیکن ان سب میں نمایاں نام الیاس احمد گدی کا ہے جنہوں نے پہلی بار کول فیلڈ میں کام کرنے والے مزدوروں کو اپنے ناول میں پرویا ہے۔ جو چیز قاری کو ناول کے سب سے قریب کرتی ہے وہ ناول نگار کا ہمدردانہ لہجہ ہے جو مختلف کرداروں کے پیش نظر ہمارے سامنے آتا ہے وہ چیز جو کرداروں کو کول فیلڈ کے سرد شبنم میں جلاتی ہے وہ اس کی بھوک یا پیٹ ہے جسے مصنف نے خود اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے :

''بھوک جو ہزاروں سال سے شاید ازل سے انسان کی سب سے بڑی
مجبوری رہی ہے۔ یہ بھوک جو آدمی کو غیر انسانی شفقت پر آمادہ کرتی ہے اور
غیر انسانی سلوک برداشت کرنے پر مجبور۔'' (ص ۸)

کول فیلڈ میں کام کرنے والے مزدوروں کے دکھ درد، رنج وغم، محنت ومشقت، استحصال اور ان کی زندگی میں پیش آنے والے روزمرہ کے مسائل کو ناول نگار نے بڑی ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔ یہاں ناول نگار نے حقیقت کو افسانہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جس جگہ کی صورت حال بیان کر رہا ہے وہ ان کے حصے میں ہے جہاں سے اس کا رشتہ بڑا پرانا ہے۔ جیسا کہ خود ناول کے بیان سے بھی واضح ہوتا ہے :

''چھوٹا ناگپور کے تہہ خانے میں کالا سونا کتنے عرصہ سے محفوظ تھا یہ کوئی نہیں
جانتا اس کا پتہ لگایا ان لوگوں نے جنھوں نے دونوں ہاتھ سے ہندوستان
کولوٹا یہاں تک کہ زیر زمین دولت تک ان کے ہاتھ پہنچ گئے۔'' (ص ۷)

اس ناول میں سہد یوایک مرکزی کردار ہے جو ہیرو ہے۔سہد یو ریاست بہار کے گیا ضلع کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہے جو نچلے طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ حالات سے دوچار ہوکر وہ گاؤں چھوڑنے پر مجبور ہے۔ننکو جواس کے گاؤں کا ساتھی ہے اور کولیری میں پہلے سے کام کر رہا ہے۔سہد یو بھی اس کے ساتھ گھر سے نکلتا ہے چلتے ہوئے اسے راستے میں اور بھی لوگ مثلا ،جگیشر دوسادھ اور رحمت میاں مل جاتے ہیں۔ وہ سب کے سب کولیری میں پہنچتے ہیں۔ننکو کی پیروی پر سہد یو کو کام مل جاتا ہے ساتھ ہی کسی نہ کسی طرح جگیشر دوسادھ اور رحمت میاں پر بھی عنایت ہوجاتی ہے۔ رحمت میاں سہد یو کے قریبی گاؤں کا باشندہ ہے سہد یو کو رحمت میاں سے ہمدردی ہے وہ کام کرنے کے دوران اپنی حیثیت کے مطابق مدد بھی کرتا ہے۔لیکن یہ کوئلے کی ایسی کالی دنیا ہے جو کسی کا لباس بے داغ نہیں رہنے دے سکتی ہے۔ یہاں ایسے ایسے لالچی اور سود خور لوگ ہیں جو غریبوں کا لہو چوس کر عیش وآرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سہد یو کے سینے میں ایک دردمندانہ دل ہے اور اس سے بعض ایسی حرکت سرزد ہوتی ہے جو کولیری کے قاعدے قانون سے جدا ہیں۔ننکو اس کی اس حرکت سے پریشان ہوجاتا ہے کیونکہ اس نے سہد یو کو گاؤں سے اپنی ذمہ داری پر لایا تھا وہ نہیں چاہتا ہے کہ شہد یو خواہ مخواہ کسی پریشانی میں مبتلا ہو۔ سہد یو ایک انا پسند شخص ہے۔اس کولیری میں ایسے کردار بھی ہیں جو دوسرے کا خون چوس رہے ہیں۔ کالا چند جو ایک مقروض فرد ہے وہ کپل سنگھ اور اس جیسے دوسرے لوگوں سے قرض لیتا ہے لیکن اس کی ادائیگی وقت پر نہیں کرتا۔تنخواہ ملنے کے دن کپل سنگھ کالا چند کو گھیر لیتا ہے اور سود سمیت قرض لوٹانے کا مطالبہ کرتا ہے۔لیکن کالا چند وقت پر روپیہ ادا کرنا نہیں چاہتا خواہ اسے گالی سننا اور مار کھانا کیوں نہ پڑے۔ سہد یو سے کپل سنگھ کی سختی اور انسانیت کی تذلیل نہیں دیکھی جاتی۔ وہ کپل سنگھ سے الجھ پڑتا ہے اور کالا چند کو بچاتا ہے لیکن یہ بات ننکو کو اچھی نہیں لگتی کیونکہ کالا چند کوئی شریف آدمی نہیں ہے۔آخر کار سہد یو کا رنگ کپل سنگھ پر جم جاتا ہے۔سہد یو کالا چند کا قرض ادا کر دیتا ہے اور ننکو کی مرضی سے کپل سنگھ سے اس کی صلح کرا دیتا ہے۔کپل سنگھ کو احساس ہوتا ہے کہ سہد یو کام کا آدمی ہے اس لئے وہ منشی گری کی ملازمت کی پیش کش کرتا ہے کیونکہ سہد یو میٹرک پاس ہے اور ان سارا ماحول میں وہ پڑھا لکھا فرد ہے۔ جب کسی کو مدد کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ کپل سنگھ کے پاس نہ جا کر سہد یو سے مدد مانگتے ہیں اس کی مقبولیت بڑھنے لگتی ہے جو جتنا اس اندھی نگری میں مقبول ہونے لگتا ہے اتنا ہی یونین اور مینجمنٹ دونوں کی نظروں میں چڑھ جاتا ہے۔سہد یو ناول کا ہیرو ہے جس کی باطن میں انسانیت کی چاشنی برابر زندہ رہتی ہے۔

ISSN :2582 -3612

وہ ظلم بھی سہتا ہے گرتا اور سنبھلتا بھی ،تڑپتا اور ہے مگر وہ شکست سے ہار نہیں مانتا۔ مجمدار کی بہن پرتی بالا ہے جو ذاتی طور پر برہمن ہے اور کمسنی میں بیوہ ہوچکی ہے سہد یو اس سے شادی کر لیتا ہے اس لئے کہ مجمدار سہد یو کا ہمدرد بھی ہے اور دوست بھی۔اس سے پہلے مجمدار اس کے لئے لڑکا دیکھتا ہے۔ جب سہد یو پرتی بالا کو یہ بات بتاتا ہے تو وہ اپنا خیال یوں پیش کرتی ہے :

''ہمارے یہاں بیوہ کی شادی نہیں ہوتی ہے۔ میں برہمن ہوں.................
مگر دادا کمیونسٹ آدمی ہیں۔ دھرم ورم کو نہیں مانتے۔......(ص ۱۹۸)۔

اس میں دوسرا غیر اہم کردار ختونیا کا ہے جو رحمت میاں کی بیوی ہے اس کا بچہ (عرفان) ہے۔ختونیا جس کا شوہر کولیری میں کام کرتے ہوئے موت کے منہ میں چلا جاتا ہے تب اسے نہ تو لاش ملتی ہے نہ معاوضہ۔اس میں ایسے لوگ ہیں جن کا روپیوں سے جیب گرما تا رہتا ہے کیونکہ منہ بند کرنے کا اس سے بڑا ذریعہ اور کوئی نہیں۔ختونیا وہ شخص ہے جس کی آنکھوں میں انتقام کی آگ دہکتی رہتی ہے۔ وہ شوہر کے مرجانے کے بعد کوئلے بیچ کر گذر بسر کرتی ہے وہ اپنے بیٹے عرفان کو لکھا پڑھا کر اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ اپنی زندگی اچھے سے جی سکے۔ختونیا اور اس کے بیٹے کو مایوسی نہیں ہے۔ بلکہ اسے تو یقین ہے کہ حالات بدلیں گے اور انصاف ہوگا۔مگر کول فیلڈ میں دل وجان سے محنت کرنے کا دور ختم نہیں ہوتا۔

ناول ''فائر ایریا'' موضوع ،مواد کہانی اور اسلوب تمام سطحوں پر کافی زوردار طریقے سے ابھرا ہے۔ اس پر بحث کی جائے تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے یہاں ناول پیش کرنے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ گدی کو زبان وبیان پر پوری طرح دسترس حاصل ہے جو ہمیں اس ناول میں دیکھنے کو ملتی ہے، دبے، کچلے اور استحسال زدہ فردوں پر عرصہ دراز سے کافی کچھ لکھا جا چکا ہے۔مگر پہلی بار جس موضوع کو گدی نے پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ مصنف کا کمال ہی ہے کہ اس نے دبے، کچلے لہجے کو چیخ میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ کسی خاص طبقے کے خلاف آواز بلند نہیں کی گئی بلکہ ایک خاص ذہنیت کو ہدف بنایا گیا ہے وہ ایک خاص ذہنی وفکری رویہ جو ہر زمانے ، ہر دور میں سماج کے ایک بڑے حصے کو دبا کچلا اور پسماندہ دیکھنا چاہتا ہے۔ظلم جبر اور استحصال سے ڈرا اور خوف کی سائیکی ان پر مسلط ہے۔

Nemat Shama
Research Scholar
Deptt. of Urdu
Patna University, Patna

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ذاکر حسین

علامہ ارشد القادری بحیثیت نقاد

علامہ ارشد القادری کی شناخت مذہبی اعتبار سے اس معاملے میں بھی ہے کہ آپ نے افکار رضا کی توضیح و ترسیل میں بہترین خدمات انجام دی ہیں۔اس سلسلے سے یہ بھی کہا جائے گا کہ آپ نے صحت عقائد و معمولات اور جماعتی اتحاد وسالمیت کے ساتھ ساتھ فکری، تنظیمی، صحافتی، عملی اور تصنیفی اعتبار سے بھی قابل قدر ذمہ داریاں ادا کی ہیں جس کے لئے آپ کو ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔اس سلسلے سے علامہ مظفر حسین کا خیال ملاحظہ کیجئے :

''دنیائے اسلام کے عظیم دینی رہنما حضرت علامہ ارشد القادری مدظلہ العالی ایسی گوناگوں خوبیوں کے حامل ہیں کہ ایسی جامع الصفات شخصیات صدیوں میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہیں۔میں انہیں اپنے وقت کا محمد بن قاسم کہتا ہوں کہ جس طرف رخ کیا فتح ونصرت اور کامیابی وکامرانی نے بڑھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔''

(ماہنامہ ''جام نور'' نئی دہلی، اپریل ۲۰۰۵ء، ص-۱۸)

اس اقتباس کی روشنی میں یہ کہا جائے گا کہ علامہ ارشد القادری مبلغ اسلام یورپ وایشیا کی شخصیت تصرف وکمالات کا منبع تھی۔لہٰذا میں یہ عرض کرتا چلوں کہ علامہ ارشد القادری کے تنقیدی شعور کے ذکر کے قبل ان کی قابل ستائش شخصیت کے متعلق چند باتیں پیش کرنا ضروری تھی۔

جہاں تک آپ کی تنقیدی نگاری کی بات ہے تو آپ کی تنقیدی نگارشات آپ کو اپنے معاصرین میں منفرد شناخت عطا کرتی ہیں۔آپ کی تنقید میں صحیح وغلط، حق وباطل کا درمیانی فرق صاف طور سے عیاں نظر آتا ہے۔مختصر یہ کہ آپ کا طرز استدلال نہ صرف منطقی ہے بلکہ ایک ہی موضوع پر آپ دو خیالات کو سامنے رکھتے ہوئے واضح اور درست نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔آپ کی تنقید نگاری کے سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''انہوں نے اپنی پوری زندگی میں چھوٹے بڑے موضوعات پر ڈھائی درجن سے زائد کتابیں تصنیف کیں اور متعدد رسائل وجرائد کو اپنے وقیع مقالات اور حسین وگرانقدر مضامین ومکاتیب ارسال کئے، لیکن ان تمام تصنیفات میں ان کی جو خوبی قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ ان کی مذہبیت ہے۔وہ اسلامی

ISSN :2582 -3612

تہذیب کے ترجمان تھے جو ماضی کی زبان میں حال کا ترجمہ کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی تنقید کے نشانے پر ہر وہ جماعت اور شخصیت رہی جن کے افکار و نظریات ائمہ اسلاف کے معتقدات سے متصادم تھے۔''

(ارمغان علامہ ارشد، سید محمد ولی الدین رضوی، ص-۵۵)

آپ کی تنقید آپ کے وسعت مطالعہ اور قوت حافظہ کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔آپ کے یہاں غیر جانبدارانہ رویہ بھی جلوہ نما نظر آتا ہے۔اس کی خاص وجہ ہے کہ علامہ اشیا کو اصلی حیثیت میں پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔یہی طریقہ کار آپ کی تنقید کو وقار اور جلا بخشتی ہے۔آپ کی تنقید کی ایک خصوصیت معروضی انداز بیان بھی ہے۔لہٰذا آپ بڑے سے بڑے مسئلے کو چند جملوں میں ادا کرنے کا وصف خاص رکھتے ہیں۔آپ کے تنقیدی شعور کا جائزہ اس اقتباس سے بھی لے سکتے ہیں :

''اگر حق تعالیٰ کسی کام کو لینا نہیں چاہتے تو چاہے انبیا بھی کتنی کوششیں کریں تب بھی وہ ذرہ نہیں ہل سکتا اور کرنا چاہیں تو تم جیسے ضعیف سے بھی وہ کام لے لیں جو انبیا سے بھی نہ ہو سکے۔''

(مکاتیب الیاس، علامہ ارشد القادری، ص-۱۰۸-۱۰۷)

آپ کے یہاں جس طرح معروضی انداز بیان کے سلسلے سے کئی مثالیں ملتی ہیں اسی طرح آپ کی تنقید میں طنز وظرافت کا بھی عنصر جلوہ نما نظر آتا ہے، لیکن ایسی تنقید میں بھی ادبی شعور اور تجربے کی گہرائی دیکھنے کو ملتی ہے۔اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''مولانا مودودی کو وہ نگاہ مبارک ہو جس نے کلیسا کا چراغ لے کر کعبے کے پاسبانوں کا عیب تلاش کیا۔''

(جماعت اسلامی، علامہ ارشد القادری، ص-۴۰)

جہاں تک آپ کی تنقیدی زبان اور اسلوب کی بات ہے تو یہاں سلاست روانی برجستگی، شگفتگی قارئین کو خاصا متاثر کرتی ہے۔دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی تنقید میں سنجیدگی، متانت اور ادبیت کی موجودگی آپ کو تنقید کے میدان میں منفرد مقام عطا کرتی ہے۔اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''کاروبار ہستی میں ان کی ذاتی خواہشات اتنی دخیل اور مؤثر تھی کہ اگرچہ زمین کا سینہ تپتا رہا فصل جلتی رہی اور کاشتکاروں کی آہیں باب رحمت پر سر پٹکتی رہیں .... بارش کو چاروناچار رکنا پڑا۔''

(زلزلہ، علامہ ارشد القادری، ص ۲۶۳)

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ مذہبی تنقید نگاروں میں آپ کو اعلیٰ و ارفع مقام حاصل ہے۔ آپ کی تنقید میں جہاں متعدد موضوعات کی پیشکش دیکھنے کو ملتی ہے وہیں زبان اور اظہار بھی ادبیانہ ہے۔ اس پر اضافہ یہ کہ شیریں زبانی آپ کی تحریر کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہے۔

تمام باتوں کی روشنی میں یہ کہا جائے گا کہ علامہ ارشد القادری بحیثیت نقاد معروف ہیں۔ آپ کی تنقید نگاری کے حوالے سے قارئین آپ کے عکس جمالی، قلمی، ادبی فکری اور تنقیدی کمالات کا بخوبی اعتراف کر سکتے ہیں۔ آپ کی تصنیفات اپنی منفرد شناخت رکھتی ہیں۔ مختصر یہ کہ بحیثیت نقاد علامہ ارشد القادری کا مقام قابل ستائش ہے۔

Zakir Husain
Reseach Scholar
Deptt. of Urdu
Magadh University
Bodh Gaya

محمد علی

خدیجہ مستور کی ناول نگاری۔ایک جائزہ

خدیجہ مستور (۱۹۲۷۔۱۹۸۲ء) کی شناخت اردو ادب میں بحیثیت ناول نگار بھی ہے۔ لیکن اردو ادب میں ان کی سب سے نمایاں جہت افسانہ نگاری ہے۔ انہوں نے بہت کم عمری سے افسانہ لکھنا شروع کر دیا تھا۔ والد ڈاکٹر تہور احمد خان تو ایک سرکاری ملازم تھے لیکن والدہ انور جہاں کا تعلق اردو ادب سے تھا۔ ان کے اکثر مضامین مختلف نسائی جریدوں میں شائع ہوتے تھے۔ خدیجہ مستور نے اپنی والدہ سے متاثر ہو کر لکھنا شروع کیا۔ خدیجہ مستور کی ملاقات جب اتفاقاً شوکت تھانوی سے ہوئی تو انہوں نے خدیجہ مستور کی خوب حوصلہ افزائی کی۔ ان کی ابتدائی کہانیاں ''خیام'' اور عالمگیر رسالوں میں شائع ہوئیں۔ والدہ کے ساتھ ساتھ والد بھی ادب سے گہری محبت رکھتے تھے۔ ایسے ماحول میں خدیجہ مستور کی ادبی شخصیت کی تعمیر و تربیت ہوئی۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''کھیل'' ۱۹۶۶ء میں دوسرا ''بوچھار'' ۱۹۴۶ء میں تیسرا ''چند روز اور'' ۱۹۵۱ء میں چوتھا ''تھکے ہارے'' ۱۹۶۲ء میں اور پانچواں ''ٹھنڈا میٹھا پانی'' ۱۹۸۱ء میں منظر عام ہوا۔ انہوں نے صرف دو ناول لکھے ہیں۔ پہلا ناول ''آنگن'' ۱۹۶۲ء میں اشاعت کے مرحلے طے کرنے کے بعد اردو ادب میں کافی مشہور و مقبول ہوا۔ اسی ناول پر انہیں حکومت پاکستان کی طرف سے ''آدم جی ادبی انعام'' سے نوازہ گیا۔ دوسرا ناول ''زمین'' ان کی وفات کے بعد ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ دراصل یہ ناول ان کی زندگی میں کہیں گم ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں مشہور و معروف ناقد پروفیسر وہاب اشرفی کے چند جملے ملاحظہ فرمائیں :

> ''خدیجہ مستور یوں تو افسانہ نگار ہیں لیکن ان کا ناول آنگن کافی مشہور و مقبول ہوا۔ اس سے پہلے انہوں نے ایک ناول لکھا تھا جو آمد و رفت میں کہیں گم ہو گیا۔ عنوان تھا۔ ''زمین''، ''آنگن'' ان کا دوسرا ناول ہے۔''
>
> (تاریخ ادب اردو جلد سوم : مصنفہ وہاب اشرفی، ص۔۲۳۱)

خدیجہ مستور بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ لیکن انہوں نے صرف دو ناول لکھے اور ان کا ایک ناول ''آنگن'' اس قدر مشہور و مقبول ہوا کہ ان کی شخصیت کی یہ جہت بھی بہت نمایاں نظر آنے لگی۔ اردو ناول نگاری کی روایت میں ان کا ناول ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی ناول نگاری ہر دور میں موضوع بحث رہی ہے۔ ناول ''آنگن'' ایسا ناول ہے جس میں موصوفہ کی فکری اور فنی تمام صلاحیتیں اپنے درجہ کمال پر نظر آتی

ہیں۔انہوں نے ایک معمولی سے موضوع کو اپنی ہنرمندی اور خوش سلیقگی سے اس قدر موثر بنا دیا کہ یہ ''آنگن'' مسلم معاشرہ کا ایک سچّا آئینہ بن گیا اور اس آنگن کے تمام رنگ لوگوں کے اپنے آنگن میں قوس قزح کا رنگ لے کر نظر آنے لگے۔اس ناول میں خدیجہ مستور نے کوئی راکٹ سائنس کی بات نہیں کی بلکہ سارے گھریلو معاملات کو نہایت موثر انداز میں پیش کر دیا۔اس ناول کا زمانہ بھی سیاسی، سماجی اور اقتصادی انقلاب کا زمانہ رہا ہے۔اس ناول میں بھی جس زمانے کی تصویر کشی کی گئی ہے وہ زمانہ ۱۹۲۰ء کے بعد سے لے کر آزادی ہند کے بعد کا زمانہ ضبط تحریر میں آیا ہے جو جملہ انقلاب بات کی وجہ سے تاریخ رقم کر چکا ہے۔اس ناول کے کردار ذہن و دل پر ایک کاری ضرب لگاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔اس ناول کے تمام کردار واقعیت کا رنگ لئے ہوئے ہیں اور تمام کردار اپنا راگ اپنی ڈفلی بجاتے ہوئے نظر آئے ہیں۔تمام کردار اس دور کے مسائل کے ترجمان نظر آتے ہیں۔جس سے اس دور کے حالات، معاشرے، خاندان، زمیندارانہ زوال، اقتصادی بحران ، سیاست، تقسیم ملک، اور اس سے پیدا ہونے والے ہندوستان کے درمیان کشیدگی وغیرہ تمام صورت حال کی سچّی تصویر نظر کے سامنے آجاتی ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر شمع افروز زیدی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''یہ ناول موجودہ صدی کی دوسری دہائی سے شروع ہو کر تقسیم ہند کے بعد زمانے پر محیط ہے۔اس ناول میں انہوں نے زوال آمادہ تہذیب، انحطاط پذیر معاشرہ اور بیسویں صدی کے مشترکہ ہندوستان کے اقتصادی نظام اور تہذیبی بساط ہر ہندوستانی مسلمانوں کے متوسط طبقے اہمیت کی ترجمانی یا باز یافت کی ہے۔اس طرح خدیجہ مستور کا آنگن ہندوستان و پاکستان کے ہر آنگن کی علامت بن گیا ہے۔اس کا موضوع ماضی کی بھولی بسری زندگی ہے۔اس میں انہوں نے نئی نسل کے ذہن اور احساس کے نازک فرق اور ان کی آویزش کو نمایاں کیا ہے۔''

(ڈاکٹر شمع افروز زیدی ''بیسویں صدی'' دہلی ۱۹۸۷ء ص۔۳۰۹۔۳۱۰)

خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن'' پلاٹ کے اعتبار سے بھی نہایت عمدہ ہے۔اس ناول کا پلاٹ گٹھا ہوا ہے۔اس ناول کے تمام ذیلی اور ضمنی واقعات مرکزی کہانی سے سیدھے سیدھے منسلک و مربوط نظر آتے ہیں۔کہیں بھی بے جا اور غیر ضروری واقعات کی آمیزش اس ناول میں نہیں کی گئی ہے۔ناول نگار کی پلاٹ سازی ایک کامیاب پلاٹ سازی سی ہے۔اس فن میں وہ ماہرانہ دسترس رکھتی ہیں۔

خدیجہ مستور نے آزادی کے پہلے اور آزادی کے بعد کی نہایت خوبصورت اور واقعیت پذیر تصویر کھینچی ہے۔سماج کی اچھائیوں کو بھی نشان زد کیا ہے۔اور سماج میں پھیلی ہوئی برائیاں بھی بروئے کار رکھ

ISSN :2582 -3612

دیں ہیں۔خدیجہ مستور کی یہ خوبی ہے کہ انہوں نے حقیقت کو بغیر کسی رنگ و روغن کے من و عن سامنے رکھ دیا ہے۔جس کی وجہ سے یہ کہانی اور اس کے واقعات ذہن و دل کو اثر انداز کرتے ہوئے دکھائے دیتے ہیں۔اس سلسلے میں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''جہاں تک ''آنگن'' میں سماجی انتشار کا تعلق ہے اس سلسلے میں خدیجہ مستور نے مختلف مقامات پر بڑی موثر ترین جھلکیاں دکھائی ہیں۔مثلاً جاگیردارانہ نظام میں عام طور پر مرد کئی شادیاں کرتے ہیں اور داشتائیں بھی رکھتے ہیں جسے قابل فخر اور قابل شان سمجھا جاتا تھا۔شادی سے پہلے غیر عورتوں کے ساتھ تعلق رکھنا بھی معیوب نہ سمجھا جاتا بلکہ ان تمام باتوں کو مردانگی تصوّر کیا جاتا۔لیکن ان غیر منکوحہ عورتوں سے پیدا ہونے والی ناجائز اولاد کو سماج میں کوئی مقام حاصل نہ تھا۔''

(تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران : مصنفہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ،ص۔۲۵۰)

خدیجہ مستور کی اس ناول میں کردار سازی لاجواب ہے۔کرداروں پر ان کی دسترس ہے۔اس ناول کے مرکزی اور ضمنی تمام کردار نہایت حساس ہیں۔ان کرداروں کے درمیان کشیدگی کے عنصر نمایاں ہیں۔تمام کردار اپنے اپنے رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔اس ناول کا ہر کردار اپنی جگہ پر تنہا اور بے یار و مددگار نظر آتا ہے۔کچھ کردار ایسے ہیں جو ابتدا سے آخر تک ایک دوسرے کے دکھ درد میں برابر کا شریک نظر آتے ہیں۔کچھ کردار ضرورت کے تحت وجود میں آتے ہیں اور کام ختم ہونے کے بعد غائب ہو جاتے ہیں اس ناول کے موثر کرداروں کے نام عالیہ، عالیہ کے والد، مظہر چچا، تہمینہ باجی، چھمّی، امّاں، صفدر بھائی، بڑے چچا، بڑی چچی، جمیل بھائی، کریمن بُوا، شکیل، اسرار میاں، امّاں کے بھائی، ظفر چچا، انگریز بھابی وغیرہ اپنی کردار نگاری کی وجہ سے یاد کئے جانے کے لائق ہیں۔کچھ ایسے کردار جو اپنا کام کر کے غائب ہو جاتے ہیں ان کے نام رائے صاحب، کسم دیدی، شیام، شیام کے والدین، تھانیدار کا بیٹا، منظور، صفدر بھائی کی ماں سلمٰی، بڑے چچا کی بیٹی، ڈیم پھول کہنے والا انگریز افسر، مسٹر ہارووڈ، نجمہ اور دادی اماں وغیرہ۔خدیجہ مستور نے ناول آنگن میں بہترین کرداروں کا نمونہ پیش کیا ہے۔انہیں کردار نگاری کے فن پر مہارت حاصل ہے۔کرداروں کی ذہنیت اور افکار و نظریات پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

آنگن'' کے سبھی کردار ہر وقت مخالف سیاسی نظریات کے حامل معلوم ہوتے ہیں۔اس آنگن میں گھر کے سرپرست بڑے چچا ہیں۔جو کٹّر کانگریسی ہیں۔انگریزوں کے خلاف تحریکات میں آئے دن جیل جاتے ہیں ان کا بیٹا جمیل

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ہے۔ جو مسلم لیگ کا جماعتی ہے۔ وہ باپ کی مفاہمیت پسندی کا قائل نہیں بلکہ کانگریس کی ہندو پرستی کا نکتہ چیں ہے۔ بغیر ماں باپ کی لڑکی چھمّی ہے جو مسلم لیگ کے جلسوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے۔ بڑے چچا کی بھتیجی عالیہ ہے جس کے ابّو اپنے انگریز افسر کو مارنے کے جرم میں جیل جا کر فوت ہو گئے تھے۔ عالیہ کی پھوپھی کی ناجائز اولاد صفدر ہے جو کمیونسٹ ذہنیت کا حامل ہے۔ بڑے چچا کے باپ کی نچلی ذات کی بیوی کی اولاد اسرار میاں ہیں جو بڑے چچا کے کپڑے کی دکان چلا کر گھر کے اخراجات پورے کرتے ہیں۔ عالیہ کی ماں انگریز حکومت اور ان کے کلچر کے خلاف معمولی سی بات سننا بھی گوارہ نہیں کرتی کیونکہ اس کے بھائی نے ایک انگریز عورت سے شادی کی تھی۔''

(تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران : ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، ص۔۲۴۹۔۲۵۰)

خدیجہ مستور کی ناول نگاری فکری اور فنی دونوں اعتبار سے مسلمانوں کے درپیش مسائل اور اس سے بنرد آزما ہونے کی جدوجہد کی خوبصورت تصویر پیش کرتا ہے۔ اس ناول کا آنگن بڑے چچا کا صرف آنگن نہیں ہے بلکہ اس آنگن کا دائرہ ہندوستان و پاکستان کو اپنے حدود میں سمیٹ لیتا ہے۔ ان کا دوسرا ناول ''زمین'' اسی ناول کی ایک کڑی ہے۔ یہ ناول وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں سے آنگن ختم ہوتا ہے۔ اسی لئے ''زمین'' کو ''آنگن'' کی توسیع بھی کہا جاتا ہے۔ اس ناول میں پاکستان کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ جس میں اقدار کی شکست و ریخت، معاشرتی تبدیلیوں کو ظاہر کیا گیا ہے ناول ''زمین'' میں اخلاقی قدروں کے پستی کی داستان بیان کی گئی ہے۔ دونوں ناول تقسیم ملک کے دوران ہوئے فسادات کی ترجمانی پیش کرتا ہے۔ ان دونوں کی بنیاد پر ہی ان کی ناول نگاری اہمیت اور مرتبے کی متقاضی ہے۔ ان ناولوں کی بدولت انہیں بحیثیت ناول نگار ایک مقام و مرتبہ حاصل ہے۔

Md. Ali
Research Scholar
Deptt of Urdu
L.N. Mithila University
Darbhanga

نصرت پروین

انشائیہ میں موضوع کا انکشافی عمل

فنی اعتبار سے انشائیہ موضوعی اور داخلی صنف اظہار ہے۔ انشائیہ اشیاء اور مظاہر کی خارجی سطح کو مس کرنے کے بجائے ان کو مضمون میں کھنگالتا اور جذبے کو برانگیختہ کرتا ہے ساتھ ہی اس کی تہذیب بھی کرتا ہے اور یوں ہمارے سامنے مظاہر کی نئی نئی صورتیں اور تاثر کی نئی نئی کیفیتیں اُجاگر ہوتی ہیں۔

انشائیہ انقباضِ فکر کے بجائے شگفتن ذات کا مظہر ہے اور منفی ردعمل کو ابھارنے کے بجائے مثبت جذبوں کی افزائش کرتا ہے۔ انشائیہ میں مصنف کی ذات کا عمل دخل چونکہ زیادہ ہوتا ہے اس لئے اس میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ انشائیہ نگار نے موضوعِ نو کو اپنی ذات میں کس حد تک ضم کیا ہے۔ اس سلسلے میں انگریزی میں انشائیہ کے نقاد سی نینسن نے ایک حکایت بیان کی ہے کہ ایک دفعہ ایک رنگ ساز گھومتا گھماتا گاؤں کی ایک کارواں سرائے میں آنکلا۔ اس کی نگاہ سرائے کے کہنہ اور بوسیدہ بورڈ پر پڑی۔ بورڈ کا رنگ مدھم پڑ چکا تھا اور اب اس کی شکل و صورت جس تیزی سے بدل رہی تھی اسی تیزی سے رنگ ساز کے دل میں بورڈ کی تزئین نو کی تمنا پیدا ہو رہی تھی۔ لیکن ایک روز رنگ ساز یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کارواں سرائے کی پیشانی پر پرانے بورڈ کی جگہ ایک نیا چمکیلا اور روغن شدہ بورڈ آویزاں تھا۔ رنگ ساز نے نئے بورڈ پر ایک نگاہ خارشگاف ڈالی اور سرائے کے ایک مالک کو جو اپنے اس کارنامے پر دادِ تحسین حاصل کرنے کیلئے پاس ہی کھڑا تھا، قہر بھری نظروں سے دیکھا۔ لیکن مایوس لہجے میں بس اتنا کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی شخص اُسے خود رنگ کرتا رہا ہے۔

اس حکایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انشائیہ نگاری میں وہ شخص زیادہ اہم ہے جو موضوع پر انکشافی عمل آزماتا ہے۔ اس طرح ہلکی سی بے اطمینانی اور ناموجود کو موجود سے دریافت کرنے کی آرزو ملتی ہے۔ یہ آزاد ذہن کی تخلیق ہے۔ اگرچہ اس کے موضوعات کا دائرہ وسیع عمل کے طریقے لامحدود اور روایتی یا رسمی طریق کار متروکی ہے۔ تاہم ساخت، ربط باہم اور وحدت خیال کی ضرورت سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

انشائیہ میں نیم فکری اور خالص تأثراتی باتیں منتشر رہتی ہیں لیکن اس میں لہک اور چمک کی وہ دلآویزی ہوتی ہے جو قلم کار کی ذہنی خوش خرامی کا نتیجہ ہے۔ یہ خوبی اور خصوصیت ہے کہ اس کے اجزاء

فکری ہوتے ہیں اور جذباتی بھی نظر آتے ہیں۔ یعنی یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور محسوسات کے وسیع تر احکامات بھی چھوڑتا ہے۔ مخفی مفاہیم کو یہ اس طور گرفت میں لیتا ہے کہ شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر نئے مدار کو وجود میں لانے کا سبب بنتا ہے۔ یہ سوچ کو متحرک کرتا ہے۔ اور آزادانہ گفتگو کرنے کے باوجود اپنی انائے کاذب کی تسکین نہیں کرتا بلکہ روشنیوں، سایوں اور رنگوں کے نئے کیمیائی امتزاج سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس میں شخصیت کی نمود بالذات نہیں بلکہ محض ایک وسیلہ ہوتی ہے۔ وزیر آغا نے اسے دوگونہ کیفیات سے عبارت کیا ہے۔ یعنی سمندر کے لمس کو محسوس کرنے مگر سمندر کے سارے خروش کو ایک مُتبسّم نگاہ سے دیکھنے کا رویہ ہے اسے اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ میں اب اس مقام پر ہوں جہاں سے میں زندگی کو پہلی بار ایک ایسے تناظر میں دیکھ رہا ہوں کہ مجھے کائنات کے بڑے بڑے مظاہر کے علاوہ اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور چیزوں میں بھی ایک جہان معنی نظر آنے لگا ہے۔ مثلاً پرسوں کی بات ہے کہ کتابوں کا ایک پیکٹ بنانے کے لئے مجھے رسّی کی ضرورت پڑی۔ مگر جب رسّی مل گئی تو اس میں ایک مضبوط سی گرہ پڑی ہوئی تھی۔ میں کتنا ہی عرصہ اسے ناخنوں کی مدد سے کھولنے کی کوشش کرتا رہا جب کامیاب نہ ہوا تو اپنے دانتوں کی مدد طلب کرنے کی بات سوچنے لگا کتنے ہی عرصہ تک دانتوں سے گرہ پر حملے کئے تب کہیں جا کر گرہ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ جہاں گرہ تھی وہاں رسی میں ایک سلوٹ سی پڑ گئی تھی۔ میں نے رسّی کو ذرا سا کھینچا، سلوٹ کو چندے سہلایا اور گرہ رسی کے اندر پوری طرح جذب ہوگئی۔ اچانک میں رُک گیا اور سوچنے لگا کہ گرہ کہاں گئی؟ اور تب ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے ذہن میں آیا کہ میں خود بھی تو زندگی کی ڈور میں محض ایک ِگرہ ہوں اور میری طرح ہر شخص ایک گرہ ہے۔ جب گرہ کھل جاتی ہے تو وہ زندگی کی ڈور میں جذب ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ کے لئے ایک سلوٹ سی ضرور باقی رہتی ہے جس پر لوگ از راہ محبت پھول بھی بچھاتے ہیں۔ مگر پھر آہستہ آہستہ وہ ساری خلق خدا سیاہ، سفید، پتلی، موٹی کسی ہوئی یا ڈھیلی ڈھالی ِگرہوں کی صورت میں بکھری پڑی تھی۔ اور زندگی اور موت کا ڈراما یکا یک مجھے ایک ہی روشنی میں دکھائی دینے لگا تھا۔

گرہ سلجھ جائے تو زندگی اسے کلّی طور پر جذب کر لے اور نہ سلجھے تو اس کی انفرادیت کی مظہر بن جائے اور دل میں کانٹا بننے سے گریز نہ کرے۔ انشائیہ نگار اسی سے زندگی اور کائنات کے درمیان ربط باہم تلاش کرتا ہے۔ موت، حیات کے فلسفے کی طرف پیش قدمی اور پھر زندگی کا ڈراما روشنیوں اور سایوں کا نیا منظر آنا تا کہ نئی روشنی اطراف و جوانب بکھر جائے، دراصل شخصیت ہی کا عکس اسلوب ہوتا ہے۔ موضوع کوئی بھی ہو جب تک اسے اسلوب کی تازگی اور شگفتگی صحتمند انداز میں سہارا دیتی ہے۔

انشائیہ میں موضوع کی ڈور کو ہاتھ میں رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن خیال کی پتنگ کو یوں اُڑانا ہوتا

ہے کہ وہ ہوا میں ہر چہار جانب لپکتی جاتی ہے۔ جس طرح انشائیہ کے لئے موضوع کی قید نہیں اور زندگی کے معمولی سے معمولی موضوع پر بھی ایک غیر معمولی انشائیہ تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح انشائیہ میں خیال کی رو سے آگے بند باندھنے کی ضرورت نہیں ہے اور جس سمت میں چاہے بے تکان اُڑان کر سکتی ہے۔ انشائیہ میں خیال خودرو ہوتا ہے۔ یہ ایک آزاد ندی کی طرح موڑ کاٹتا ہے لیکن پھر بڑے دھارے کے ساتھ باہر مِل جاتا ہے۔

بلا شبہ موضوع وہ مرکزی نظم ہے جس کے گرد انشائیہ نگار اپنے تصورات کے غبارے اُڑاتا ہے تاہم انشائیہ نگار کا ذہن اگر رسا ہے تو وہ جس موضوع کو بھی مس کرے وہ لو دینے لگتا ہے وجہ یہ ہے کہ انشائیہ نگاری کے لئے موضوع زرخیز حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے موضوع اگر رسمی، پیش پا، افتادہ اور عام ہوا بھی تو ایک خوش فکر انشائیہ نگار اس کے باطن میں نور کی جوالا اور معنی کی پھلجھڑی برآمد کر سکتا ہے۔

Nusrat Parween
D/o. Md. Kamaluddin
Kasba, Dr. Husain Bakhsh Lane
Champanagar, Nath Nagar - 812 004 (Bihar)

شائستہ شاہین

تاریخ طبری پر اِک نظر

تاریخ طبری میں ابوعلی محمد بن محمد بلعمی نے بہرام بن یزدجرد کی بادشاہت کا ذکر کیا ہے جو بہرام گور کے نام سے مشہور تھا۔ جب بہرام گور بطن مادر سے پیدا ہوا تو یزدجرد نے نجومیوں کو بلا کر اس کا زائچہ تیار کرنے کو کہا انہوں نے اس کی قسمت کے خانہ میں آفتاب کو پا کر قلم لگایا کہ تیرے بعد یہی بادشاہ ہوگا لیکن اس کی پرورش ورضاعت فارس کے باہر کسی اور سرزمین میں ہوگی یہ بات انہوں نے یزدجرد کے گوش گذار کی تو اس نے اپنے مشیروں کے ذریعہ اس کے بارے میں رائے طلب کی کہ اس کی پرورش کس سرزمین میں بہتر ہوگی۔ لوگوں نے عرب کو ترجیح دی۔ یزدجرد نے منذر نعمان کو بلا کے بہرام گور کے سپرد کیا اور اسے اعزاز وانعام سے خوب سرفراز کیا اور حکم دیا کہ میرے بیٹے کو لے جاؤ۔ اس کی پرورش کرو۔

منذر اسے اپنے یہاں لے آیا اور اس کو دودھ پلانے کے لئے تین دایاں دو عرب اور ایک ایرانی مقرر کیں اور تینوں دائیں عقلمند، ذہین تھیں اور حکم دیا کہ ان دایاؤں کو لباس اور کھانے وغیرہ کی جن چیزوں کی ضرورت ہو وہ ان کے لئے مہیا کی جائیں۔ تین سال اسے دودھ پلا کر چوتھے سال چھڑایا گیا۔

جب بہرام کی عمر پانچ سال کی ہوئی تو اس نے منذر سے کہا کہ میرے لئے صاحب علم وعقل استاد مقرر کردو تاکہ وہ مجھے عقل وعلم، تیراندازی وسواری سکھائیں۔ منذر نے کہا کہ آپ ابھی بچہ ہیں یہ ہنر آپ کے لائق نہیں آپ ابھی بڑے ہونے تک بچوں کے کھیل کود سے کام رکھئے۔ جب آپ بڑے ہوجائینگے تو اس وقت آپ کو یہ چیزیں سکھانے کے لئے میں لوگوں کو مقرر کردونگا۔

بہرام نے کہا اگرچہ میں عمر کے لحاظ سے چھوٹا ہوں لیکن میری عقل پختہ اور تجربہ کار انسانوں کی سی ہے۔ تو نہیں جانتا کہ جس چیز کی طلب وقت سے پہلے کی جاتی ہے وہ وقت سے حاصل ہوجاتی ہے اور جس چیز کی طلب عین وقت پر کی جاتی ہے تو وہ ذراسی کاہلی میں فوت ہوجاتی ہے۔ اور پھر حاصل نہیں ہوتی۔ میں بادشاہ کا بیٹا ہوں اور بادشاہ بنوں گا اور بادشاہ کے لئے سب سے ضروری چیز عقل ہے جو اس کی زینت اور بادشاہت کے لئے ضرورت ہوتی ہے اور اسی سے دشمنوں پر اس کو فتح ہوتی ہے میں نے جو بات چاہی ہے تو جا اسے جلد پورا کر اور ان استادوں کو میرے پاس لا۔

منذر نے جب یہ گفتگو سنی بہت تعجب کیا اور یزدجرد کے پاس قاصد بھیجا کہ وہ جلد استادوں،

ISSN :2582 -3612

عقلمندوں، تیراندازوں، شہسواروں اور روم وفارس وغیرہ کے کاملوں اور عاقلوں کو جمع کر کے اس کے پاس روانہ کرے۔

جب یزدجرد نے اپنے بیٹے کا یہ حال سنا تو بہت خوش ہوا اور تمام قسم کے ماہرین کو جو اس کے پاس تھے روانہ کیا۔ بہرام نے ان سے تعلیم حاصل کرنا شروع کی اور ان سے اتنا کچھ سیکھ لیا کہ استادوں سے بھی آگے بڑھ گیا۔ استاد اس کے طلب علم وعزاولت ومرادمت سے بہت خوش ہوئے جب وہ سب کچھ سیکھ چکا تو منذر کو بلا کر عربی گھوڑے جمع کئے۔ منذر کو علم تھا کہ بہرام ایک گھوڑے پر سواری کرے گا۔ اس نے بہرام سے کہا کہ سارے گھوڑے آپ کے سامنے پیش کر دیئے جائیں گے جو گھوڑا آپ کو پسند آئے گا وہ آپ کا ہوجائیگا۔ بہرام نے کہا کہ میں سب سے بہتر شخص ہوں لہٰذا مجھے گھوڑا بھی بہترین ہی چاہئے اور بہتر گھوڑے کی شناخت بلا تجربہ کے گھوڑ دوڑ کرائے نہیں ہوسکتی۔ منذر نے اس کی بات پسند کی اور نعمان کو گھوڑے جمع کرنے کا حکم دیا۔ بہرام اور منذر ساتھ ساتھ گھوڑوں کو دیکھنے گئے ان کے سامنے سے گھوڑوں کے جھنڈ گذرتے رہے پھر ایک ایک دو دو تین تین گھوڑے ان کے سامنے لائے گئے ان میں سے ایک گھوڑا بہرام نے خود پسند کیا۔ منذر اس گھوڑے کو پکڑ کر بہرام کے سامنے لایا اور کہا کہ خدا آپ کو یہ گھوڑا مبارک کرے۔ بہرام نے اسے اُس سے لے کر خوشی ظاہر کی اور منذر کا شکریہ ادا کیا۔

ایک روز اس گھوڑے پر بیٹھ کر بہرام شکار کو گیا جنگل میں ایک شتر مرغ پر نظر پڑی اس کے پیچھے گھوڑا دوڑایا یکایک ایک شیر کو دیکھا جو ایک گورخر کے پیٹھ پر حملہ کر کے اسے چیر پھاڑ ڈالنا چاہتا تھا۔ بہرام نے شیر کی پیٹھ پر ایسا تیر مارا کہ اس کے پیٹ کو چھیدتا ہوا گورخر کے جسم میں پیوسٹ ہو کر اس کی ناف میں باہر نکلا اور بالآخر اس کی نوک زمین پر گر گئی اور اس کی زور سے زمین ہلنے لگی بہت سے عرب کھڑے تھے وہ یہ ماجرا دیکھ کر دنگ رہ گئے وہ سب ادب کے ساتھ اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کی تعظیم بجالائے۔ بہرام نے حکم دیا کہ اس شیر اور تورکھ (گورخر) کی تصویر ان کے زخموں سے تیار کر کے اس کی نشست گاہ میں لگادی جائے۔

پھر بہرام نے منذر سے کہا کہ میں اپنے باپ کی خدمت میں جانا چاہتا ہوں۔ منذر نے اسے وہاں بھیج دیا اس کا باپ بہت بدمزاج تھا اور اپنے بیٹے پر کبھی مہربانی نہیں کرتا تھا۔ بہرام ان کی خدمت کرتا اور ہر قسم کی تکلیف پر صبر کرتا۔ یہاں تک کہ قیصر کا بھائی روم سے صلح کرنے کے لئے وہاں آیا اس وقت بہرام نے اس کے ذریعہ یزدجرد سے درخواست کی کہ اسے وہاں سے جانے کی اجازت دی جائے۔ اجازت پا کر وہ منذر کے پاس چلا گیا اور وہاں عیش وشراب خوری میں مشغول ہوگیا۔ کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد یزدجرد مر گیا۔ تو فوج ورعایا نے اس پر اتفاق کرلیا کہ یزدجرد کی اولاد میں کسی کو بادشاہ نہ بنایا جائے کیوں کہ اس کی اولاد بادشاہت کے لئے بہرام کے سوا کوئی باقی نہیں ہے۔ وہ بادشاہت کے طور وطریقہ سے بالکل ناواقف ہے۔

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

اسے اس کے آداب معلوم ہوئے اور نہ ہی فارسی کے دستور۔ وہ صرف عربوں کے رسوم جانتا اور انہیں کی عادت رکھتا اور عربی کے درمیان پلا اور بڑھا ہے۔ چنانچہ اس سے متفق ہو کر انہوں نے عروشین کی نسل کے ایک فرد خسرو کو بادشاہ بنا دیا۔ اس کی اطلاع بہرام کو عربوں کے علاقے میں ملی۔ اس نے نعمان بن منذر اور دیگر غریب سرداروں کو بلا کر کہا کہ مجھے یہ گمان نہیں کہ تم میرے حسن وسلوک جو اس نے تمہارے ساتھ کیا تھا وہ بھلا دوگے حالاں کہ وہ فارسی والوں پر برابر ظلم کرتا رہا ہے۔ اب میرے باپ کے مرنے کے بعد کسی اور کو تخت شاہی پر بیٹھا دیا گیا ہے تم بتاؤ کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ منذر نے کہا کہ آپ کسی قسم کا ڈر نہ کریں میں آپ کے لئے تدبیر کروں گا۔ منذر نے عربوں کے دس ہزار سوار منتخب کئے اور اپنے بیٹے سے کہا کہ فوج لیکر شہر کی جانب جا اور وہاں لشکر کا پڑاؤ ڈال دے۔ اگر وہ تیری طرف رخ کرے ان کا مال لوٹ لے اور انہیں غلام بنا اور اس کے اوپر پڑاؤ ڈال دیا۔ فوج کے اگلے حصے کو شہر کے پاس بھیجا اہل فارسی کو جب اطلاع ملی تو ان میں بڑی سرگرمی پیدا ہوئی۔ وہاں ایک شخص جودانی نام کا رہتا تھا وہ یزدجرد کا میر منشی رہ چکا تھا اسے قاصد بنا کر منترد کے پاس روانہ کیا اسے منذر کے پاس ان لوگوں کو پیش کیا گیا۔ منذر نے بڑھ کر کہا کہ اس کا کوئی جواب نہ دوں گا۔ قاصد نے کہا کہ اگر آپ پر بار نہ ہو تو بادشاہوں کی جگہ پر چلئے۔ جہاں سارے عقلمند اور سردار آپ کے گرد جمع ہو کر آپس میں صلاح ومشورہ کریں تو بہتر ہو۔ اسی وقت لوگ آپ کے حکم سے باہر جائینگے اور یہ سمجھیں گے کہ آپ جو کر رہے ہیں اس میں انہیں کی بھلائی ہے۔ منذر نے گیارہ اشخاص کو روانہ کیا اور خود تین ہزار بہادر عرب سواروں کے ساتھ روانہ ہو کر فارسی والوں کے اس شہر تک پہنچا۔ فارس کی فوج اکثر سردار اور دوسرے بے اعیان واکابر جمع ہوئے۔ بہرام ایک طلائی تخت پر جن پر موتی جڑے تھے بیٹھا اس نے منذر کو برابر دائیں ہاتھ پر بیٹھایا اور بائیں والوں سے گفتگو شروع کی ان لوگوں نے یزدجرد کی بد مزاجی اور اس کے بے شمار مظالم کی فریاد کی اور کہا کہ ہم نے مل کر عہد کیا تھا کہ ہم اس کی اولاد میں سے کسی کا اور ظلم اٹھانے کی بالکل طاقت نہیں رکھتے ہیں۔ منذر نے ان باتوں کا کچھ جواب نہیں دیا اور بہرام کی طرف رخ کر کے کہا کہ ان لوگوں کا جواب آپ ہی دیں۔ بہرام نے کہا لوگوں میں جھوٹا نہیں سمجھتا جو کچھ تم نے میرے باپ کی برائی اور ظلم وغیرہ کے بارے میں کہا وہ صحیح ہے اس بدخواستی کے باعث میں آپ کے پاس سے چلا گیا تھا اور خدا تعالیٰ سے دعا کرتا تھا کہ یہ بادشاہت مجھے مل جائے تو اس دوران میں اپنے وعدے پورا کروں گا اور اس پر میں خدا تعالیٰ اور فرشتوں اور بڑے مذہبی پیشوا اور منذر کو گواہ بناتا ہوں۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ جس شخص کو تم بادشاہ بنا چکے ہو۔ میں آپ کے بغیر کسی خطا کے باشاہت سے محروم کرنا چاہتا ہوں اس کے لئے میں ایک قطعی اور فیصلہ کن تدبیر بتاتا ہوں وہ یہ کہ تاج شاہی لے جا کر دربقو کے شہر کے درمیان میں ڈال دو اور یہ طے کر دو کہ دو میں سے جو شخص تاج کو ان شیروں کے درمیان سے اٹھا کر لائے بادشاہت اس کو

ملی گی۔ لوگوں نے بہرام کی جب یہ بات سنی تو بہت خوش ہوئے اور اس سے بڑائی امیر میں قائم کیں اور کہا کہ ہم بہرام کو رد نہیں کر سکتے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر ہم نے اسے بادشاہت سے محروم کر دیا تو ہم ہلاک ہو جائیں گے اور عرب ہم پر بڑا ظلم ڈھائینگے کیوں کہ اس کی فوج عربوں پر مشتمل ہے اور قتل وفساد کا بازار گرم ہو جائے گا ہم اس کی ان باتوں کو آزمائینگے جو اس نے اپنی پیری اور مہربانی کے بارے میں کہی ہیں اگر وہ ویسا ہی ہے جیسا کہہ رہا ہے تو ہم فرماں بردار ہو جائینگے اگر وہ ہلاک ہو گیا تو ہمارا اس میں کوئی قصور نہ ہوگا اور ہم اس کے اثر سے محفوظ رہیں گے اس طرح اس جنگ میں بہرام کی فتح ہوئی۔ اپنی حکومت کے آخر زمانہ میں ایک روز بہرام شکار کھیلنے گیا۔ نورکھ اس کے سامنے آیا اس نے اس پر تیر چلایا وہ بھاگا بہرام نے اس کا پیچھا کیا راستے میں ایک کنواں تھا اور اس میں وہ گھوڑا سمیت جا گرا۔ اس کی ماؤں کو جب اطلاع ملی تو وہ بہت سا روپیہ لے کر وہاں پہنچی۔ پیسہ خرچ کر کے کنویں کا سارا پانی نکلوایا یہاں تک کہ وہ خشک ہو گیا لیکن اس کے اندر بہرام کا کوئی پتہ نہ ملا اس کی ماں انتہائی رنج وملال کے ساتھ واپس آئی اور اس صدمہ سے زیادہ دن نہ رہی اور مر گئی۔

Shaista Shaheen
B. A. (Hon's) Enghlish
Maharaja College, Ara

ساغرِ اَدبؔ کے دوسرے شمارے پر آئے ہوئے تأثرات

☆ عزیز مکرم،

دعائے ترقی درجات

سِہ ماہی ''ساغرِ ادبؔ'' کے دونوں شمارے نظر نواز ہوئے۔ دونوں خوب ہیں پہلا تو پڑھنے کے بعد کہیں ''روپوش'' ہو گیا یعنی مَیں نے اسے کسی ایسی جگہ محفوظ طور پر رکھ دیا ہے کہ اب میرے پیشِ نظر نہیں ہے۔ دوسرا میرے ہاتھوں میں ہے۔ مندرجات میں پُرانے اور نئے لکھنے والوں کی شمولیت سے دل باغ باغ ہو گیا۔ اس ساغر میں ''شراب کہنہ'' اور ''مئے نوکشیدہ'' دونوں کا آمیزہ ہے۔ مئے دو آتشہ کا لطف ملا، مضامین وعنوانات کے تنوع سے یہ جریدہ کتب خانہ جیسا ہو گیا ہے۔ چھوٹا ہی سا سہی، لیکن پڑھنے والوں کو علم وادب کے مختلف خزانوں سے تھوڑا تھوڑا متعارف کرا دیا گیا ہے۔ حمد ونعت بھی ہے، لسانیات بھی ہے، شاعری بھی ہے، افسانوی ادب کا جائزہ بھی ہے، مقدار بھی ہے، معیار بھی ہے۔ تنوّع کا اچھا خاصا نمونہ ہے۔ ایک ہی جیسی چیزیں ہوتیں تو کوئی اوُب بھی سکتا تھا، لیکن یہ ساغر تو علم وادب کا واقعی ساگر ہے جس میں ڈوب کر بھی ساحلِ مُراد تک پہنچنا آسان ہے۔ سبھی لکھنے والے جانے پہچانے ہیں۔ جن کے تذکرے ہیں، وہ بھی اعلیٰ قدروں پر فائز ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں بھی بیشتر کو مَیں جانتا ہوں، دعا گو ہوں کہ مالک الملک یعنی خالق دنیا ودین انہیں ترقی کی راہ پر گامزن رکھے اور وہ بلندیوں تک اَشہب قلم کی تگ وتاز سے پہنچتے جائیں۔ میرے لئے بھی دوستوں اور عزیزوں کی دعا چاہئے۔ مَیں زندگی کے آخری موڑ پر پہنچ چکا ہوں۔ میرا ہی ایک شعر ہے ؎

دل کی دھڑکن کو رُک ہی جانا ہے
زیست کا اعتبار کتنے دن!

پَس نوشت : پروف ریڈنگ بڑی محنت سے کی گئی ہے جس کی داد نہ دینا سکوتِ سخن شناس کے زُمرے میں آئے گی اور ناانصافی کہلائے گی، لیکن کہیں کہیں ہلکی سی فروگزاشت بھی ہے، مثلاً! میری ہی نعت شہِ کونین فخرِ موجوات میں یہ مصرع ع

وہ شفیع الوریٰ، وہ مطہّر لقب

یوں چھپ گیا ہے ع وہ شفیع الورا، وہ مطہّر لقب

اس میں وریٰ اور ورا دونوں طرح صحیح ہے، لیکن وہ میں ہائے ہوز کا حذف ہو جانا اس طرح پڑھنے پر مجبور کرتا ہے جیسے واوِ

عطف ہو اور اس صورت میں ''وَ'' تلفظ عربی تو ہو سکتا ہے لیکن فارسی اور اردو میں واوِ عطف ضرورتِ شعری سے ضم ہو جاتا ہے یعنی ''دین ودنیا'' کو دین وَدنیا'' نہیں بولتے۔ میری ہیچ مدانی کے باوجود ضروری سمجھا کہ مَیں نے جو سمجھا، وہ لکھ دوں۔

وما علینا الّا البلاغ

ہیچ مداں

نجم الہدیٰ، مظفرپور

☆ مکرمی! ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر صاحب

سلام ونیاز

☆ ''ساغرِ ادبؔ'' کا دوسرا شمارہ (جولائی تا ستمبر ۲۰۱۹ء) ملا۔ اس عنایت کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ نے بڑی محنت سے بہت اچھے اور کار آمد مضامین یکجا کر دئے ہیں۔ میں تمام مضامین تو نہیں پڑھ سکا لیکن ڈاکٹر احمد بدر، پروفیسر حسین الحق اور شاہنواز خاں نمکین کے مضامین پسند آئے۔ آج کے حالات میں کسی اُردو رسالے کی اشاعت کے بارے میں سوچنا بھی ایک مشکل کام ہے، آپ نے مظفرپور سے اِسے نکالنا شروع کیا ہے، خدا آپ کو کامیابی دے۔

رسالہ میں مجھے ایک بات اور اچھی لگی کہ آپ نے ہر طرح کے موضوعات پر مضامین یکجا کئے ہیں اور ان میں بیشتر مضامین ایسے ہیں جن کا مطالعہ آج کے طالب علموں کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔

رسالہ کے لئے سالانہ زرِتعاون کا ایک چیک منسلک ہے۔ اسے قبول فرمائیں۔

نیازمند

پروفیسر شارب ردولوی، لکھنو

☆ ''ساغرِ ادبؔ'' کا شمارہ (جولائی تا ستمبر ۲۰۱۹ء) ملا۔ عالم اشتیاق میں کئی نگارشات بہ یک نشست مطالعے سے گزر گئیں۔ جن نے سابقہ شمارے کا بھی مطالعہ کیا ہے وہ اس امر کی تائید کریں گے کہ پیش نظر شمارہ بہرصورت پہلے سے بہتر ہے۔ دراصل آپ نے تہیہ کر لیا ہے کہ ''ساغرِ ادبؔ'' کو اردو کے ادبی رسائل میں ایک اہم مقام کا حامل ہونا چاہئے۔ آپ کا ہدف بھی صحیح ہے اور آگے بڑھنے کی رفتار بھی۔ فی الحال اتنی فرصت نہیں کہ تمام مشتملات کا جائزہ لوں لیکن اتنا ضرور ہے کہ ادب پڑھنے والوں کے لئے یہ شمارہ اہمیت کا حامل ہے۔

علیم اللہ حالؔی، پٹنہ

☆ مکرمی السلام ورحمت!

''ساغرِ ادبؔ'' کا تازہ شمارہ (شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۱۹ء) ہمدست ہوا۔ شکر یہ رسالہ صورت وسیرت دونوں لحاظ سے بہت ہی خوب اور پُرکشش ہے۔

اس کے اکثر مشتملات بہت ہی اہم اور لائق استفادہ ہیں۔ اسکالرز نے بھی اپنی ہمت اور اوقات کے مطابق اچھی کاوشیں کی ہیں۔ اردو ادب کی نئی نسل کی حوصلہ افزائی بھی صحافتی ذمے داریوں میں شامل ہے کیونکہ اصلاح مذاق اور پرورش ذوق کا یہ بھی اِک طریقہ ہے خدا کرے ’’ساغرِ ادبْ‘‘ کے باذوق کا حلقہ بڑھتا ہی جائے۔ میرا پرخلوص تعاون رسالے کو ملتا رہے گا۔

آپ کا مخلص

پروفیسر فاروق احمد صدیقی، مظفر پور

☆ کرم فرما آلِ ظفر صاحب

سلام مسنون

آپ کی محنت اور کوشش بار آور ہوئی۔ یہ ادبی جہد تھی جس کے لئے آپ کوشاں تھے۔ RNI رجسٹریشن ملنا اور ISSN لینا جوکھم بھرا کام تھا اور وہ بھی اُردو رسالے کے لئے۔ آپ کے دم خم کی داد دیتا ہوں۔

دوسرا شمارہ نقش اوّل سے زیادہ معیاری ہے۔ اتنے سارے لکھنے والوں نے متنوع مضامین آپ کو دیئے ہیں جن سے استفادہ کیا جائیگا۔ بعض مضامین پوشیدہ گوشے کو منور کرتے ہیں اور صحتمند روایت کی نشاندہی کرتے ہیں۔

عبدالمنّان طرزؔی صاحب کی حمد سے متأثر ہوکر میں نے بھی حمد کہی ہے۔ زیر ترتیب شمارہ کے لئے روانہ کررہا ہوں۔

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

☆ محبی ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر صاحب!

السلام علیکم

’’ساغرِ ادبْ‘‘ کا شمارہ ۲ رموصول ہوا میں نے اس کے اہم مضامین کا مطالعہ کرلیا ہے رسالہ کی ضخامت میں آپ نے اضافہ کیا ہے اس طرح اب یہ رسالہ زیادہ مؤثر و مکمل معلوم ہوتا ہے. پروفیسر نجم الہدیٰ صاحب کا مضمون (تنقید کے مضمرات و متعلقات) کے موضوع پر بہت مفید اور معلوماتی ہے۔ پروفیسر صاحب موصوف سے متعلق مضامین لکھوا کر رسالے میں ضرور شائع کرائیے۔ پروفیسر فاروق احمد صدیقی صاحب نے اُردو کے ایک اہم ادیب و ناقد تاج پیامی کی تنقید نگاری پر قلم اٹھا کر بہت عمدہ مضمون قلم بند کیا ہے۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری کا مضمون مفصل و مدلل ہے مشترکہ تہذیب اور نیا اردو ناول کے عنوان سے لکھے گئے اس مضمون میں آج کے بیشتر ناول نگاروں کا ذکر ملتا ہے۔ نورالحسنین، مشرف عالم ذوقی، اقبال مجید، غضنفر، سیّد محمد اشرف، محمد بشیر مالیرکوٹلوی صادقہ نواب شائستہ فاخری کے ناولوں سے اقتباسات پیش کرکے اسلم جمشید پوری نے اپنے مضمون کو عالمانہ اور مدلل بنانے کی سعی مشکور کی ہے۔ عطا کاکوی پر جو مضمون ہے اور مفصل ہونا چاہئے اس لئے کہ عطا کاکوی ایک شاعر کے علاوہ ایک استاد، ایک محقق، ایک ناقد اور اُردو و فارسی کے ایک جیّد استاد تھے۔ ان کی خدمات کا دائرہ وسیع ہے۔ کم الفاظ یا کم مشتملات میں ان کی خدمات کو پیش کرنے سے ان کے صحیح قد و قامت اور ان کی وقیع ادبی خدمات کا اندازہ نہیں ہوتا۔

بیگ احساس کے افسانے کے موضوع پر ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا مضمون عمدہ ہے۔ وہ ایک سنجیدہ قلم کار ہیں۔ اور

کسی موضوع پر مطالعہ کرکے لکھتے ہیں۔

ریسرچ اسکالرز کے گوشہ میں ڈاکٹر ناصرہ بانو، ڈاکٹر شائستہ، محمد ایوب انصاری، مریم پروین، ابوارشد زمانی اور ڈاکٹر تحسین فاطمہ کے مضامین نے اچھے تأثرات چھوڑے ہیں۔ ان طلبہ واسکالرس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے کہ مستقبل کے قلم کار ابھی ہی سے ابھریں گے۔

عمدہ پیش کش کے لئے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ نیک خواہشات کے ساتھ

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، حاجی پور

☆ عزیزم آلِ ظفر! دعائے بخیر

انگریزی کا مقولہ ہے۔

Face is the index of mind

(چہرہ شخصیت کا انعکاس ہے۔)

’’ساغرِ ادبْ‘‘ کے سرِ ورق پر نظر پڑتے ہی اس کی ترتیب وتزئین کے سلسلے میں یہ کہنا پڑتا ہے ع

زیب دیتا ہے اِسے جس قدر اچھا کہئے

شخصیت اور مضامین کی ترتیب میں جو کارہائے نمایاں انجام دیا گیا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ فطری طور پر اللہ نے آپ کو مُدیرانہ صلاحیت عطا کیا اہے۔ مجلس اِدارت اور مجلس مشاورت میں شامل نمائندگان کی حیثیت ایک انجمن کی ہے۔ حمد، نعت اور ’’ساغرِ ادبْ‘‘ پر تقریظ استادان فن کی نگارشات کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ پروفیسر نجم الہدیٰ کی علمی بصیرت پر تبصرہ کرنا گویا سورج کو چراغ کھانا ہے۔ بہرحال تنقید اور اپس کے مضمرات اور متعلقات مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر علیم اللہ حالؔی، ڈاکٹر حسین الحق، ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی اور پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی عالمانہ تخلیقات بلا شبہ مستند ہیں۔ یگر مضامین بھی جداگانہ نوعیت کے حامل ہیں۔ کلاسیکی اور جدید ادب کے توازن سے ’’ساغرِ ابْ‘‘ کا خمیر تیار ہوا ہے۔ جس کی مثال نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اُبھرتے ہوئے قلمکاروں کو ’’ساغرِ ادبْ‘‘ میں مناسب جگہ دینا اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے۔ شفیق فاطمہ شعریٰ کی شاعری پر مُدلل گفتگو کے ذریعہ نسائی ادب کا حق ادا کردیا ہے۔ اس طرح یہ حقیقت واضح ہے کہ کم عمر میں پختگی کی منزل سے ہم آہنگ ہونا آلِ ظفر کا طرۂ امتیاز ہے۔ طباعت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ عتیق مظفر پوری اردو صحافت کی آبرو ہیں اس لئے ایسی گوناگوں شخصیت پر مقالہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ تفصیلات سے قطع نظر جامعیت کا لحاظ کرکے اس شعر پر اپنی بات ختم کرسکتے ہیں۔

خونِ رگ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانہ محافظ ہو کہ بتخانۂ بہزاد

پروفیسر نبی احمد، چھپرہ

☆ جناب عالی سیّد صاحب

جولائی تا ستمبر ۲۰۱۹ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔

ادبی تفکر کو جس طرح آپ نے چھلکانے کی کوشش کی ہے وہ قابلِ رشک ہے۔ اُمید ہی نہیں یقین ہے کہ ادبؔ کی دنیا میں یہ جرنل سنگ میل ثابت ہوگا۔ انشاء اللہ

خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

ڈاکٹر سیّد محمد رضوان اللہ، دربھنگہ

☆ محترم سیّد آلِ ظفر!

سلامِ خلوص

''ساغرِ ادبؔ'' کا دوسرا شمارہ (جولائی تا ستمبر ۲۰۱۹ء) موصول ہوا۔ پہلا شمارہ آپ نے بی۔آر۔اے۔ بہار یونیورسیٹی، مظفر پور کے شعبۂ اردو کے سیمینار میں پیش کیا تھا۔ دونوں شمارے بہتر ہیں اور آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کے مظہر بھی۔

تازہ شمارہ گذشتہ شمارے سے قدرِ بہتر ہے اس بار تحقیق وتنقید کے زمرے میں تقریباً ۱۹ر مضامین، گوشۂ ریسرچ اسکالرز میں ۱۳ر مضامین بشمول حمد، نعت، خطوط اور ساغرِ ادب پر منظوم تأثر شائع ہوئے ہیں۔ مضامین ومقالات معیاری اور معلوماتی ہے۔ خصوصاً پروفیسر حسین الحق کا مضمون (ناول کی شعریات)، پروفیسر حامد علی خاں (کلیم عاجز کی شعری کائنات)، ڈاکٹر احمد بدر (شمالی ہند میں اردو زبان کا سفر)، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا مضمون (بیگ احساس کے افسانے: انفراد واختصاص)، ریسرچ اسکالرز میں شہنواز خاں نمکین (شمس الرحمٰن فاروقی کا ناول ''قبض زماں'': اِک تعارف) مریم پروین (شفیق فاطمہ شعریٰ کی شاعری کا موضوعاتی انفراد)، منیرہ زمانی (علی سردار جعفری......)، کوثر ناز (علیم اللہ حالی......) کے مضامین انفرادیت کے حامل ہیں رسالہ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے خوبصورت اور معیاری ہے۔ گوشۂ ریسرچ اسکالر کے صفحات میں اضافے کی گنجائش ہے۔ ساتھ ہی اساتذہ میں سے کسی ایک کا بھرپور مضمون نموناً بھی شائع کریں۔ تاکہ ریسرچ اسکالراس کی روشنی میں اپنی مقالے مزید بہتر تحریر کر سکیں۔

بعض مضامین تو صرف خانہ پوری ہی لگتے ہیں ۳، ۴ر اور ۵ر صفحات کے مختصر مضامین میں موضوع کے تعلق سے تشنگی صاف جھلکتی ہے۔

ایک اچھے شمارے کے لئے آپ کو دلی مبارکباد

والسلام

پرفیسر اسلم جمشید پوری، میرٹھ

☆ برادرم ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر صاحب

تسلیمات

امید کہ بخیر ہوں گے آپ کے رسالے ''ساغرِ ادبؔ'' کا دوسرا شمارہ موصول ہوا بہت بہت شکریہ اور مبارک باد!

یہ شمارہ بہت سے کثیر الجہت موضوعات پر مبنی ہے۔ ہر مضمون سنجیدگی سے مطالعہ کا تقاضہ کرتا ہے پروفیسر نجم الہدیٰ، پروفیسر علیم اللہ حالیؔ اور پروفیسر حسین الحق کے مضامین دیکھ پایا ہوں۔ پورا شمارہ پڑھنے میں وقت چاہئے، ۹ر بجے سے شام ۴ر بجے تک کالج میں برسر کی ذمہ داری میں الجھا رہتا ہوں۔ مطالعے کے لئے وقت بہت کم ملتا ہے۔ وعدہ کے مطابق یہ خط لکھ رہا ہوں۔

آپ نے یقیناً بھرپور، معیاری ادبی جریدہ مظفر پور شہر سے شائع کیا ہے۔ جس کے لئے ایک بار پھر ڈھیر ساری مبارکباد۔

آپ کا اپنا

ڈاکٹر جمال اُویسی، دربھنگہ

☆ ''ساغرادبؔ'' کا دوسرا شمارہ (جولائی تا ستمبر ۲۰۱۹ء) موصول ہوا۔ ''نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول'' کے مصداق، یہ شمارہ نقش اول سے بہتر ہی نہیں، جامع بھی ہے۔ اس کی جامعیت کا اندازہ، اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز کے اُن تنقیدی نگارشات سے ہوتا ہے، جس میں اردو ادب کی بیشتر مقبول اصناف کے حوالے سے تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ شمارہ فکشن کی تنقید کے لئے بھی یاد رکھا جائے گا، شعر وادب کے تجزیہ کے لئے بھی اور تحقیق وتنقید کے ساتھ لسانیات کے افہام وتفہیم کے لئے بھی۔ اہم اور معتبر شعرا، مثلاً جمیل مظہری، عطا کاکوی، کلیم عاجز، مظہر امام، شفیق فاطمہ شعریٰ، سردار جعفری، فراق گورکھپوری اور علیم اللہ حالی وغیرہ پر فکر انگیز مضامین اس پر مستزاد ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ یہ مضامین روایتی نوعیت کے ہوتے ہوئے بھی مقالہ نگاروں کی جدید طرز فکر اور منفرد انداز نظر کے آئینہ دار بھی ہیں کہ ان مضامین میں انہوں نے کچھ ایسے اہم نکتوں کی دریافت کی ہے جس پر ادبی مکالمہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً جمیل مظہری کے بارے میں یہ کہنا کہ انہوں نے اُس وقت مزدوروں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا جب اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا وجود بھی نہیں تھا، ایک قابل غور نکتہ ہے۔ مظہر امام پر میں ڈاکٹر امام اعظم کو اتھاریٹی سمجھتا ہوں اور یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے اپنے مضمون میں مظہر امام کی تقریباً ہر جہت کا احاطہ کر لیا ہے، جس میں ان کی کم معروف جہت افسانہ نگاری بھی شامل ہے۔

شاعری کے حوالے سے ریسرچ اسکالرز کے مضامین دیکھ کر حیرت آمیز مسرت ہوئی۔ خاص طور پر شفیق فاطمہ شعریٰ کے موضوعاتی انفراد کو نشان زد کرنے کی کوشش قابل تحسین ہے۔ اس لئے کہ ان کی شاعری کا تجزیہ، اسلامی تاریخ اور خود شعریٰ کے علمی وادبی پس منظر کی تفہیم کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح 'علیم اللہ حالی کی نظمیہ شاعری' کے حوالے سے مضمون میں، حالانکہ انسانی زندگی کے مختلف شیڈس کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تاہم اس کو نمایاں تر کرنے کی ضرورت ہے۔ فکشن کی تنقید کے حوالے سے بالترتیب پروفیسر حسین الحق اور پروفیسر اسلم جمشید پوری کے مضامین 'ناول کی شعریات' اور 'مشترکہ تہذیب اور نیا اردو ناول' نہ صرف فکشن کی تنقید کو نئے آفاق سے آشنا کرتا ہے بلکہ ہمیں سوچنے کے لئے نیا مواد بھی فراہم کرتا ہے۔ افسانوی ادب ہی کے حوالے سے غیاث احمد گدی اور عبدالصمد کی افسانہ نگاری پر مضامین اس اعتبار سے انفرادی حیثیت کے حامل ہیں کہ اس میں علامت اور بیانیہ کی تفہیم کی کوشش فنی تناظر میں کی گئی ہے۔ حالانکہ اس سلسلے کا ایک اہم مضمون 'آزادی کے بعد بہار میں اردو افسانہ نگاری' تشنہ رہ گیا۔ دراصل یہ موضوع ایک کتاب کا ہے اور ایک مختصر سے مقالے میں اس موضوع

کے ساتھ انصاف ممکن بھی نہیں۔اس کے علاوہ بہار کے ادیبوں،شاعروں اور صحافیوں کے حوالے سے کئی مضامین کی شمولیت نے اس شمارہ کو دبستان بہار کا بھی ایک اہم حوالہ بنا دیا ہے۔ تاج پیامی،عطا کاکوی، کلیم عاجز، عتیق مظفر پوری ،عبدالصمد، فاروق احمد صدیقی اور علیم اللہ حالی وغیرہ جیسے اہل قلم پر مضامین شامل کر کے آپ نے بجا طور پر ان کی ادبی اور صحافتی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

آخر میں لسانیات اور تحقیق وتنقید کے رشتے پر ڈاکٹر احمد بدر اور ڈاکٹر عامر مصطفیٰ صدیقی کے مضامین 'شمالی ہند میں اردو زبان کا سفر' اور 'اردو تحقیق وتنقید کی افہام وتفہیم' کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ ادبی دیانتداری کے خلاف ہوگا۔ حالانکہ یہ خشک موضوعات ہیں اور شاید اسی لئے ان موضوعات پر لکھنے والوں کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے۔لیکن ان دونوں مضامین میں جس علمی اور باوقار اسلوب میں زبانوں کے عہد بہ عہد ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے اور تحقیق وتنقید کے رشتوں کی صراحت کی گئی ہے،اس سے قاری کی دلچسپی اور معلومات میں یقیناً اضافہ ہوگا۔

پروفیسر رضوان اللہ آروی، پٹنہ

☆ السلام علیکم

بھائی ڈاکٹر سمیع احمد کی معرفت آپ کا عطا کردہ ''ساغرِ ادبؔ''، شمارہ نمبر ۲ ملا

ماشاء اللہ بہت خوبصورت اور معیاری جرنل ہے۔مشمولات کی ترتیب میں آپ نے بہت ساری چیزوں کا خیال رکھا ہے۔اللہ اسے نظر بد سے بچائے اور لمبی عمر دے۔آمین۔

ڈاکٹر سیّد تنویر حسین

جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسیٹی، نئی دہلی

☆ برادرم ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر صاحب! سلام ورحمت

''ساغرِ ادبؔ'' کا دوسرا شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۱۹ء موصول ہوا۔اپنے اداریہ کی تحریر میں آپ نے قارئینِ ساغرِ ادب سے پوچھا ہے کہ یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ جس رسالہ میں پروفیسر نجم الہدیٰ ، پروفیسر عبدالمنان طرزیؔ، پروفیسر علیم اللہ حالیؔ، پروفیسر حسین الحق، پروفیسر فاروق احمد صدیقی ، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی اور پروفیسر اسلم جمشید پوری جیسے دِگّج ادیبوں اور ناقدوں کی تخلیقات ونگارشات شامل ہوں،اس رسالہ اور اس کے معیار کا کیا کہنا! مختصر میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ شمارہ پہلے شمارہ کی بنسبت زیادہ کارآمد، متنوع اور ضخیم ہے۔مستند اور معتبر ادباء کے علاوہ ریسرچ اسکالرز کی نگارشات کو بھی رسالہ میں جگہ دے کر آپ نے اپنی جس فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے، وہ قابلِ تعریف ہے۔''ساغرِ ادب'' کا یہ شمارہ اردو ادب کے عام قارئین کے علاوہ طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کے لئے خصوصی طور پر نہایت مفید اور کارآمد ہے۔ع

ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

انوارالحسن وسطوی، حاجی پور

☆ مکرمی! مدیر ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر صاحب

سلام ومسنون

سِہ ماہی ''ساغرِ اَدبؔ'' مظفرپور کا دوسرا شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۱۹ء نظر نواز ہوا۔ پہلا شمارہ دستیاب نہیں جس کی تشنگی بھی ہے اور شدید قلق بھی۔

شمارہ بے حد پسند آیا بے حد مسرور ہوں۔حسب معمول متنوع اور وقیع ہے۔میرے نظریہ کے تحت سِہ ماہی ''ساغرِ ادبؔ'' مظفرپور فروغ اُردو کے لئے مفید اور لائق تحسین ثابت ہوگا۔انشاءاللہ

محمد ضیاءالحق ضیاؔء، صاحب گنج (جھارکھنڈ)

☆ ''ساغرِ ادبؔ'' کا تازہ شمارہ دیکھنے اور پڑھنے کے بعد اس کا شدّت سے احساس ہوتا ہے کہ مظفرپور جیسے چھوٹے شہر سے اتنا خوبصورت و دلکش رسالہ نکالنا ادبی وصحافتی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔تحقیقی وتنقیدی مضامین نہ صرف پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ نئی نسلوں کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔گوشۂ ریسرچ اسکالرس ''ساغرِ ادبؔ'' کو اور بھی تازگی وتوانائی بخشے گی۔مجموعی طور پر یہ شمارہ نہایت ہی قیمتی اور تشفی بخش ہے۔

ڈاکٹر جلال اصغر فریدی، مظفرپور

☆ محترم ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر

مُدیر سِہ ماہی ''ساغرِ ادبؔ''

آداب

کرناٹک کے فعال اور ذہین قلم کار ڈاکٹر غضنفر اقبال کی معرفت آپ کا سِہ ماہی ''ساغرِ ادبؔ'' کے مطالعہ کا موقع ملا ۔رسالہ فکر انگیز اور قابلِ قدر تحریروں سے مزیّن ہے۔اس رسالے کی ایک خصوصیت یہ نظر آئی کہ ملک کے معروف قلم کاروں کے ساتھ ساتھ ''گوشۂ ریسرچ اسکالرز'' کے تحت یونیورسیٹیوں سے جڑے ہوئے طلبہ اور اسکالروں کی تخلیقات اور مقالے شائع کی جا رہی ہیں۔

آپ کا یہ اقدام نئی نسل کی آبیاری کرنا ہے۔نئی نسل کو ہم موقع نہیں دیں گے، انہیں آگے نہیں بڑھائیں گے تو سینئر شعراء اور ادباء کی قدر کون کرے گا۔ان کی تخلیقات کا مطالعہ کون کرے گا۔رسالہ ساغرِ ادب ظاہری اور معنوی ہر دو اعتبار سے سنجیدہ ہے۔اس رسالے کے ذریعے تحقیق وتنقید کے نئے باب کھل جائیں گے۔قارئین اُردو ادب کے افکار واحساسات میں ایک نئی ترنگ دوڑ جائے گی۔

منظور وقار، گلبرگہ (کرناٹکہ)